

عیدِ نصیب 2

ایک



سلی کنول

ابتدائیہ

- 22 مریہ سرگوشیاں
23 حکیم خاں حکیم حمد نعت
24 مریہ در جواب آل

دانش کده

- 28 ڈاکٹر رفیع الدین سیکلار اکاؤنڈنٹ

ہمارا آنچل

- 33 ادارہ سداۃ خیران / احیا غوی

غزل اس نے چھڑی

- 35 علی اختر غزالہ عزیز

مستقل سلسلے

- 84 عفت سحر پاشا محبت دل و دستک
186 عشنا کوثر وار افسون جاں
234 اقرا صغیر احمد تیری الفت میں ضم



مکمل ناول

- 140 گواہ قاتلوں کا بلال عید سیوگل بانو
140 صرف ایک بار ایشہ غزل

ناول

- 140 گلارہ بشتہ بہار سوسم نوید قدیر ندا
38 چاند میرے آنگن کا عفت سحر پاشا

ناولٹ

- 252 بیجانہ آفتاب ہر روز عید

مستقل سلسلے

- آپ کی شخصیت اے ایس صدیقی 280 غزل، نظم
آپ کی صحت ڈاکٹر ہاشم رضا 282 بیاض دل
کاہن کا تیس فریدہ جمیل 285 یادگار لمحے
ٹوٹے نوید قدیر ندا 287 آئینہ
نیوٹی گائیڈ فریدہ خانم 288 دوست کا پیغام آئے
ڈش مقابلہ طلعت آغاز 289 ہم سے پوچھئے
- افیشن سہیل
میسوند تاج
جویریہ طاہر
شہلا عامر
ہما احمد
شمالہ کاشف

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اس مصیبت واسیلے ان سے ڈرا دیجئے جو غریب آگاہ ہے۔
جب کچھ منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پے گھڑے ہوں گے۔
ظالموں کا نہ کوئی دلی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارتی جس کی بات مان لی جائے۔

(سورہ المؤمن: ۱۸)

نگوشیں

السلام علیکم

دسمبر کا آٹھواں چاند حاضر مطالعہ ہے۔

۲۰۰۳ء کا آخری آٹھواں عید نمبر ۲ کی شکل میں ”خاص نمبر“ حاضر ہے۔ جنوری ۲۰۰۵ء کا آٹھواں سال نو اور عید الاضحیٰ نمبر ہوگا۔ جس کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔

ہم نے کہا تھا کہ ۲۰۰۳ء بھی مسلمانوں کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے بھی بہت برا ثابت ہوا کہ جتنے بڑے بڑے لوگ اپنی ذات میں منفرد اور دین و دنیا کے لیے اہم ترین تھے وہ قتل ہوئے، شہید ہوئے یا اپنی فطری موت سے ہمدرد ہوئے سب مسلمان تھے۔ مسلمان اپنے اکابرین اپنے دینی حافظہ اور حق کے لیے باطل سے لڑ جانے والے افراد سے محروم ہوتے جا رہے ہیں اور مسلمان رہنماؤں سے بھی محروم ہو رہے ہیں۔ یہ سب ہمارے اعمال و افکار کا نتیجہ ہے کہ اللہ ہمیں تنہا کرتا جا رہا ہے۔ دیکھئے اگلا سفر کس جانب ہوگا۔ منزل تو کوئی ہے نہیں۔

﴿اِس مَہ کے سِتارے﴾

سیدہ گل بانو کا دلچسپ مکمل ناول

عفت سحر پاشا کے آئین کا چاند دیکھیے

نویدہ قدر پرندہ کا پر بہار ناول

ریحانہ آفتاب کا ناول ”نام سے ہی ظاہر ہے“

اگلے ماہ تک کے لیے خدا حافظ۔

دعا گو فرحت بانجی۔

حکد

ترا نور بھرا ہوا چاند سو ہے
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر ڈھلے ہو
ہے مخلوق جو بھی زمیں آسماں میں
ہر اک کی زباں پر تیری صفات
نکاحوں سے تیری پیچھے کوئی کیسے
ہے جو کچھ جہاں میں ترے نزدیک
پکارے اگر کوئی دل سے تجھے تو
رگ چاں سے بھی سب کے نزدیک تو
الہی! تری قدرت کاملہ سے
گلوں میں مہک چاند تاروں میں سو
غلل ڈال سکتا نہیں اس میں کوئی
نظام جہاں کا تمہاں سو ہے
ترا تاج تیرا ہے ہر دم زباں پر
مری تاج تیرا ہے ہر دم زباں پر

(حکیم خان حکیم)

معصوم

ہے ہمارا یقین اس قدر آپ سے
جاں چڑھتے ہیں سارے آپ سے
ناز کرتی ہے انہیں بہار چمن
رنگ کرتا ہے شب کو قرآن آپ سے
آنکھیں کھولتے ہیں کا مژدہ گھبرا گیا
لائے کہان جتنے کافر آپ سے
بعد انہیں کے نہ آئے گا کوئی ہی
ہو گیا بند نہایت کا در آپ سے
جب قلب سے اکیلے وہ آپ سے
رنگ کرنے لگا ہمسرا آپ سے
سر نہکتا ہے وہ کہیں کفر کے سامنے
ہر مگر کی شکل خدا کی نظر آپ سے
ذوہ انہیں کا مقرب آپ سے
فر کرتے ہیں گل اور شجر آپ سے

(حکیم خان حکیم)

سید مہر ناصحہ کراچی

شرنہ ڈیز خوش رہو۔ پہلا خط موصول ہوا۔ خوش ہوئی۔ مہندی کے ڈیز ان کی پہلی روشنائی کی وجہ سے ڈرائے لگ رہے تھے۔ (مانڈرینکا) ڈیز ان کی بلیک روشنائی سے بنائے جاتے ہیں۔ آئندہ خیال رکھیے گا۔ غزل اور نظم، ہم متعلقہ شے کو بچ دیتے ہیں۔ وہیں پسند کا ناپسند کا فیصلہ ہوتا ہے اور باقی سب تیرت ہے۔ سب خواہش جواب حاضر ہے۔

شیر علی..... ادا لاوٹ گل جی دعا۔ سچی گل کا دوڑتا بھگتا خط موصول ہوا اور وہ بھی پہلا۔ ہمارے علاوہ سب آپ کی آپاں ہیں۔ ہم تو پھوپھی ہیں۔ آپ کی بن بن نہیں کئے۔ افراد آئی کا ناول ختم ہوا۔ اس ماہ ان کے ناول کی آخری خط پڑھ لیجیے۔ آئندہ تمام نقادوں سے آپ کی جانب سے کہہ دے رہے ہیں کہ افراد آئی کے ناول پڑھ کر پوچھ لے جائیے نہ کر کے۔ روز گلی بی بی کو ناولوں پسند آتا ہے (غمے سے)

آصفہ بوتل..... فیصل آباد

آصفہ دعا۔ خط کا جواب حاضر ہے۔ افراد آئی کا ناول اس ماہ ختم ہوا۔ انہوں جان کی تحریف عشا کوثر سرداران کو طور کے ذریعے مل جائے گی۔ آپ بھی کوئی کہانی لکھ کر بھیجیں۔ ہمیں پڑھنے کی باک فرست نہیں اور آپ کو جواب کی جلدی ہوئی۔ نظم و غزل وغیرہ متعلقہ شے کو بچ دیتے ہیں۔ رد و قبول کا فیصلہ وہیں ہوتا ہے۔

نادیہ جہانگیر..... آزاد کشمیر

نادیہ ڈیز خوش رہو۔ عید ناسے کا جواب حاضر ہے۔ ہاسی عید مبارک ہو۔ اللہ آپ کی دعائیں قبول فرمائے۔ فکر ہوئی کہ آپ کو بخار نے توڑ کر رکھ دیا۔ بد پرہیزی کی ہوگی۔ ٹھنڈا گرم ساتھ ساتھ کھایا ہوگا۔ نوکری کا نہ پوچھیے اس کا کھانا خراب ہے اور نہ پیٹ بھرا ہوا ہے۔ اب سب کھانے جاری ہے۔ ہم خود بھی اس کے پیٹ کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری دسے داری ہے تاکہ اس کا پیٹ بھرتے رہیں سمجھتی ہے؟

اس علی..... قندیل چکوت

اس علی۔ خط ملا۔ آپ کا تعارف اگر اچھا اور تفصیلی ہوا تو ضرور بھیجے گا۔ آپ یقیناً اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ لیکن فی الحال ابھی نہ بھیجے۔ بہت مصروف ہیں۔ پڑھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ آپ کو انتظار کی زحمت ہوگی۔ جب آپ سے کہانی منگوائیں گے تو کھینے کا طریقہ بھی بتا دیں گے۔ آپ کا یہ سوال ہم پر قرض رہا۔ پہلے خط کا شکر یہ اور آج کل پسنہ کرنے کا بھی شکریہ۔

متزیلہ فرحت..... ڈوڈیال آزاد کشمیر

فرحت ڈیز خوش رہو۔ طویل عرصہ بعد آپ کا خط پڑھ کر خوش ہوئی۔ اللہ آپ کو آئندہ زندگی میں یعنی لندن میں اچھی خوشگوار پرسکون زندگی عطا فرمائے آمین۔ آپ کے خط سے مزاجوں کے تضاد کا کافی اندازہ ہو گیا ہے۔ اسی لیے تو خوشگوار پرسکون زندگی کی دعا دی ہے۔ ناول بھیج دیجیے۔ پڑھ کر بتائیں گے۔ انگلینڈ جا کر نہیں اور آج کل کوئی نہ جانا۔ جب موقع ملے یا ذکر کیا کر خط کے ذریعے۔

کشمالہ خان..... پشاور شہر

کشمالہ ڈیز خوش رہو۔ شکایت نامہ موصول ہوا۔ ہمیں تو یہیں یاد ہے کہ آپ کے خطوط کے جوابات ضرور دیئے جاتے ہیں۔ البتہ ہر ماہ یہ ممکن نہیں۔ آپ کی چیزیں بھی بھیجتی رہتی ہیں۔ پھر شکایت کیوں۔ ہم ناراض ہی نہیں ہوتے۔ اپنا باقی ہونا ناراض کیسے ہو سکتے ہیں۔ اصل میں صفحات کی کمی بہت ہے۔ اس لیے ہم کالم ہر با

نہیں کئے۔ جیسے ہی کچھ صفحات کی بچت ہوگی آپ کی خواہش پوری کر دیں گے۔ خواہش نوٹ کر لی ہے۔ امید ہے آپ کی تکفی ہوئی ہوگی۔

طاہرہ کنول

طاہرہ کنول خوش رہو۔ یقین کرو آپ کا ایک افسانہ بھی ہمیں موصول نہیں ہوا بلکہ ہماری نظر سے ”ظاہرہ کنول اشعار“ بھی پہلی بار گزرا ہے۔ اب ہاں ناں کا جواب تو کچھ بھی نہیں۔ نہ ”ساوان بھادوں کے بعد“ ابھی تک ملا ہے۔ جو اساتذہ ہمیں اسے رجسٹرڈ کرائیں۔ اکثر تو رجسٹری تک نہیں ملتی۔

میانوا..... ساگر پور

میانوا۔ خوب صورت سا شکایت کرتا ”ناراض نامہ“ ملا اس ناراضگی پر بے اختیار پیارا لگیا۔ پیاری کا سن کر کٹھنیش ہوئی۔ اللہ آپ کو صحت مندر رکھے آمین۔ سب شعبوں والوں سے کہہ دیں گے کہ آپ کے ناراض نامہ کا خیال رکھتے ہوئے ہر ہر چیز کے لیے جگہ بنائی جائے۔ اب خوش؟ آپ کا خط رمضان کے بعد ملتا تھا۔ ابھی تک یہ عالم ہے کہ ڈاک خانہ ڈاک روکے بیٹھا ہے۔ بہت سے خطوط اس وقت ملیں گے جب پرچہ تیار ہو کر آج بھی جائے گا اور ہمیں ہر ایک سے معذرت کرنا پڑے گی کہ کیا کریں خط بہت تاخیر سے ملے۔ آج ۱۹ تاریخ ہے۔ ابھی تک ڈاک ڈاک موصول نہیں ہو پائی ہے۔ آپ کی جینٹل سے بنائی ہوئی تصویر دیکھ کر ہمیں اپنا ہوا خوش یاد آ گیا۔ نہ جانے کہاں کھو گئی

زہیرہ منگل..... چیچکوالی

زہیرہ ڈیز خوش رہو۔ پہلا خط ملا۔ آپ کی آمد سے فخری ہوئی۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی سب کچھ کو بین و آسان کی تمام آفات سے محفوظ رکھے اور ہر اکسوس سے آپ عزت کے ساتھ نکل آئیں آمین۔ بیاض دل کے لیے اپنے اشعار نہیں دوسروں کے خوب صورت اور معیاری اشعار منتخب کرتے ہیں۔ کہانی کے شروع میں راتر خود اشعار نہیں لکھتیں۔

مرحومہ شازیہ چوہدری کا افسانہ فی الحال دوبارہ شائع نہیں ہو سکتا۔ ہاں ہمیں بھی خدا کا شکر ہر وقت ادا کرتے رہنا چاہیے جس نے ہمیں اتنی دعاؤں سے اور دعا دیے والوں سے نوازا ہے۔ اللہ سب کا بھلا کرے۔

میں راحیلہ..... فیصل آباد

راحیلہ ڈیز خوش رہو۔ ہم خود بھی حیران و پریشان تھے کہ ہماری مستقل راحیلہ کی کہانیاں ہیں۔ عادت کی ہو گئی ہے کہ ہر ماہ آپ کا کچھ نہ کچھ لکھ کر خط آتا ہے۔ اچھے نمبر حاصل کرنے پر مبارکباد قبول کیجیے۔

طاہرہ اہملہ..... احمد پور سیال

طاہرہ سلامت۔ اتنا تفصیلی خط لکھ کے آخر میں ہمیں ڈرا دیا۔ لکھ کر سے ہماری جان آپ سے چھوئے۔ اسی طرح ہماری پلکیں پر بھی رہو۔ دھو دھو کے مارنے پر جواب دے رہے ہیں حالانکہ خط میں آپ نے کوئی سوال نہیں کیا ہے۔ مطمئن ہو جاؤ ہم آپ کے خطوط کے جوابات دیتے رہیں گے مگر بھی۔

لفی عظیم..... فیصل آباد

لفی دعا مختصر سامعیت پھر خط موصول ہوا۔ آپ کی چیزیں معیاری ہوں گی تو ضرور شائع ہوں گی۔ جب آپ کو خط کا جواب ملے گا عید زرخیز ہوگی اور ہم عید نمبر ۲ کی تیاری کر رہے ہوں گے۔

سائرہ قاسم..... ایڈمنسٹریشن قاسم

سائرہ ڈیز خوش رہو۔ سلامت رہو۔ محبت پھر خط موصول ہوا اور ہم ادا دے دے ہوئے سے بخ شے گئے۔ اپنے خودی انصاف کر دیا کہ ہم ایک ہی پتہ پھونچا جاتی رہیں گے۔ سبھی ایسے دو ہوں گی۔ سائرہ کی آج کل کے سلسلے میں شرت پسندی بہت پسند آئی۔ سائرہ کو دعا کہہ دیا۔ عید کیسی مٹائی۔ تو لکھا ہی نہیں۔ اب آپ کی پیش گوئی ختم کیجیے کہ آپ کا پسندیدہ ناول نہیں چھپ سکے گا۔ سلسلے آئی کو دعاؤں میں یاد رکھیے۔ اللہ انہیں زندہ و سلامت رکھے اور آپ کے لیے دوبارہ لکھ سکیں۔

فریدہ فیصلہ..... چنگ

فریڈ ڈیر۔ دعا بہت خوب صورت اور دعائیہ قطعہ
نے متاثر کیا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے (آمین) ہم ان
سطور کے ذریعے آپ کے خیالات و احساسات عشنا
کو سرسرا کر پہنچانے دے رہے ہیں کہ اتنا بی شاہ کی
شادی عصفان کی خان سے ہرگز نہ ہونے پائے بلکہ
اسنے کزن سے ہوئی چاہے کیونکہ دونوں ایک ہی طبقے
سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی ملاقات از ان حسن بخاری
سے کروادیں۔ ساریہ آپ کو بالکل اچھی نہیں لگے کچھ
چھچھوری سی ہے۔ آپ کا پیرا کراف پہنچاؤ۔
شہناز زیدی..... جھک سہر
شہناز سلامت رہو۔ ہم ہرگز آپ کو نہیں بھولے۔
پوری آج کل کی یاد کی ہیں۔ دوبارہ اتنی جگہ پر براجمان ہو
سکتی ہیں۔ ہمیشہ یاد رکھیے کہ آج کل میں کسی کی جلد
دوسروں کو نہیں دی جاتی۔

مس زاہدہ رشید عطوی..... دراولینہ
مس زاہدہ خوش رہو۔ خط ملا۔ بہت ہی باتیں آپ کو
لکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ چند طرین ناکافی ہیں۔ صرف
اتنا ہی لکھ دے ہیں کہ اللہ پر بھروسے اور امید کو دور نہ
ہونے دینا۔ ذرا صبر شکر، بھروسہ اور امید کو خوشی
آزما کر دیکھیے کہ آپ ان اوصاف کے کمال تک پہنچ
سکیں؟ اس وقت یہی مشورہ دے سکتے تھے۔ امید ہے
آپ کو یہ مشورہ بہت خوش دے گا۔

سعدیہ خان..... سیالکوٹ
سعدیہ سلامت۔ خط ملا۔ بہت بہت دنوں تک
غائب رہتی ہو آخر کیا کرتی رہتی ہو کہ خط بھی نہیں لکھا
جاتا۔ بہت ہی معلومات کا شکر ہے آپ تو جانتی ہیں کہ
آج کل کو دوسروں کے حالات سے کیا تعلق؟ آج کل کا
مسئلہ تو یہ ہے کہ کس اچھی اچھی معیاری تحریر لکھ رہی ہیں کو ان
کیسے؟ یا یہ آج کل کا مسئلہ نہیں۔ پھر بھی شکر یہ معلومات
میں اضافہ کرنے کا۔ باقی رپورٹ کا انتظار کریں گے۔

روزیہ وزیر..... فیصل آباد
روزیہ وزیر خوش رہو۔ آپ کو خوش دیکھ کر ہمیں بھی

خوشی کا احساس ہوا۔ اسنے شہر کے ایجنٹ سے کہی وہ
آپ کو آج کل جلد فراہم کر دے گا یا پھر 550 روپے
بیچ کر سلاخ نثر بیدار بن جائے اور کھر بچنے آج کل حاصل
کر لیا کیجے۔ کہانی ابھی نہ بھیجے پڑھنے کی بالکل فرصت
نہیں۔ مسلسل سہروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ البتہ تمام
کالموں میں حصر لے سکتی ہیں۔ معیاری تحریر کے ساتھ۔
سیتا..... کنڈیارو بھکر
سیتا۔ دعا۔ آپ کی پیشانی پر جیسا لیکن ہمیں اب
تک آپ کا افسانہ ”نہ نہ تم مجھ سے نہ ہم“ موصول نہیں
ہوا۔ وہ ڈاک خانے والوں کی نذر ہو گیا۔ اسے صبر کر
لیجیے۔ بھیجا تو ٹھیک تھا اگر رجسٹری کر لیں تو یقیناً مل
جاتا۔ لیکن نہیں اکثر رجسٹرڈ کہانیاں بھی موصول نہیں ہو
پاتیں۔ اب فی الحال کوئی کہانی نہ بھیجیے جب ہم نہیں تب
بھیجیے گا۔

نیر سلطانہ..... ملتان
نیر ڈیر خوش رہو۔ خط ملا۔ جانا مٹھن اور چاندنی
قیمت = 250 روپے ہے۔ حور پاؤں پر لباس کے
بارے میں ہمیں ملتان کی ایک بیویوں کا کوئی غلبہ نہیں۔ یہ
آپ اپنے ایجنٹ سے معلوم کیجیے۔ کسی اور شہر کے
بارے میں بھی ہمیں کچھ علم نہیں۔ ”امر تبیل و اجتناب“
کے بارے میں کسی قسم کی اطلاعات نہیں اس لیے
معذرت کے ساتھ کہ ہم یہ نہیں بتا سکتے۔

سونیا نحر..... فیصل آباد
سونیا۔ چار۔ پیار اور محبت بھرا خط ہماری ”خدمت“
میں حاضر ہو گیا۔ اس حاضری کا شکر ہے۔ خط پسند آیا۔
آئندہ اس لیے پڑ پڑ پڑ پڑ لکھیے گا۔ ہمیں اس ان کا گھانا
پھونس میں گھر گئے ہیں۔ سرخ روشنائی بھی نہیں۔ فی
الحال رائے نثر کی فرصت نہیں۔ اپنا دل نہ توڑ دینے نہ ہی
امید توڑ دینے آپ کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔
فرصت ملنے کے بعد خدا حافظ۔

زیبا شہناز
زیبا جی! سلامت رہو۔ دعائیہ قطعہ سے مزین

نفاست سے لکھی ہوئی نئی نئی سے آراستہ عید کا ڈرموصول
ہوا۔ قطعہ پڑھ کر آپ کے لیے بے اختیار ”دعا“ دل
سے نکلی۔ اللہ آپ کو زمین و آسمان کی آفات سے محفوظ
رکھے آتمن۔ بہت بہت دنوں بعد شریف۔ درسی ہو رہی
ہے۔ سب۔ تھینا عدم الفرضی ہو گا۔ اب خانہ دو دعا۔ امید
ہے دوسری ملاقات جلد جلد ہو کرے گی۔

خالہ علی..... پوران
کھن کھن بھیجنا دعا۔ تھینا اس لیے نہیں لکھا کہ عید
پکائی ٹھنکا کھلی ہوئی۔ بہت ہی خوب صورت جگہ جگہ
عید کا ڈر ملا۔ ہمارا پورا کر وہ گلستان ہی کیا۔ (پیار محبت
کے تحفے سے) شکر ہے نظم متعلقہ شے کو بھیج دیتے ہیں۔
یہ بات آپ متعدد بار پڑھ چکی ہوئی ہیں۔ اگر ان لوگوں کو
پسند آتی تو بھیج جائے گی۔ ورنہ اور لکھ کر بھیج دینا۔ گھر
کی کھتی ہے چلی چاہا ہو گا۔

ارم خانزادہ شفیق احمد
ارم ڈیر خوش رہو۔ عید کے موقع پر تو اصل ناراضگی
بھی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم آپ سے ناراض کیسے اور کس
دل سے ہو سکتے ہیں۔ آپ کے حالات کا کچھ کچھ اندازہ
ہو گیا ہے۔ خلاصے والا ناول تو لکھیے۔ کوئی خاص بات
نہیں۔ جو تھارے پاس ہے اسے پڑھ کر دل پہ
چڑھائیں۔ آپ کو شکر کریں گے۔ اگر دل نے قبول کیا تو
ہم سمجھ لو کہ کام کیا گیا۔

صہیبہ عامر..... سرگودھا
صہیبہ ڈیر سلامت رہو۔ آپ کا افسانہ ”دفا کیس“
کہاں کا کشش؟ گما نہیں ہے۔ پڑھ بھی لی مگر فوس متاثر
نہ کر سکا۔ اس سے اچھے افسانے تو لکھ چکی ہیں۔ ظاہر
ہے۔ یا افسانہ بہت ہلکا پڑے گا کوئی بہت زبردست سم کا
افسانہ لکھ بھیجے۔ اسے چاہیں تو کٹ بھیج کر واپس منگوا
لیں۔ مانند ہرگز نہ کرنا۔

مہرین اسماعیل
مہرین ڈیر خوش رہو۔ چیون سامی مل گیا۔ مگر قصور
نہ وہ نہ کی دے چھپ نہیں سکے گا۔ چیون سامی کے



لے اپنا ساتھ چھوڑا اور نہ ہی گفتگو میں بے باکی اور روانی آسکی۔
یوں بچپن کا خواب ناک سہرا ڈور دھپکے سے نرگد ہوئے۔ دے پاؤں
چپ چاپ
○ تعلیم کسے تھی؟ کہاں سے حاصل کی؟ موجودہ پروفیشن کیا ہے؟
☆ فیصل آباد جولاہور شہر کی طرح زندہ دلوں اور بلی غلوں
لوگوں کا گھر لگتا ہے۔ یہیں سے ابتدائی سے لے کر ثانوی تعلیم یہاں
کے تعلیمی اداروں سے حاصل کی۔ البتہ علم کی پیاس بھی باقی ہے
اس لیے جہاں سے بھی سہرا پائی حاصل ہو پاتے ہیں تو نہ کدنی کی
طرح علم سے حصول کا سوسریچ رہتا ہے۔ کچھ توجہ شروٹ
کا فیصل آباد سے کیا جو اب کونسل کا چوبیسویں مکتب میں چکا
ہے۔ البتہ ایم اے سے رایتھن کیا۔ اس کے بعد وفاق کا سلسلہ
بیک بکس جیسے کامی شہرت کے ادارے سے منسلک ہو گیا جو خوز
جامی ادارے ہیں۔

○ واد و دے مدعیان میں کیسے داخل ہوئے۔ کیا
کامیابیوں حاصل کیں؟
☆ بالکل ناپاک نتیجہ کی سوچے سمجھے منصوبے کے انکول کے
ڈانے میں ہمارے ہاں سے ایک ادبی پیکر بن لکھا جس میں اپنا
ابتدائی شعور "حقیقت خرافات میں گھومتی" لکھا جو دیکھنے کے
کے طالب علم کو دہم کھنڈا گیا چنانچہ انجاء دے دی کہی بھگت کے
ساتھ وہ دشمنوں کے نام سے پیکر میں چھپ گیا۔ اس کی
افاشلی بھی کیا مگر بے سود۔ انجاء مدبر نے کہا کہ اور کھ
لوایں اور لکھنے کا سلسلہ سبیل کا تاج چنگ جاری ہے۔ میں وہ رہاں
"پیکر کی دنیا اور خرافات کے بچوں کے اپنے یقین میں بھی کوئی فرق نا
ان کت کیا پائی اور کھتہ ہر لکھنے سے بھر کا کھیل پر پہنچ کر کھلی
میرے لکھنا کھنڈی ایتر کو کو خوات کا کیا زبان (ساتھ)۔ میری
ادبی کامیابی میری تمام چیزوں پر ناعد ہر کھنڈ کی ناعد افسار
ہیں جنہوں نے ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا جس کے اعصاب تک
میری چیزوں کے کیا ہر مجھے چھپ گئے ہیں جن کی مختصر تفصیل
چھپ چوں سے ہر ایک تادو دنا (اردو ناول) کے "دلیز" (اردو
افسانہ) "ہون دکھ" (جنگلی افسانہ) "چوب میں لکیریں" (ادبی شخص
کالم) "بول ہی کرنا" (اردو افسانہ) "ساری کاش میں بھول نہ جانا" (اردو
افسانہ) "چھڑا دے" (اردو ناول) "خواب بھری آنکھوں کے
(اردو افسانہ) "آزاد رشتوں" (عام مضمون) "میں بھلا سینے
کیسے" (جنگلی ناول) "اردو افسانہ" (اردو افسانہ)
عقرب میر شعری مجموعہ "قادران اور شعر جن کا خوش رکھے
داہوں کے لیے رایتھن میں چھپ کر دستیاب ہوگا کھڑک کے ساتھ
ساتھ شعر جن سے لکھری گاؤں ہے۔

○ یہ بتائیے شعر و شاعری کا آغاز کب اور کس طرح ہوا؟ پہلا
شعر کہا؟
☆ جہاں کھ شعر و شاعری کا قافلے سے ہوتا ہوا میرے
انداز کے ہیں دو خاص صورت چڑیوں کا حال شاعر موجود رہا
ہے۔ اس بات کا احساس میرے ارد گرد موجود شاعر دوستوں نے
دایا۔ واصل میری تمام نثری تحریروں کے کھاتات شعروں کے
مضمون کی طرح لکھتا ہے۔ جس کی ہوتے ہیں۔ گویا شاعری کی وہی
جگہ میرے ہوش سے ہر خیال سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ادب
ایک حساس شاعری ہوتا ہے۔ پہلا شعر تو ایس البتہ پوری غزل
موجود ہے۔
☆ میں شاعرانہ خیالوں کے راستے
آنکھوں میں نہیں گئے ہیں وہ خوابوں کے راستے
○ شعر و شاعری میں آپ کس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں؟
شاعری میں ان اصناف میں طرح آؤں گی؟
☆ ہر شاعری میں میرا اعلیٰ فکر انسان سے چاہزیت اور وطن
سے اپنا انداز و رنگ و صورت کے دالوں کا ہے۔ میرا خیال ہے
جب تک معاشرے سے پیار و محبت کو فروغ حاصل نہ ہوگا ہمارے
دوران جو رشتوں کی یادگار کیا ہیں جاسکے گا اور کس سے پیار
اور کوشاقت دینی ہے۔ آپ کس شناخت کی نہیں ہے تو پھر
وہ کدو کو باندھنا ایک برابر ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے
میں شاعرانہ آرائی کا سوال ہے تو میں شاعری کو خافوں میں باندھ رکھے
کا عادی نہیں ہوں۔ لہذا میں جس آسانی سے اپنا دعا کہنے کی
صاف ہو سیتی غزل نظم اور جاتی نظم میں شاعرانہ بیان
اصناف سے بہتر چنا ہوا ہوتی ہے۔ اگر پڑھنے والوں تک آپ کا
پیغام آسانی سے پہنچ پاتا ہے تو یہی بہت ہے۔
○ بنیادی طور پر آپ غزل کو شاعر یا نظم گوئی آپ کا
میان ہے؟
☆ میں نے پہلے کہا نا اگر آپ آسانی سے اپنا دعا دوسروں
تک پہنچاتے ہیں تو اس کے لیے آپ کدو کو بندوں کو بندوں کو بندوں
غزل کا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ وہیے ذہنی طور پر
غزل کا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ زیادتی حساسات کے ساتھ نہیں کدو
خوب صورت تفصیل کی تہوں کے جہاں میں کئی ہوتی غزل جو
ہمیشہ سے اپنی چھپ میں دوسروں سے نرگد مختلف ادب خوب صورت
رہی ہے۔

○ آپ کی شاعری کے خاص موضوعات کیا ہیں؟
☆ میری شاعری کے خاص موضوعات مناسبت مناسبت نظر سے
دیکھا اور کس سے محبت ہیں جو تفریحی میری تمام شاعری میں بدرجہ
فہم موجود ہیں۔ میری شاعری کا محور کسب ہیں البتہ مجھے

ہاں ہے۔ یہاں کہہ دال انسان دوست شاعری کہہ سکتے ہیں۔
○ آپ کے خیال میں شاعری کیا ہے؟ تفصیل میں تعریف
کریں؟
☆ میرے نزدیک خوب صورت تفصیل کے ہاں کہہ اتمام اور
جملہ تفصیل کھینچنے چن کر انہیں قدرت الہیہ کے خوب صورت
بہن کے ایوان میں حکا کر پڑے دالوں کے سامنے لانے کا نام
شاعری ہے۔
○ کیا آپ کا شاعرانہ کیا عبادت بھی ہو سکتا ہے؟ آپ کا
خیال ہیں؟
☆ کیوں نہیں جب الہیہ قدرت نے بھی باندھی نہیں کسی
انسان کو اسے مختلف چیزوں اور خافوں میں دیگر باندھ سکا
ہے۔ ایک ایسا شاعر بہت ایسا اور بھی ہو سکتا ہے۔ اور ایک ایسا
ادب تک وقت خوب صورت شاعر ہو سکتا ہے۔ ادب تک
اس کی ایک دھوکا مائل صورت موجود ہیں۔ دالانا مانی خوشن آواز فرما
باب وغیرہ جن کی شاعری اور نثر دونوں نہایت طرہا ہوتی
ہے۔ موجودہ مہینہ فیصل عہد کے ہم کا کہنا انشا اچھا اور اچھا
ہاں۔ رات دھکے ڈال کر کے غلام خافین الہیہ میں اس امر پر جو کچھ
شاکر کشمور اور انور احمد جعفری کے نام شاعری اور نثر دونوں چاہوں
میں ہم نظر کرتے ہیں۔
○ آپ تک کچھ مجموعہ کلام (شاعری میں) منظر عام پر آئے
ہیں؟
☆ میرا خیال ہے کہ ہر شاعر تصنیف اپنے لیے مخصوص وقت و
توجہ لگاتا ہے۔ چنگا تک میری زیادتیوں بڑی جانب رہی ہے
اس لیے شری مجموعہ کی اشاعت میں تاخیر ہوئی ہے۔ البتہ میری
شاعری کو کھلی صحت کر گھوڑ کلام کی شکل سے کرنا کھل کرانے
پر کلام ہے۔
○ شاعری اور نثر میں آپ کس کو بہتر ہیں ذریعہ الہیہ کھتے
ہیں؟
☆ میں تو ذریعہ الہیہ کے لیے نثر اور شاعری دونوں ہی بہت
ارنگ رنگ داغ ہیں۔ البتہ میں آپ کو نثر میں زیادہ مہر بھتا
ہوں۔ واصل نثر میں پہلا آئے وقت سے اس لیے آپ بڑی
آسانی کے ساتھ اپنے خیالات کی ترسیل کر سکتے ہیں۔ یہ تو ہے
الہیہ الہیہ کی طاقت و مختصر ہے کہ آپ صنف میں درست
ادب ہر طریقے سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔
حالات دہر کے دیا میں سفر کے دیکھنے
کا گناہہ سون کے آگ مجھ پر ہی دے جانے کے
(شاعر اپنی شاعری میں کھلی کیفیات کو بیان کرتا ہے مگر
شاعری میں اپنی کاس پر کتا اور کس حد تک نہ ہوتا ہے آپ کاس
ہے میں کیا خیال ہیں؟

☆ شاعری کو دے ہمیشہ سے شاعری پر انداز نظر کرتے
ہیں۔ یہ ایک بات ہے کہ بعض شعراء کو اپنا انداز شاعری دونوں
کی کھلی کھلک ہوتی ہے۔ مگر بعض شعراء کی شاعری میں اس کے
بھر پور اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ مرزا غالب کی شاعری میں اس
کے مہم ہوں نے دیکھے ہیں۔ ان کی کھلی کھلی نظریاتی ہے اور
ساتھ ساتھ کھلی کیفیات میں کھلی ہیں غرض علامہ اقبال شورش کا میری
اور جوش آج پادری جیسے بلند پایہ شعراء کرام کے ہم کھلی کیفیات
پائی جاتی ہیں۔
☆ کھلی آجاتے ہیں بازار میں لوگ
کھلیں سر پر اٹھائے ہوئے ایوانوں کی
آج کل کی شاعری میں شاعری کو دے کھلی کیفیات کو ساتھ
کر لیتے ہیں۔ بھلا ہے کہ میں سے ایک شاعر کو کس دالوں
وہاب کا خیال ہوتا ہے۔ تو پھر شاعری کو دے کھلی کیفیات کا خیال
اس کے مگر گہرے دالوں کا خیال ہوتا ہے۔ میں سے خیال میں اس
ہاں ہے۔ پھر ہمارے ساری صوفیانہ شاعری شاعری دونوں سے
شکل نظر آتی ہے۔
○ آپ شعر کہیں کسے ہیں؟
☆ میں نے اندر کے کسی کو شعر کہنے کے لیے اور اپنے اندر
خوب صورتوں کو کھلنے کے لیے قدرت کی عطا کردہ اپنی قوت
الہیہ کو بھلا دیا۔ ایک دھنیں کا سفر ہے جس کا کام
سرو باغ اعرار جاتا ہوں۔ ایک چاہوں کی امید خوب صورتوں اور
چاہوں کی تلاش کے لیے شعر کہیں ہوں۔
○ بہت آسانی کے لیے آپ کا کیا خیال
ہے؟
☆ بہت کے بارے میں سوال کا جواب خود آپ کے سوال
میں موجود ہے۔ بہت وہ آسانی ہے۔ جس کی موجودگی کا بھی
معاشرے کو کھلی نظر دینی ہے۔ میرے خیال میں اس فن کے
معاشرے میں فروغ ملنا چاہیے تاکہ معاشرے میں موجود خفیا
کدو میں اس فن کو کھلی ختم ہو سکے۔ خدا تو خود اپنے رسول کھلی
سعدت کی ہے پھر اس کا قاتی ہڈے سے کدو؟
○ اردو شاعری میں غزل کا پائیدار مقام
مستقبل میں کھم نگاری اور ذولکرم نگاری دونوں میں سے کس کا
مستقبل روشن ہے؟
☆ اردو شاعری میں غزل کا ہمیشہ سے ایک اعلیٰ اور معتبر مقام
رہا ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیں کھلی کھلی کے ساتھ
ساتھ ہزاروں کھلی طرح چلتی آتی ہے۔ البتہ ذولکرم نگاری ان
لوگوں کا انکار ہوگا جو بدوش اور غزل کی پائیداری سے کھلی
ہیں۔ اس لیے آسانی کے لیے ہمیں نے اسے رادہ حوصلہ کی کھلی
شاعری میں غزل کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔

گواہ رفتوں کی ہلالی محمد

سیدہ گل بانو

میری تقدیر کے اندھروں میں
جگمگاؤ تو عید ہو جائے
تم محبت سے میرے پہلو میں
بیٹھ جاؤ تو عید ہو جائے

”وہیے میں یہ سوچتا ہوں کہ دوشا کی بے خبری کے
باد جو تم اس درجہ حواس باختہ ہو گئی جو میں کسی اعتراف
کے بھول اس کے آجیل میں ڈال دوں تو بھلا تمہارا کیا
حال ہوگا؟“
”تب وہ آئے کی اور تمہارے منہ پر تھوک دے گی
اس بھول میں مت رہنا تم کہ دوشا تمہارے اس بے ہودہ
ڈائلاگ پر ایمان لے آئے کی کہ تم دوشا سے محبت کرتے
ہو۔“

”یہ میں نے کب کہا کہ میں دوشا سے محبت کرتا
ہوں۔“
”یہ تم کہہ بھی نہیں سکتے کہ تم دوشا سے محبت کرتے ہو
کیونکہ تم جانتے ہو جس روز تم نے دوشا کے لیے ایسا کچھ
کہا اس روز میں تمہارا حشر کر ڈالوں گا۔“ بلند ہوتے
بھاری سچے پر قابو پانے کی سعی کرتا ہوا ہمیں کھٹے کھٹے

”میں دوشا سے محبت کرتا ہوں۔“ اسی پر اطمینان
آسودہ مسکراہٹ سمیت پرسکون لب و لہجے داغناز میں
بے دھڑک لے حدنظر داغناز سے اس نے ہمیں کی شرابار
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخصوص مدھم لہجے میں کہتے
ہوئے اس سے ہمیں کو پیسے پانا حشر کر ڈالنے کی دعوت دی
تھی پھر ہمیں کے یکفیت بھڑک کر لب کشائی کرنے سے

قبل ہی مزیں بدل پڑا۔

”تمہیں یوں سمجھے نہیں روکنا چاہیے تمہیں مجھے ڈرانا دھماکا لگائی نہیں چاہیے کیونکہ محبت کسی کے کسی کو ڈرانے سے حاصل نہیں ہوتی نہ کسی کے روکنے سے یہ کسی کے چڑانے کی کہ قلب درود میں سرایت ہو کر لہو کی گردش، دھڑکنوں کی بجلی کی محبت ہر قسم کی قید و بند سے آزاد اور خوشکار ہوتی ہے۔ یہ کسی کی ہر مانی یا دھمکاؤں کی کے چاہنے نہ چاہنے کی باند نہیں ہوتی۔ یہ فقط خود کو تسلیم کرتی ہے اور اسے آپ کو ہی تسلیم کرنا چاہتی ہے یہ نہ نفرتوں کی بیزاریوں بلکہ مائیدانوں پر نشوں سے وہ قانون کی باد سم سے ٹھہرائی ہے اور نہ ہی ڈشوار یوں یا مائیدانوں کی آزمائشوں کی باد صحر اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہے یہ استقامت پسند اور مستحکم ہے کسی انصاف فیصلے کی معقولی کی طرح اصل اور آخر یہ خود سے پہلے بھی ہر جان و خود کو سمجھتا ہے اور اپنے ہی دھوکے پرست خود کو دیکھنا چاہتی ہے سنا نہیں تم نے محبت کوئی بھی بھری ہوئی ہے اور میرے تمہارے جیسی پارکھنگا بھی نہیں ہوتی جو دیکھے اور کچھ بھگدھ کر جان لے کہ گون اس کا سواگت پیار پذیر اپنی جوش و جاہت سے ہر بیز انداز میں کرنا چاہتا ہے اور کن دھمکاؤں کو دینا چاہتا ہے تم کو کبھی بھی کسی کو چاہنے سے یا سمجھنے بھی کسی کی یا دھمکاؤں کی جاہت سے باز نہیں رکھ سکتے اس پر کر کوئی بھی بھی کسی کی جاہت کے کہ نہیں رکھ سکتا“

کیا کسی نے یا پھر میں تم سے کہا کہ دوش کی خواہش کرنے سے دوش کو اپنانے کی آرزو کرنے سے یا دوش کی جاہت سے باز رہو نہیں! سو تم بھی مجھ پر اس معاملے میں قطعی کوئی قدر نہیں لگا سکتے تم کو کسی نے یا میں نے بھی باند نہیں کیا تم بھی مجھے باند نہیں کر سکتے مجھے یہ کہنے کا کوئی اختیار کوئی پار آف اتھارٹی نہیں رکھتے کہ میں کسی کو دوش کو چاہنے سے باز رہوں۔“

”محبت کو بانے کے لیے سراسر وارد لطافت، کیف و لذت کی خوشی نہ کم کرے بلکہ دلورایت کی یا نہ دشواریں انوشی سر مستوں میں بھٹکتے ہیں جنہوں نے تائیں فرار و

جیت جاؤں تو میرا دوش تو نہیں ہوگا اس میں ہاں پر ہاں ہر جاؤں کے تو جو جیسی زلت ہوگی اس مات سے تم سمیت تمہاری اس ہی دوشی مسمنائی ہوئی محبت کی ہر نفس کہ اس وقت بھی تم کچھ بھی نہ کر سکو گے جیسے کہ آج اس سے میرے منہ سے دوشا کے لیے یہ سب کرم میرا کچھ بھی تو نہیں بگاڑ سکے۔“

بہت سے ان کے لفظوں کو زبان دینے کے بعد کتنی ہی اٹھوڑی باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد وہاں سے جا چکا تھا اور ہمیں واقعی اس کا کچھ بھی تو نہ بگاڑ سکا تھا۔ اپنے سے چند گز کے فاصلے پر اراد کر زیادہ کیے چار ارفاق میں اپنی اپنی چیز پر بیٹھے مرد و خاتون کی اپنی اپنی اسکی ہوئی بل بل چوٹی، تجسس و رستواب نگاہوں سے بے نیاز ہمیں ریٹونٹ کے بوجھل ہوتے داخل میں بہت دیر تک لب مضبوطی سے ایک دوسرے میں پیوست کیے تھے سے جیسے جڑوں سمیت مسکت و جا دھکار ہا تھا۔



”پھر تمہیں کیا لگتا ہے کیا وہ بار جانے گا؟“ میں تو بس اتنا جان سکا ہوں کہ وہ جلدی جیت جانے والوں میں سے نہیں ہے اپنی شکست سے زیادہ وہ چاہ میری حق سے خائف ہے میرے مقابلے میں چھوٹا تھا زیادہ تو نہ بھی بھی نہیں رہا ہے نہ بہت پہلے ہی جاتا تھا پر ایک بہت زیادہ تو نہ دیکھی ایک دلیر انسان ہونے کے باوجود وہ انتہائی بڑول دیوانہ ثابت ہوگا یہ شکف میرے لیے اچھٹا ناقابل یقین ہے نہ حد دلچسپ بھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک لطف آمیز چمک بھی لگیوں پر محفوظ کن مسکراہٹ۔

”تمہیں اس پر تم نہیں آتا حاسن؟“
”کیا رقبہ پر تم آتا چاہیے؟“
”حاسن! میں ایسا نہیں چاہتی تھی تم نے شکست دیا وہ تمہیں مات کرنے میں بھی نہیں چاہتی۔“
”تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟“ وہ اب بھی غیر سنجیدی سے مسکرا رہا تھا۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو۔ کیا نہیں جانتے میں تمہیں بھی پرسکون اور شانت دیکھنا چاہتی ہوں اور اسے بھی۔“

”تمہیں تم چاہتی ہو کہ میں ہاں جاؤں۔“ معلوم نہیں کیوں وہ اس کی نگاہوں سے دلالت آگئیں جراتا چلیں موندھ کر ہوا بولگ جیتہ کی بیک پر سر رکھ کر رلیکس انداز میں بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھے ہوئے چنکر دھیرے دھیرے دایں بائیں بھلتانے لگا۔ وہ جلدی سے بول پڑی۔

”اوں! میں چاہتی ہوں کہ تم جیت جاؤ۔“
”اس کے لیے میں کی شکست ضروری ہے۔“
”تیرے کتاب میں لکھا ہے کہ آپ کے جیتنے کے لیے مقابل کو مات و ہا ضروری ہے حاسن؟“
”یہ میں نے لکھا ہے میرے جیون کی کتاب میں۔“
”حاسن! وہ اسے مال سے دیکھتی سرنگی میں ہلانے لگی۔“

”تمہیں چاہیے کہ اس کی طرف داری کی بجائے تم میرے لیے دعا گو میرا ساتھ دو۔“ وہ کچھو کے کٹھن کی انشڑ سے قریب سر کا تا کہہ رہا تھا وہ اس کی بات کا برامان نہ کی۔

”میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہی ہوں حاسن۔“
”تم کسی کا ساتھ بھی تو نہیں دے رہی ہو۔“ وہ بہت خوب صورتی و لامنت سے بڑی گہری چوٹ کر گیا۔ وہ بس لامنت آمیز نظر سے نکلی اپنی جگہ پر پہلو بدل کے رہ گیا حاسن کہہ رہا تھا۔
”تمہارا کیا خیال ہے کہ کسی کو مات کیسے فاتح کے خزانوں سے کیسے مال ہوا جا سکتا ہے؟“
”شکست تو تم کو بھی اپنی منظور نہیں! کیا تم اس اول جلول سے چھچھا چھڑا نہیں چاہتیں! تم اس سے کنارہ کشی اختیار نہ کر کے اپنی ذاتی روجھی کو مات کر دوش میں بھی پیچھے ہٹ جانا ہوں۔“
”تم میری ہے کسی کا عاقب اثر رہے ہو حاسن؟“ وہ

کلس کر از حد شای نظروں سے دیکھتی تھی گئی ہے ہونٹ بچھ گئی حاسن کے بالوں سے ہم رنگ غلامی آنکھوں میں مسکراہٹ ابھی گہری چمک بن کر گوند رہی تھی۔
 ”تم میرے جذبات کو کھیل بھٹکا چھوڑ دو میرے عزم کو کھیل بھٹکا چھوڑ دو میں تمہاری بے بسی کا مذاق نہیں اڑاؤں گا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے نیک شفاف جذبات اور اپنا تمام تر خلوص ایک انتہائی بے درود انسان سے پارٹی ہوں۔“ حاسن کی صاف گوئی اسے بہت ناگوار گزری تھی جب کہ وہ بوہی آنکھیں موندے جیسے جھلٹے ہوئے بول رہی۔
 ”تھک کر کوہ کہہ رہی درویشان تو ہے روز تو کیا نیت کا چلا اپنے انسان کے بہرہ پ میں یہاں ہر دوسرا شخص اک دشتی ہے جیسے جیسے ہے۔“

”بے رحم تو مجھے بھی کم نہیں ہو۔“ اپنے اطمینان پر اس کے کڑھ کے کہنے پر جواب دہا وہی اطمینان و دشان بے نیازی سے شانے اچکا گیا۔
 ”چلو میں مان لیتا ہوں کہ میں بھی کم بے رحم نہیں ہوں پر خوش فہم خوش گمان بھی تو ہیں ہوں۔ تمہارے اس حق بدصو خاص انصاف امید اور طرح نہ تمہاری طرح۔“
 ”خوش فہم نہیں بد لگا ظاور بے مروت بھی ہو۔“ چند طائفے نظر میں سے گھورنے کے بعد وہ بے سانس مسکرا کر رہ گئی۔

”جیسی بیٹھک دیا بندہ۔“ ابرو اچکا کے بدستور برجستہ سنجیدگی سے کہتا وہ ایک بار پھر قدر سے شرارت آمیز ملامت سے اس کی ذات کو نشانہ بنا گیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے غلاموں میں کئی دھیمی مسکان کی چمک کو ایک مرتبہ پھر خشک سخی تھی بھری نگاہوں سے دھکی پڑا مال انداز میں گھورنے لگی جس کو جیتھو کی پشت پر لگانے کے پھر سے آنکھیں موند گیا تھا۔

”جاری ہوں میں۔“ حاسن کے پر سکون بڑے اطمینان انداز بے تاثر ساٹ چہرے پر بے نیازی کی گہری کلس کر از حد شای نظروں سے دیکھتی تھی گئی ہے ہونٹ بچھ گئی حاسن کے بالوں سے ہم رنگ غلامی آنکھوں میں مسکراہٹ ابھی گہری چمک بن کر گوند رہی تھی۔
 ”تم میرے جذبات کو کھیل بھٹکا چھوڑ دو میرے عزم کو کھیل بھٹکا چھوڑ دو میں تمہاری بے بسی کا مذاق نہیں اڑاؤں گا۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے نیک شفاف جذبات اور اپنا تمام تر خلوص ایک انتہائی بے درود انسان سے پارٹی ہوں۔“ حاسن کی صاف گوئی اسے بہت ناگوار گزری تھی جب کہ وہ بوہی آنکھیں موندے جیسے جھلٹے ہوئے بول رہی۔
 ”تھک کر کوہ کہہ رہی درویشان تو ہے روز تو کیا نیت کا چلا اپنے انسان کے بہرہ پ میں یہاں ہر دوسرا شخص اک دشتی ہے جیسے جیسے ہے۔“

”بے رحم تو مجھے بھی کم نہیں ہو۔“ اپنے اطمینان پر اس کے کڑھ کے کہنے پر جواب دہا وہی اطمینان و دشان بے نیازی سے شانے اچکا گیا۔
 ”چلو میں مان لیتا ہوں کہ میں بھی کم بے رحم نہیں ہوں پر خوش فہم خوش گمان بھی تو ہیں ہوں۔ تمہارے اس حق بدصو خاص انصاف امید اور طرح نہ تمہاری طرح۔“
 ”خوش فہم نہیں بد لگا ظاور بے مروت بھی ہو۔“ چند طائفے نظر میں سے گھورنے کے بعد وہ بے سانس مسکرا کر رہ گئی۔

”جیسی بیٹھک دیا بندہ۔“ ابرو اچکا کے بدستور برجستہ سنجیدگی سے کہتا وہ ایک بار پھر قدر سے شرارت آمیز ملامت سے اس کی ذات کو نشانہ بنا گیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے غلاموں میں کئی دھیمی مسکان کی چمک کو ایک مرتبہ پھر خشک سخی تھی بھری نگاہوں سے دھکی پڑا مال انداز میں گھورنے لگی جس کو جیتھو کی پشت پر لگانے کے پھر سے آنکھیں موند گیا تھا۔

گاہی کو اس کے نرم گالوں پر قجاب کی شفق پھیلاتے دیکھ کر غلامت سے مسکرا دیا لیکن جلد ہی اس دھیمی مسکراہٹ کی نری زبائل ہو کر معدوم ہوتی مسکراہٹ کو سنا گئی دوشا بول رہی تھی۔

”ایسا صرف حاسن بھائی کی وجہ سے ہوا نہ دوا جا کہ گھر چلے آئے نہ مائی ابو سے کہہ کر ضرر کہہ گئے تھے آؤ ٹنگ پر اپنے ہمراہ چلنے کے لیے مجھ کو رتے نہ آپ کو رہے نوٹ میں میرا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو جانا پڑتا ہے بہت دکھ ہوا آپ نے پہلی بار مجھ سے اپنی کوئی خواہش۔“

”تم اس لیے میرے پاس نہ آسکتیں۔“ ہمیں اپنے دھک سے رو جانے والے دالے سمیت بے چینی سے زیر لب پروتا تھا گھر کھڑا ہوا۔ دوشا ایک بار پھر نام کی سر جھکا گئی۔

”ہوں میں اس لیے آپ کے پاس نہ آسکتی ہوں؟“ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ وہ اپنی ضروری ہے ان کی ذات کے لیے نہیں کرنا کر۔
 ”کوئی ضروری بات؟“ ہمیں نے اچھی راگوں میں چڑھتیاں رشتی ہوئی مسوئیں کیں۔

”وہ بات۔“ دوشا بے اختیار گھٹنے لگی۔ ”بات کیا تھی بس ایک بچکانہ سی معصوم شرارت تھی آپ نہیں سمجھتے تو آپ کو کبھی بھی آئے گی اور یہاں میری سب تو انہوں نے مجھ سے اس لیے کہا کہ وہ چاہتے تھے اسے بات کے سبب میں میں ان کے ساتھ چلا پڑوں میں نے جب ان کو بتایا کہ آپ میرا انتظار کر رہے ہوں گے تو انہوں نے کہا کہ اچھا ہمیں کو آج تمہارے انتظار کا مزہ چکھنا پڑے گا اس آج کے روز سے اس کے چوان میں تمہاری کئی کئی احساس اور قدر اور مائی بڑھ جائے گی اب تو بہت ضرورت بات کے بعد ان کو انکار کی ہمیری پر جرأت ہی نہ ہوئی اور ہائے ہمیں جسٹ آؤ ٹنگ کے دور میں ان نے ان سے وہ ضروری بات پوچھی تو انہوں نے مجھ سے میرے نام کا مطلب پوچھا۔ آپ حیران ہو گئے ناں ہمیں میں بھی

حیران رہ گئی تھی ایسے ہی بالکل آپ کی طرح کیا آپ کو میرے نام کا مطلب معلوم ہے ہمیں؟“ دوشا کی آنکھوں میں ہریل اشتیاق کی چمک گہری ہو گئی۔ دوشا کے اچانک بولنے پر میرے تاثر ساٹ چہرے سمیت ہوئے۔
 ”سروگوش میں نہیں دے سکتیں کوئی اس بارے میں قطعی ہے کسی پر اپنے انتہائی درجے کے کم علم ہونے کے احساس نے کم علم اور قدر سے نامزد کرالا۔“

”انگو کا سر ہے حاسن پیمانے مجھے بتایا۔“ دوشا بے حد ایکساؤنڈ ہو گئی تھی۔ وہ دھکی سے مسکرا رہی تھی۔
 ”انہوں نے مجھ سے بتاتے ہوئے معلوم کیا کہ انہوں نے بولے اتنا خوب صورت نام انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اور کوئی نہیں نہیں سنا۔“ دوشا تاریکی میں کئی کنپیاں سلگ گئیں۔

”اور جانتے ہیں ہمیں انہوں نے کہا کہ مجھ پر یہ نام بہت سوٹ کرتا ہے اور یہ کہ میں بھی اپنے نام کی طرح ہی دھکی ہوں۔“ دوشا کی لڑکیوں سے بہت مختلف سب سے یونیک اور بالکل بہت کڑا سنے نام کی طرح ہی منفرد اور میری آواز تر دتا وہ جیسے بولے گھور کی جیسی ہی قدرت کی ایک جرت انگیز تر نرم دناڑک اور سر بھری تخلیق اپنی تعریف سے کئی انجمن ہوئی ہے مجھے آپ جانتے ہیں ناں ہمیں پڑان کا انداز اسنادا اور دھکی تھا کہ مجھے زندگی میں پہلی بار اپنی تعریف پر مرکز بری نہیں کی۔ سنا ہمیں محسوس ہوئی جرت ہے آپ کو میرے نام کا مطلب بھی معلوم نہیں ہمیں۔“ اپنی ہی دوشا بولتی وہ بہت دیر بعد ہمیں کی علامتی پر حیران ہو گئی تھی۔ ایسے میں کی ایک ایک بوسل ہوئی دھک دھک میں اچھا ہمیں خاموشی سے بیڈی بائیں جانب موجود سائڈ ٹیبل لپ کے سہارے ٹکائے گئے بریف کس کی سمت بڑھ گیا۔

”میں اب کیلئے تمہارے لیے کچھ لایا تھا جہیں گفت کرنے کے لیے اسی لیے لانا چاہتا تھا اسی لیے تمہیں بلایا تھا چلو کئی بات نہیں تم وہ گفت ابھی یہاں مجھ سے لے لاؤ اور پھر پھر لگے تو صاف بتا دینا زبردستی کی

حیران رہ گئی تھی ایسے ہی بالکل آپ کی طرح کیا آپ کو میرے نام کا مطلب معلوم ہے ہمیں؟“ دوشا کی آنکھوں میں ہریل اشتیاق کی چمک گہری ہو گئی۔ دوشا کے اچانک بولنے پر میرے تاثر ساٹ چہرے سمیت ہوئے۔
 ”سروگوش میں نہیں دے سکتیں کوئی اس بارے میں قطعی ہے کسی پر اپنے انتہائی درجے کے کم علم ہونے کے احساس نے کم علم اور قدر سے نامزد کرالا۔“

”انگو کا سر ہے حاسن پیمانے مجھے بتایا۔“ دوشا بے حد ایکساؤنڈ ہو گئی تھی۔ وہ دھکی سے مسکرا رہی تھی۔
 ”انہوں نے مجھ سے بتاتے ہوئے معلوم کیا کہ انہوں نے بولے اتنا خوب صورت نام انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اور کوئی نہیں نہیں سنا۔“ دوشا تاریکی میں کئی کنپیاں سلگ گئیں۔

”اور جانتے ہیں ہمیں انہوں نے کہا کہ مجھ پر یہ نام بہت سوٹ کرتا ہے اور یہ کہ میں بھی اپنے نام کی طرح ہی دھکی ہوں۔“ دوشا کی لڑکیوں سے بہت مختلف سب سے یونیک اور بالکل بہت کڑا سنے نام کی طرح ہی منفرد اور میری آواز تر دتا وہ جیسے بولے گھور کی جیسی ہی قدرت کی ایک جرت انگیز تر نرم دناڑک اور سر بھری تخلیق اپنی تعریف سے کئی انجمن ہوئی ہے مجھے آپ جانتے ہیں ناں ہمیں پڑان کا انداز اسنادا اور دھکی تھا کہ مجھے زندگی میں پہلی بار اپنی تعریف پر مرکز بری نہیں کی۔ سنا ہمیں محسوس ہوئی جرت ہے آپ کو میرے نام کا مطلب بھی معلوم نہیں ہمیں۔“ اپنی ہی دوشا بولتی وہ بہت دیر بعد ہمیں کی علامتی پر حیران ہو گئی تھی۔ ایسے میں کی ایک ایک بوسل ہوئی دھک دھک میں اچھا ہمیں خاموشی سے بیڈی بائیں جانب موجود سائڈ ٹیبل لپ کے سہارے ٹکائے گئے بریف کس کی سمت بڑھ گیا۔

”میں اب کیلئے تمہارے لیے کچھ لایا تھا جہیں گفت کرنے کے لیے اسی لیے لانا چاہتا تھا اسی لیے تمہیں بلایا تھا چلو کئی بات نہیں تم وہ گفت ابھی یہاں مجھ سے لے لاؤ اور پھر پھر لگے تو صاف بتا دینا زبردستی کی

Aanchal + Decembe + 2004 45

تعارف مجھے پسند نہیں۔“ یمن پلٹ کر اس کے مقابل آیا تو اس کے ہاتھوں میں بے حد حسین گلشن جھنگا ہوا سا گلفٹ پیک تھا۔

”یہ میرے لیے ہے؟“ دوشانے بہت حیران نظروں سے بے نقبی سے اسٹ شہادت سے اپنی طرف اشارہ کیا ہے۔ اچھی طرح یاد تھا اس نے یمن کے یمن کے اسے کوئی گلفٹ نہ دیا تھا۔ سو اب اس کی حیرانی بجا تھی۔

”ہاں صرف تمہارے لیے میری دوشا کے لیے صرف اور صرف میری دوشا کے لیے۔“ یمن کا سر گھونٹا نہ دم دھیا انداز دوشا کو اک شمدت سے چونکا کھا لفظا خوب صورت تھے۔ اظہار انوکھا لکچر جاذب دل ہر قسم کی حدت و شمت سے عاری بہت خوب صورت دلکش طریق کاری میں پر دیکھ جیسے ایک عام کی رتی نائی معمول کی بات کی تھی۔ اپنی طرف بڑھانے کے کرشمے لگاتے جگر جگر کرتے گلفٹ پیک کو آہستہ سے تھامے ہوئے دوشا ابھی تک یقین سے خالی نگاہوں سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ بولے ہوئے ٹپکیں جھپکاتی بنا کچھ کہنے خاموشی سے۔ اچھی یمن کی آنکھوں میں جو چہرے کے نقوش میں تھا درجہ جویوں پر تھا وہ آنکھوں میں تھا۔ ”لاناگ ڈرائیو کا سوڈے؟ میں ہاتھ لے لوں پھر چلتے ہیں۔“ سوال رائے اور ارادے کا اظہار کرتا وہ کلمی مسکراہٹ سمیت مخصوص دھیمے انداز میں کہہ کر وارڈ روب کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اس درجہ الغات پر حیرانی اور بے نقبی کے ایک اور دھچکے نے دوشا کو کچھ چل اور گنگ کیے رکھا تھا۔

”اس میں میرے لیے کیا ہے۔ کیا میں ابھی اسے کھول کر دیکھ لوں یمن؟“ پھر گلفٹ پیک کے گرد پھرنے پک کر کے کلمی ارین کی گردی بندش کوئی دوشا کے کس بھرے انداز پر شری کی استحقاق سے کھولے ہوئے وارڈ روب کی سمت پیش قدمی کرتا یمن فوراً ایڑھیوں سے کلمی اس کی سمت گھوم گیا۔

”ابھی نہیں دور روز بعد میری ہفتہ ڈے والی شام اپنی

تیار کی سے پہلے تیرے کھولو گی دوشا۔“ وہ ایک بار پھر اسے حیرت سے دوچار کر گیا دوشانے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کو یاد ہے آپ کی دور روز بعد ہفتہ ڈے ہے یمن؟“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ وہ اس کی حیرانی پر دھیرے سے مسکراتا ہوا اس کے ہاتھوں میں موجود گلفٹ پیک کے گرد پھر سے بن کی کرہ لگانے لگا۔

”پراس میں سے کیا یہ بتاتے ہیں یمن؟“

”اس میں ایک بہت خوب صورت ڈریس ہے جو میں چاہتا ہوں۔“

”اگر آپ اس تقریب کے لیے تو حاسن بھانے مجھے ایک بہت زبردستی ساڑھی گلفٹ کی یمن۔“ یمن کی بات کا اثر کردہ حیرت زدہ تیار تھی۔ ایک چہرہ وارڈ روب کی طرف جاتا ٹرٹ کے گرد گیان کے جتن کھولتا ہوا یمن ایک گہرے اضطراب کی دلدل میں جھٹکتے سمیت اس کی سمت سارک پکوں سے نکلتے ہوئے اپنی انگلیوں کو جھرت دینا بھول گیا۔

”اب میں کیا کروں گی یہ تو بڑی بڑا بڑا بات ہو گئی ہے۔ مجھے بتائیے میں کیا کروں یمن؟“

”کیا ہے نہیں معلوم کر اسے کیا کرنا چاہیے۔“ یمن کے سپاٹ چہرے پر ایک پیش چھیننے لگی۔ ٹرٹ کے گرد گیان کے منہ کھولتے ہوئے وارڈ روب کی سمت چلتے ہوئے یمن کے دل کی بھول ہوئے والی دھڑکن آہستہ آہستہ تیز ہونے لگی۔ وہ بھانک خواب سے جاگ جانے والے کی ٹھہرا حال انسان کی مانند سیے ہوئے دل سمیت ٹرٹ اتار کر صوفے پر اچھالنے کے بعد مطلوبہ ٹیگر کیا گیا۔ استری شدہ لباس وارڈ روب سے نکال کر بھول منشر دھڑکن سمیت دالیں روم میں چلا گیا۔

یمن اس معاملے میں کبھی بھی عقلی فیئر نہ رہا تھا۔ مگر زیب علی برکس بہت شاندار طریقے سے یونی اس کی ہفتہ ڈے کے موقع پر بے حد خوب صورت قابل ستائش اہتمام کیا کرتی تھیں۔ یمن انیس من نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایک سال کی خواہش کو روک نہیں کر سکتا تھا۔ سو برکس سات ستمبر کی شام پانچ بجے یمن کے موقع کی اس عالتان تقریب میں وہ بھی بس مہمانوں کی طرح ہی شامل تقریب وہ چاہتا کرتا تھا۔

”یہ لوگوں میں پتی ہفتہ ڈے ٹو یو۔“ کچھ ہی دور سے انگریز کے ایک سرمدی پر جوش آواز و انداز میں مخاطب کرنے پر چند کاروباری دوستوں کے حلقے میں کھرے کھڑے یمن کی ساتھیوں میں ایک یمن کی ساتھی۔ آج کی طرح۔

آج سے 15 برس قبل 14 سالہ حاسن اور 10 سالہ یمن کی ہفتہ ڈے کو شکر طور پر منایا جاتا تھا۔ دونوں کی عمر میں چار برس کا فاصلہ تھا مگر تیرہ ممبر کی شام دونوں کے بچا حال اس فاصلے کو کمال حسن سے سمیٹ لیا کرتی تھی جیسے کہ آج وہ اپنی اپنی حیات کے مختلف ادوار سے گزرتے کے بعد عروں میں چار سال کے فاصلے کے بعد دوبار ایک ہی موز پر کھڑے تھے۔ بہت ہی قابل رشک نگاہوں کی روشنیوں کے خلوص بھرے حصار میں ڈھیر ساری محبتوں کو سمیٹتے ہوئے بظاہر مطمئن

مسکراتے ہوئے بہت پرسکون بے حد شانت پر درحقیقت ایک دوڑے سے کھول دوڑے صدیوں کی ایک نئی نئی جوانپائی فربتوں کے باوجود ان دونوں کے بچا صلوں کی دور یوں کی بدگمانیوں اور اجنبیت کی ایک افسانہ لکیر کھینچ چکی تھی۔ کتنی ہی چلی جارہی تھی۔ دوڑک بہت دور دور تک۔

موز ڈروڑ۔

وارڈ وارڈ۔

”کس کدھر ہو یا رہ بھائی کب سے پکار رہی ہیں۔“ پاس کھڑے فرہادی دوست رضوان نے یمن کے شانے پر ہاتھ رکھا یمن ایک شمدت سے چونکا تھا۔

”یمن۔“ دوشا کی پکار کی سمت یمن کی نگاہیں انھیں اور مہمانوں کی بھڑے پھلو پہنائی راست بنائی قریب آتی ہوئی دوشا پر ٹھہرے ساکت ہو گئی۔ وہ مہمان کی رنگ کی وہی ساڑھی زیب تن کیے ہوئے تھی۔ جو دور دراز اس نے تختہ بازی تھی یمن کے فریڈ رضوان۔ عظم اور میر دوشا سے رکھی ایک سلیک کے بعد ان دونوں کو تبا چھوڑ دینے کے خیال سے ایکسکیز کر تے قعداً مخالف سمت میں چلے گئے۔

”تم کب آئیں؟“ یمن اس کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرایا۔

”ابھی کدھر رہ رہی ہوئی ہے آپ کو کتنی گری تھی۔ پتی ہفتہ ڈے ٹو یو۔“ چمکتی آنکھوں مسکراتے ہوئوں پر چاہتوں کا گداز لیے ایک بھڑی شکل کا گلفٹ پیک یمن کی سمت بڑھایا پر پل اور میروں کمر کے استراخانے جھگڑے دیر میں مقید ہاشت بھر کے گلفٹ پیک کے مضبوط پوروں سے تمام کر گرفت میں سنبھالنے یمن نے اس پر سے نظریں نہ چھائی تھیں۔

”شکریہ۔“ وہ مہمان کی رنگ کے پیراکن میں مزید نکھر جانے والے اس کے سادہ سے روپ کی تابناکیوں کو نگاہ سے سن میں جذب کرنا بدستور گرفتار تھی تھا۔

”کسنگ لگ رہی ہے یہ ساڑھی؟“ وہ شرارتا ساگی

Aanchal + Dece

September 2004 49

Aanchal + De

دیکھو میری طرف کیا کمی ہے مجھ میں؟“
 ”پلیز ٹرائی ٹوانڈر اسٹینڈی جائشہ حقیقت کو تسلیم کرنا
 سیکھو آئی ڈونٹ وانٹ یونہیں چاہتا میں تمہیں تم ہر لحاظ
 سے اک آئیڈیل لڑکی ہو اور میری آئیڈیل دوست پر
 جائشہ اس کے باوجود میں نے تمہیں نہیں چاہا کبھی نہیں
 میں نے تمہیں اس انداز سے کبھی نہ سوچا نہ دیکھا نہ ہی
 سوچ سکتا ہوں۔“

”تم اتنے سنگدل نہیں ہو سکتے ہمیں علی
 حشام..... ایک لڑکی اپنی چاہت کی ذلت کا سامان خود
 سے کبھی نہیں کر سکتی محبت میں اظہار عورت ذات کو سوٹ
 نہیں کرتا۔ یاد ہے ناں تم کو تم ہی نے اک روز مجھ سے یہ
 کہا تھا پھر بھی ہمیں پھر بھی میں نے محبت میں اس قدر
 گراؤٹ کو اپنایا مگر اس گراؤٹ کو میری محبت کی ذلتوں کا
 سبب مت بناؤ۔“ وہ بے بسی کی شدت سے گڑ گرائی۔
 یگانہ ہمیں کو ایک بار ندامت کے ان دیکھے پوچھ تلے
 وہ بانے لگی وہ خاموشی و اضطراب سے پہلو بدل کے رہ گیا
 تھا۔

”آخر کیا ہے ایسا جو ایک لائف پارٹنر میں ہونا چاہیے
 اور جو مجھ میں نہیں؟“ وہ رخ بدلے کھڑے ہمیں کے عین
 مقابل آن کھڑی ہوئی اس کی جانب دیکھنے سے احتراز
 برتنا ہمیں خالی ساکت آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے
 لگا۔

”میں تم سے کبھی تمہارے گھر رہنے کی بھی ضد نہ
 کروں گی بلکہ..... بلکہ تم جاہو تو ہم تمہاری اور میری شادی
 کو خفیہ ہی رکھیں گے ہمیشہ کے لیے ہمیں۔“

جائشہ اس کی خاموشی کے لمحات کو چپ چاپ سرکتے
 نہ دیکھ سکتی تھی اور اس کی چپ سے بے نیاز اپنی ہی کبے
 جارہی تھی ہمیں اک گہری جامد چپ سادھے خاموش
 کھڑا ساکت نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا سمندر
 کی لہروں کے شور میں جائشہ کی آواز پھر ابھری۔

”میں عمر بھر تم سے کوئی گلہ نہ کروں گی ہمیں۔“ اک
 بھر پور وعدہ تھا جس کے جواب میں ہمیں کی چپ ہنوا

سکون اعتماد کھو چکا تھا۔ ایک ایک گھڑی کی شانتی چھین چکی
 تھی اور لمبے لمبے کی بے نگی بے چدیاں بے قراریاں اس
 کا نصیب بن چکی تھیں اور ہمیں ٹوٹی بکھری شکستہ
 شل مسخ شدہ سوچوں کے ٹھن زدہ تاریک زنداں میں
 مقید یادداشت کے ہر کونے کو خوب چھان پھنگ کر
 حالات و واقعات کی گرد جھاڑ کر اپنے کسی ایسے نادانستہ
 دوش کا سراغ لگا تا کہ جس کی شاید اسے اس کا مقدر سزا دیتا
 چاہتا ہوا اپنے کسی ایسے دانستہ گناہ کے نشان ڈھونڈتا کہ
 شاید جس کا ندرت اس سے کفارہ چاہتی ہو۔
 اور اب کبھی کبھی نہیں ہمیں اکثر سوچا کرتا کہ اپنی اس
 عمر گزشتہ کے مختصر عرصے میں اس کے جیون کے کسی موڑ پر
 اس نے کسی کا حق غصب کیا۔

کیسے خود کو تشغیر و تکرر کے زور پر کسی سے برتر جانا۔
 کب کسی کو طاقت اور دولت کے نشے میں خود سے
 حقیر و کمتر جانا۔ کہاں اہمیت شہرت حیثیت کے بل
 بوتے پر کسی کی خودداری کو مجروح کیا کسی کا دل دکھایا اور
 کس مقام پر کیوں کر وہ کسی کی ذات کے لیے دکھ تکلیف
 یا نقصان کا باعث ٹھہرا ہو کہ جس کے بدلے خسارے
 کے طور پر یہ بے درد دروگ اس کی حیات کی آسودہ زر خیز
 زمینوں پر بے سکونی اندیشوں خوف و دھڑکنوں ان گنت
 خدشات اور کرب و بے چینی کے بے قراری اور اذیت
 کے ٹیکسٹس اگا رہا تھا روز و شب بڑھا رہا تھا۔ دن بدن
 پھیلارہا تھا۔ تیزی سے ہر ہر لحظہ ہر ہر سست۔



”کیا نہیں ہوتا دنیا میں بولو ہمیں کیا نہیں ہوا۔ آج
 تک اس جہاں میں پھر دوسری شادی کوئی ایسا فیج نفل تو
 نہیں دو بیویاں رکھنا نہ دنیا کے سامنے ناقابل معافی جرم
 ہے نہ اسلام و شریعت میں گناہ گردانا گیا ہے اسے پھر
 کیوں آخر ایسا میرے ہی ساتھ کیوں ہمیں کیوں کیا
 کی ہے مجھ میں کیا چاہتے ہو تم ایسا جو مجھ میں نہیں
 دولت محبت جوانی شہرت حسن اس سے بھی زیادہ اور کیا
 چاہیے تمہیں آخر کیا ہمیں؟ اور دیکھو میری طرف ہمیں

قائم رہی تھی۔

نہی، خلوص سے نبھانے کے اصولوں کی بنیاد پر ہی قائم ہوئی تھی پر مجھے نہیں لگتا کہ تمہیں دوستی کے تقاضے یاد دہانی کا کوئی ایک بھی اصول یاد ہو۔“ دوشا کے لیے اس کا گھٹیا انداز تحاطب و نفرت دیکھ کر اپنا تمام تر ضبط و تحمل گنوا کر وہ اس کے ساتھ بیٹھتا آج پہلی بار اس درجہ تلخ ہوا تھا وہ کہتے ہی لمبے لمبے پھینکیے سے یمن کی صورت دیکھتی کئی بل ونگ ونگ ونگ ہوتی سن و ساکت کھڑی رہنے کے بعد اچانک ٹپ کے ترخ لٹکی بیٹھی تھی۔

”میں سو بار لعنت بھیجتی ہوں اس دوستی اور اس کے تمام تقاضوں اور ہر اصول پر کیا سمجھتے ہو تم مسٹر یمن علی حشام تم مجھے دھتکار تے پھنکارتے رہو گے اور میں ایک نہایت گھٹیا قسم کے عشق میں مبتلا کسی لوئر مڈل کلاس کی اسنو پڈ سی لڑکی کی طرح تمہارے قدموں میں سر رکھ کے گر گڑاؤں گی تمہاری خوشامدیں کروں گی تمہاری منتیں کروں گی تمہارے پاؤں پڑوں گی نو۔“ وہ کسی زخم خوردہ ناگن کی طرح پھنکارتی۔

”نو مسٹر یمن علی حشام بہت غلط اندازہ لگایا ہے تم نے میرے ضبط کے بارے میں۔ سنو یمن علی حشام دنیا میں کہیں بھی کوئی ایسی عورت نہیں ہوگی جو اپنی محبت کے ہاتھوں اس انجنا تک رسوا اور ذلیل ہونا چاہے گی اور کوئی ایسی عورت دنیا میں اگر کہیں ہے بھی تو اس کا نام کم از کم جائشہ فصیح تو ہرگز نہیں ہو سکتا نو نو نو۔ مجھے تم سے محبت ہے یہ اعتراف میں نے ہی تم سے کیا تھا اور آج میں ہی اس محبت سے دستبردار ہو رہی ہوں آئی ہیٹ یو نفرت ہے مجھے تم سے شدید نفرت۔“ جس قدر پرسکون انداز میں وہ آج ایک بار پھر دلر باناز و انداز کے ہتھیاروں سے نہیں ہو کر یمن کے ضبط و ایمان کو متزلزل کر دینے کے ارادے سمیت اس کے پاس آئی تھی اسی قدر جانتے سے وہ سکر لعلق بدگمان متنفرد و متشعل اور پھیری ہوئی تھی اور یمن اس کے آنے پر جس قدر اپ سیٹ ہو گیا تھا اس کے چلے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک پشیمان اور پریشان سا بے چینی و اضطرابی سے ساحل سمندر کے کنارے بیٹھ گیا

”تمہیں میرا لائف اسٹائل ناپسند ہے ناں میں اسے بھی تمہاری پسند کے مطابق تبدیل کر لوں گی خود کو تمہاری پسند کے سانچے میں ڈھال لوں گی جو تم کہو گے وہ کروں گی جو تم نہیں چاہو گے میں اسے اپنی چاہ نہ بناؤں گی آئی پراس آئی سوئیر یمن۔“ کئی نازک و مضبوط وعدوں کی ڈور میں لپٹا قابل غور و قابل توجہ اک اور پھر پور عہد یمن کے قدموں میں دھرا تھا۔ مگر وہ بنا کوئی تاثر دینے یوٹی خاموش کھڑا تھا۔

”تمہاری محبت کے سوا تم سے اور کچھ نہ مانگوں گی بلکہ یمن تم..... یمن تم چاہو گے تو میں اپنا سب کچھ تمہارے نام منتقل کر دوں گی۔ اپنی تمام پراپرٹی۔“ اسے بہر صورت پالینے کی ضد کو اپنی انار پر سوار کیے جاؤں گے کچھ دام مزید بڑھائے لیکن یمن اب بھی خاموش تھا۔ اس کی ساکت آنکھوں میں بل بل کر پھر ہوتی سرخی اس کے ہر بل مضبوط ہوتے ضبط کی گواہ تھی۔

”تم خود غرض ہو یمن انکار کر رہے ہو پچھلے دو سال سے بار بار دھتکار رہے ہو مجھے میری محبت کو وہ..... وہ دوشا سے کیا چیز میرے مقابلے میں جسے مجھ پر ترجیح دے رہے ہو تم جس کی خاطر مجھے ٹھکرا رہے ہو اور مجھے ٹھکرا کر جسے اپنانا چاہتے ہو۔ بولو ایسا کیا ہے۔ اس ڈائن میں آئی آئی کل ہر۔“ نام نہاد ضبط کا مظاہرہ کرتی شاید وہ تھک گئی تھی۔

”یہی انداز تمہارے یہ ہی بے ہودہ انداز و اطوار زہر لگتے ہیں مجھے اپنی ذات کے لیے اپنی ذات کی بقا اور خوشی کے لیے ہر دوسرا انسان تمہارے سامنے بیچ بے بیچ ہے گھٹیا ہے، کتنا سمجھایا تمہیں میں نے سراب کے پیچھے بھاگنے والوں کا انجام عمر بھر کی آبلہ پانی میں تھڑکی ہوئی ناکا کی ہے نامرادی اور بربادی ہے واضح طور پر صاف ساف لفظوں میں باور کرا چکا ہوں۔ تمہیں کہ ہم فقط دوست ہیں۔ دوا جیسے دوست اور بس اور ہماری یہ دوستی تین سال پہلے صرف دوستی کے تمام تر تقاضوں کو نیک

کناروں پر کسی سے ہٹتا رہا تھا۔ اس کے دیباغ کی شیریں باتوں میں ایک تکلیف دہ سناسبت ہوئی تھی۔ کیا واقعی ان دونوں کی یہ ملاقات آخری ملاقات تھی؟ بہت دیر تک ایک ان جالی سی پریشانی و دشمنی کے بلبوں کی زد پر رہنے کے بعد ایک بے یقینی سے ممکن کو اپنے گھر سے لے لیا۔ پچھلے تین برسوں سے جانشین کی ساری طرح اس کی ذات کا حصہ بنی رہی تھی۔ اسے معلوم تھا جانشین کی طرح جانشین کی موت بھی مرگش ہے۔ باک و دوغڈی و محبت جو کمین کے لیے تھی وہ ساری جو کمین کے انتقام کے حصول کے لیے تھی وہ بے باکی جو کمین کی جاہت کی خاطر تھی کیا آج وہ واقعی تمام دے گا اپنے انتقام کو سنبھالے گی۔ ہمیشہ سے کمین کے لیے کیا جانشین کی یہ سرکش وہ بے باک لڑکی کا واقعاتی بندرگاہ تھی جس کی جاہت کا گلا گھونٹ کر اب تمام عمر نہ صرف سکھ چین کی بلکہ اک کامیاب زندگی بسر کیا کرے گی اپنے جیون سے کمین علی شام نای آدی کا خاصہ بیکارگاہی حیات میں کمین علی شام کو کسی بھی عمل یا دیکے بنائے سے برہنہ بھلا کر؟

☆☆☆

”دیر سیڈ“ وہ دس رہا تھا۔ بے توجہ شائیں رہا تھا۔ وہ ڈیڈی انکھوں سے اس کی جانب دیکھتی شید رنج و شکنی بھرے انداز میں دیکھتی ہے کسی سے اب دانتوں تلے چٹکی رہی پھر بچتر سے اٹھ گئی۔

”سب جان کر تھواری خوبی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہ گیا ہے تو مجھے انداز تھا ہی اس انتہا تک سفاکی کی تو میں تم سے بھی بھی توقع نہ کر سکتی تھی۔“ اس کے بعد چکر بہت جی کے ناراضگی سے گھر گئے کہ وہ ریخت ہی روک کر کافی کے چند آخری سہ لیتا خالی گیم میز پر دھر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دیکھ رہی تھی اس کی غلطی انکھوں سے مسکراتا اب کبھی چوڑی پر نہ رہی۔ اسے خاموشی سے ایک جانب قدم بڑھا دے دیکھ کر وہ بھی مسکرتا ہوا آیا۔

”میں سوچ نہیں تھی کہسے تھی کہ وہ اس انتہا تک گر جائے گا۔ اتنا غصا لگے گا وہ شخص یا تو حاسن خواہی نے مجھے پروپوز کیا تھا۔ پر پاپا کی شرانگہ سانسے آتے ہی کہے۔ ”نیکی اگر کل گاٹاں کو میں نہیں پروپوز کر ڈالوں تو اس کا مطلب ہو گا کہ میں تمہارے ساتھ بالکل سنسیر ہوں۔“ حاسن کھدا تھا۔

”آبی کے خلیوں کو چاٹنے پانے کا بھی کوئی پیمانہ کہیں سے پیمرا آسکتا ہے کیا حاسن؟“ وہ گہرے رنج کی لپیٹ میں تھی۔

”اچھا چلو خاک ڈالو اس بے ہودہ انسان پر دراصل معاملہ جس سے ہے کہ وہ کیا فرما گئے ہیں۔ ہمارے سیانے کہ ہر کام میں اس باغی اور پرتلذات پاک کی کوئی نہ ہو سکتی مصلحت پوشیدہ ہوا کرتی ہے۔ اب سوچو نا کہ کس طرح انکار کر سکتی ہیں اس اول جلول تمہارے تمام انجاس امیدوار حسن سلمیٰ کے ساتھ سے تو یہ تمہاری حیات میں اس ڈاکٹر ویشان کی بر وقت انٹری بھی مجھ وقت کرت کی ایک شاندار مصلحت تھی کسی نا ان کا تم میں اس اول جلول کے پروپوزل کو رد کر دینے کی جرأت و ہمت پیدا ہونے کے چلو اب مجاز میں جو کچھ اس سارے قصے کو اور اب پسکوں ہو جاو۔“

”لیکن بابا کو کون سمجھائے حاسن جنہیں اپنے اس عزیز دوست کے پروپوزل کے ساتھ سے نکل جانے پر سخت ملال ہے مجھے تو لگتا ہے کہ میری عمر کے بڑھنے کی پریشانی سے زیادہ ان بوس اول جلول کے ساتھ تمام اپنے سات سالہ خوشگوار تعلقات کے ختم ہونے کا افسوس ہے۔“

”خیر یہ ہے ایک پرلے درجے کے کرپٹ انسان کو منظر اسی صاحب جیسے باقارو بلند کردار انسان اس درجہ اہمیت بھی دے سکتے ہیں جیلا لاکہ ان کو تہا رہے فیصلے سے اتفاق ہوتا چاہے تھا اور پھر وہ تم سے دو گنی عمر کا شخص بھی ہے۔ تمہارے ساتھ بالکل سوس نہیں کرتا۔“ حاسن کے لیے میں حقیقی تاسف تھا۔

”بابا مجھ سے بہت سخت تھا ہیں حاسن پلیز تم ان کو

سمجھاؤ۔“

”جی ہاں میں مصروف ہوں لیکن پراس جیسے ہی وقت نکال پایا میں ان سے ضرور ملوں گا آج گھر میں ہوتے تو ممکن تھا تھا اس سے بھی ملاقات ہو جاتی۔“

”ہوں تم بے وقت آئے ہو اگلی گھنٹہ پر پہلے ہی وہ چیک اپ کے لیے گئے ہیں طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی وہی ہائی بلڈ پریشر کا پرالیم۔“ وہ اسے بتا رہی تھی۔ حاسن کی نکت نے اسے خاصا پسکوں کر دیا تھا۔ لان کے بیچ بیچ استوار رہا دیر پر قدم سے قدم ملا کر چلتے چل بدل دیر کے دوران وہ کافی دیر تک با تیں کرتے رہے حاسن اپنی کچھ انجمنیں اس سے شتر کرنے کے ارادے سے ادھر آئی تھا۔

”جو خود اس قدر پریشان تھی کہ حاسن اپنے قلب و ذہن کا پوجہ لگا کر نے کی بجائے تمام تر غلطی اور توجہ سے اس کی دلجوئی میں مصروف ہو گیا تھا۔“

☆☆☆

”ماما نے جب مجھ سے دوشا کے لیے بات کی کہ وہ دوشا کو اپنی بیوی بنانا چاہتی ہیں تو میں نے انہیں یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا کہ میں بھی دوشا کو اپنے لیے اس حوالے سے پسند کرتا ہوں اور یہ حقیقت تھی کہ میں دوشا کو پسند کرتا تھا۔ اس وقت سے کہ جب میں دونوں اسکول فیوز تھے پھر جب دوشا نے میرے کان میں ایڈیشن لیا تو میں نے دوشا کو اپنی پسند ہی کی تھی آگاہ کیا اور اسے کہا کہ میں اس سے دوستی کرتا چاہتا ہوں پر دوشا نے انکار کر دیا۔ اس نے زیادہ ان بوس اول جلول کے ساتھ تمام اسے دوستی کے خلاف سے گھر ہمارے کھیلنے کے اچھے تعلقات اور بڑی ہونے کے ناتے وہ بھی کبھی میری کھنی سے انکار نہیں کرے گی۔ دوشا کی فیملی میں لڑکیوں کی کم عمری میں شادی کر دینے کا رواج ہے اسی خدشے کے تحت ماما مناسب وقت کا انتظار کیے بنای میرا پروپوزل دوشا کے لیے لے گئیں جو کہ قبول کر لیا گیا دوشا اس وقت فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی اور میرا کالج میں تھوڑا بڑھ گیا تھا۔ کالج کرنے کی بات خود دوشا کے پیڑس نے منوائی کیونکہ ان

کے خاندان میں منگنی کی اہمیت نہیں پھر ہمارا کالج ہو گیا۔“

”خبرے خبرے ہم دیکھتے اب دیکھتے میں بات کرتا ہمیں اچا کھا خاموش ہو گیا اسے معافی اپنے حلق میں ایک تکلیف دہ جھپٹ محسوس ہونے لگی اسے لگہ دے جیسے مر دیا ایک لفظ بھی اپنے حلق سے ہونوں تک نہ لایا ہے گا چند ساتیس چپ چاپ گزر گئیں۔ ہمیں نے اپنی جھٹکے چہرے سمیت ایک دوسرے میں پیوست رہ جانے والے ہونوں پر زبان چیمیرے ہوئے اپنی پیشانی پر ابھر آنے والی نمی کو انہیں کی پوروں سے صاف کر کے ایک مرتبہ پھر ہونے کی خوشی کی ہونوں کو بدقت تمام جمن ہوئی۔

”دوشا دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ کسی عام عورت جیسی سوچ نہیں رکھتی یہ مجھ پر دوشا کے ساتھ میرے کالج کے بندھن کے بعد سے ہر حال ہوا۔ دوشا جیسی لڑکیاں دنیا میں بہت کم ہوتی ہیں جو حلال ہوں۔ دوشا طور پر و مطمئن رہنا چاہتی ہیں جن کے لیے دکھ تکلیف صدمے نقصان سے ہم آہنگ تمام کرنا اس قدرت کا ایک امتحان ہوا کرتے ہیں۔ وہ خود کو پہنچنے والے کسی بھی دکھ ضرر یا نقصان کے لیے انٹرکس دوسرے کی ذات کو مورد الزام نہیں سمجھتا بلکہ تقدیر کی ایک آزمائش ہی جان کر صدمہ دل سے اس پر پرواز کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ دوشا کو دلایا جواب اور تابیاب ہے پر میں.....“ آواز اور لفظ ایک با پھر کمین کے حلق میں لوگ خار کی مانند لنگ کے رہ گئے۔ بکھت ہی اپنے ہاتھوں میں اڑتا رہا جسے والی لڑش پر قاتل پانے کے لیے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے میں جکڑتے ہوئے ہمیں سے بھرے لب کشائی کی۔

”پر میں بہت عام انسان ہوں میں دوشا جیسا غیر معمولی صبر و ضبط نہیں رکھتا“ میں اس کے برعکس بہت نا توائل حوصلہ کمزور اعصاب رکھتا ہوں۔ نفسانی و بشری کمزوری کے آگے اپنے صبر محل برداشت قناعت و استقامت کے مورال کو بلند کر دینا میرے لیے بہت مشکل ترین ہے۔“ لفظ لفظ کو پہنچ کر لیبوں تک لاتے ہوئے

سنبھل سمجھ کر بولے ہوئے یمن کے ہاتھوں میں ہوتے خفیہ راز پر قابو پانے کے لیے کچھ اور مضبوطی سے ہاتھوں کو ایک دوسرے کا سہارا دیتے ہوئے بٹھنے ہلاک ہو کر پھٹا پھٹا گیا۔

”دوشا کو مجھے سے بچھڑنا ہے تو شاید وہ کچھ درد کو برا لاؤ خراسا بھی اپنے مقدر کا کوئی امتحان اپنی قسمت کی خرابی یا قدرت کی کوئی آزمائش جان کر سمجھتا کرے گی۔ پر میں ایسا نہیں کر سکتا گا۔ میرے لیے دوشا سے بچھڑنا میری موت ہوگی۔ میرے لیے دوشا کی جدائی میری موت سے زیادہ بدترین و باعث آزار ہوگی۔ شاید دوشا سے بچھڑنے میں زندہ رہوں میری آرزو کے باوجود موت مجھے یہ قبول کرے پر زندگی کو میں بھی قبول نہ کر پاؤں گا۔ میں دوشا کے لیے اپنے دل و دوش میں اپنی جیت میں دوشا کی چاہت میں اپنی شفاف فکر کی نیت میں بھی اپنی زندگی نہ نہیں دے سکتا کہ دوشا کی جدائی کے بعد بھی میں پر سکون رہوں گا مایاب رہوں یا مایاب رہا دوشا اور یوں یہ بدویاتی ہوگی اور میں خود کو اپنے دل کو اس بدویاتی کے لیے بھی آمادہ کر نہیں جاؤں گا خواہش رکھتے ہوئے بھی یا کوشش کے باوجود میں ایسا کچھ نہ کر پاؤں گا۔“ وہ لکھتے ہی جیسے ہتھکڑ کر خاموش ہو گیا خود کو جھپکا کر رکھتے ہوئے بھی دوسروں پر نہ جانے کے باوجود ظور پر غماز کر دینا تو خود آپ کے لیے بھی یقیناً کوئی باعث غنائیت یا باعث مسرت و باعث سکون بات تو قطعی نہیں ہو سکتی۔ یمن بھی اپنی ذات کے ساتھ اپنا اہم پہلوؤں سے پردہ کشائی کے بعد کچھ اچھا محسوس نہ کر رہا تھا۔ پہلے ہی بڑا غصہ تھا کہ اسے قراقرم سے مڑے پہاڑ اور بے یمنیوں اور غمیل کے لیے بارطمن تھے جسے کسی کے نیازی یمن کی کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ یمن کو ایک بیل کے لیے بھی ایسا نہیں لگا کہ وہ اس کی کسی بھی بات یا بھی ایک لفظ سے رلی برابر بھی متاثر ہوا ہو۔ وہ معمول کی طرح چوڑ پر سکون بے نیاز اور لائق اعزاز و تجور سے بیٹھا اپنے سامنے کھلی

اس معاملے میں خاموشی اس قدر تھیں کہ کسی نے کوئی بھی نہیں چاہا فیصلہ کرنے کے لیے جتنا کہ میں اور میں سمجھتا ہوں کہ جو جس کا حق ہے اسے مل جائے پس اس کا حق تو فیض کر دینا اہل انسانیت اور اہل ظرف ہونے کا اعلیٰ ترین ثبوت ہے۔ ہاں خراسا سے خاصی طویل نشست رہی ہے۔ میری اس معاملے میں دشمن کے لیے خراسا رضا اور شویت کے بنائے خود سے تنہا کیسے کو فیصلہ کر سکتا ہوں؟ ٹھیک ہے پھر میری قدری اختیار کو پر بات صاف اور واضح ہونی چاہیے جانے تو ہم میں کسی بھی معاملے میں شہیدہ نظری کا ہرگز قائل نہیں اس لیے بھی گھبرانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ایک موقع دینے میں تو کوئی ہرج نہیں ہوں اس کی کا حق اس سوچنے کے وجہ سے کر سکتا ہوں تو کسی سے اپنا حق وصول کیے جرات و اہلیت بھی رکھتا ہوں۔ ایک اور دارکاری ایک اور طرف بدست و مسلسل کی لپیٹ میں آکر اختیار دے کی توپ محسوس کرتے یمن نے اپنے وجود میں گردش پذیر ہو میں ایک بیل کے لیے کسی نہ کوئی اور ان دیکھے کی خدشات کی بجائیں اسے تو کوئی محسوس کی نہیں کیا وہ اپنے سر مہر انداز چیتے جھلساے لب و لہجہ الفاظ سے اور بے نیازی کی مار سے اس سے رنڈونٹ والی بدلچائی و بدبازی کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا قراقرم اس کے ارادے کچھ ایسے تھے تو وہ یقیناً اس کوشش میں کامیاب رہا تھا کہ بے نیازی کی پرواز کو چھوڑتے ہوئے یمن کے لیے ذرا دلچسپی کا گہری پانی پانی جس کی انتقاد گہرائیوں میں نہایت گہرے لہجے میں جانتی تھی چاہا رہا تھا۔ چار باؤں کی بے نیازی دلا چار کے گھ گھبراؤں میں محسوس ہو کر یمن کے حدود پر مجبور ہو کر شکست دے پست ہمت مجروح عزم گھماک روئے کے یکا یک ہی اپنے بدن و اعصاب پار آنے والے بوجھ کو کھانے اٹھ کھڑا ہوا اور کسی غیر مہر قوت کے زیر اثر چپ چاپ وہاں سے واپس لے جانے والے راستے پر قدم ڈال دیے تھے جب اسے اپنے عقب میں اچانک ایک ہماری دم گھبراہٹ چلا گیا۔

”اگر تم دوشا سے فقط محبت کرتے ہو تو پھر تم اس سے محبت ہونے کا بھی انتظار کرو محبت کرنے سے بڑھ کر محبت ہو جائے کہ قلب و روح میں اس عمل کے دوش پڑے ہوئے سے ذات کے اندر ایک ناقابل تخیل لافانی آہنی استحکام اور دلورقہ نم کے روم پر دم میں ترسیل ہو جاتا ہے جو تھکے نہیں دیتا اور جو تھکے نہ اس کے ہارے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ دم دہراندہ لہجے میں ایک مزید خاموش پہنچ یمن کو کشش سے محسوس ہوا تھا اور یوں روانی میں سے ایک گرم لہری یمن کے پہلو سے ابھری اس کے سلگ جانے والے دماغ کی جانب اچھلی تھی وہ کسی دُخ خورہ و متوحش طائر کی مانند پھڑپھڑاتے من کے ساتھ ٹوپ کے اس کی جانب پلٹا تو پہلی بار یمن نے اس کی نظر پر خود پر غور کیا یا کہ اس کا انداز اور لہجہ سرسری تاہم الفاظ کی تیزگی کی طرح یمن کو اپنی روح کے آگے پار ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اور وہ یہ ظاہر پر سکون آنکھیں کش دوسرا دوجہ نہیں ہیں اس کے یمن کے لیے بہت سے بڑے بڑے درد ڈھانچے ہیں۔ یمن کو ہر بار لگا کہ اپنی طرف اس کی اچھی ہوئی ہر فکھ کی نگاہ میں سفائی کی ایک کھجوتے ہوئی اور اس کی ہر مہرانی سے اس آنکھوں کی طرف لپکی اس کی ہر بار اپنی نظر میں محسوس و کڑی تعظیم ہوگی جو کہ چار حنا اور شہد ہوئی۔

”شاید تمہیں انتظار ہو کہ میں تھک کر مل ہو کر ٹوٹ جاؤں ہاں جاؤں یا کسی طور میری موت واقع ہو جائے اور تمہارے لیے دوشا تک رسائی ممکن اور انتہائی آسان ہو جائے گی۔“

”ایم ایم اے رامت؟“ تھے تھے مضبوط قدموں سے چل کر اس تک پہنچنے کے بعد اس کے مقابل ٹھیل پر ہتھیلیاں ہمارا کر اس کی جانب جھکتے ہوئے اس کی پر سکون آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھنڈے سیاہ بھاری مضبوط لہجے میں بولتے یمن کے اندر سے چند تھیل لٹل والی بے نیازی کی اور باجری مقفود ذرا مل ہو گئی تھی۔

”کسی کے لیے اس قدر باعث آزار مت ہو کر اسے تمہاری موت میں اپنی غائبی نظر آنے لگے۔“ مقابل کا

سکون قابل دید اور تحمل قابل واد تھا۔

”جو کسی کی منکوحہ کے لیے اپنی نیت میں فتور رکھے اس کے نار کے ملنے کی خواہش پر اسے اس سے ملنے سے باز رکھنے کے لیے بے ہودہ پچکا نہ حرے آزمائے اس کے نام کا مطلب ہوتا کہ اس کی مدح سرائی کی اوٹ میں اسے اپنی جانب مائل کرنے کی فضول گھسیاتری کیسیں لڑائے تھے تنہا تنہا ملاقات و روابط کی رسم کے در پردہ اس کی توجہ اپنی طرف سمیٹنے کے جتنوں میں جتا رہے ایسے منافق شخص کے لیے بھی موت سے کم کوئی سزا ہو سکتی ہے کیا؟“

ہیمن جو نامعلوم کیسے اپنے ضبط کو اب تلک سنبھالے مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا یکدم ہی تمام لحاظ احترام بھول کر بے طرح چیخ گیا تھا۔ جواباً وہ لبوں پر مدہم مسکراہٹ پھیلا کر تاسف سے سرفی میں ہلانے لگا۔

”چیخ، چیخ، اگر تم اس لیے مجھ سے بدگمان اور اتنے برہم ہو رہے ہو کہ میں نے دوشا کو اس کے نام کا مطلب بتا دیا تو وہ تو میں تمہیں بھی بتا سکتا ہوں تمہارے نام کے معنی مگرانی کے ہیں اور اپنے نام کے مفہوم کے عین مطابق فطرت پائی ہے تم نے لیکن چاہت میں محبت میں یہ بد اعتمادی اور شک چاند میں گرہن کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ محبت کو داغ دار کر ڈالتے ہیں بدنامنا دیتے ہیں۔ تم دوشا کے مجھ سے ملنے پر شک کا شکار ہو یہ جان کر دوشا کو کتنا دکھ ہوگا میں سمجھ سکتا ہوں۔“

”ایک بات یاد رکھنا مسٹر حاش علی حاشام ہو سکتا ہے میں قدرت کی منشا و رضا سے اس حاکم وز بردست کر نہار کی کرنی سے دوشا کو بارودوں کی دھند میں ایمان رکھتا ہوں کہ کوئی بھی ہوئی لاممکنات میں سے نہیں ممکنات کی حدود سے دور نہیں پر یقین رکھو ایسا صرف میری موت کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ میرا خود سے میرے دل سے میرے دل میں ہی دوشا کی چاہت سے عہد ہے۔“

”میں صدقہ دل سے تمہارے اور تمہارے اس عہد کے سرخرو ہونے کا انتظار کروں گا۔“ بے پناہ اطمینان سے وہ ہیمن کی چھلنی چھلنی روح میں ایک اور چھید کر گیا۔

ہیمن از حد رنجیدہ ڈھی شاکی نظروں سے اس کی سمت دیکھتا رہ گیا تھا لیکن پھر ایک لفظ بھی مزید کہے بنا وہ مہر بہ لب ہوتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔ نڈھال روح تھکے ہارے دل سمیت وہ یہاں آیا تھا تو فقط اس لیے کہ اس نے سوچا تھا شاید اس شخص کے دل میں کچھ مروت کچھ احساس باقی ہو پر اسے نہیں معلوم تھا کہ مروت احساس کے علاوہ وہ انسانیت تک سے نابلد عاری ہو چکا تھا۔ ہیمن یہاں آ کر ایک آخری امید بھی گنوا بیٹھا تھا کون جانے یہ کس جرم کی پاداش میں پل پل کا روی بن بیٹھا تھا کہ کسی پل چین نہ تھا کسی کل فرار نہ تھا اور اب وہ جہاں بھی جاتا ایک درد لادوا تھا جو ہر گھڑی ساتھ رہتا مسلسل شانہ بہ شانہ پہلو بہ پہلو دم بہ دم قدم رہتا وہ آفس سے نکل کر جس تیزی سے اس کی نیم وارہنے والی پلکوں تلے گہرے دکھ پاؤسی ان گنت اوبام و اندیشوں کی لرزنی پر چھائیوں سے لپٹی بے بسی دے چارگی کے انڈ آنے والے سادوں کی جل تھل کی تھر تھرائی نمی گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔



”ہیمن وہ لرزتی پلکوں تلے بے یقین آنکھیں لیے اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ وہ جب اس کے ہینڈ ڈور پر ناک کے جواب میں پلینز کم ان کی مدہم صدا یا کر اندر داخل ہوا تو وہ اس کی ابھی بھری حالت کو دیکھ کر یکدم پریشان ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت کلف لگے کاشن کے دائرہ گرتا شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ آنکھوں میں رت جگے اور گہرے اضطراب کی سرخیان تیر رہی تھیں۔ جا بجا شکنوں سے انا لباس کئی روز کی بڑی ہوئی شیڈو انکھیوں سے سمٹ کر بے دلی سے سنوارے گئے گھنے بالوں سے جھلکتی بے تربیتی کے ساتھ مضطرب آنکھیں تھکا بچھا چہرہ شکستہ نڈھال انداز لیے وہ کہیں سے بھی ویل ڈریسڈ پر اعتماد ہیمن علی حاشام نہ لگ رہا تھا جس کی پر اعتمادی و وفاست کا ایک زمانہ بداح تھا اور اس کی حالت پر پریشان ہواٹھنے والی دوشاب اس کے غیر متوقع الفاظ

پردگ کھڑی تھی۔
 ”میں نہیں جانتا ہم ایسے شخص سے ملو جس سے مجھے
 تمہارا بات تک کرنا پسند نہ ہو۔ کسی بھی جواز کے تحت کسی
 کی بھی یا پھر اس کی خواہش یا..... یا چاہے خود میری ہی
 اجازت کیوں نہ شامل ہو۔ تمہارے اس سے ملنے کے
 لیے پھر مجھ میں جانتا ہوں کہ تم اس سے مت ملا کرو۔
 کہیں بھی کسی بھی جگہ نہ ملو۔“
 ”ہمیں آپ جانتے ہیں آپ یہ سب حاسن بھائی
 کے لیے کہہ رہے ہیں۔“
 ”ہاں میں جانتا ہوں میں یہ سب کس کے لیے کہہ رہا
 ہوں۔“ ہرگز بے خطر اس میں ڈوبا بہت مطمئن لہجہ تھا۔
 ”تو کیوں ہمیں میرے لیے ان سے اس درجہ گریز
 پائی کیسے ممکن ہے؟“
 ”کچھ ناممکن نہیں ہے یہاں دوشا۔“
 ”لیکن آپ سوچتے تو ہیں کہ ان کی باز آؤ آئی کی طرح وہ
 بھی میرے بڑے ہیں ایک گہرا رشتہ ہے ہم دونوں کے
 چچا بہن۔“
 ”کوئی گہرا رشتہ نہیں ہے تم دونوں کے چچا دوشا۔“ وہ
 ہاتھ اٹھا کر قطعیت و لامعتہ سے ٹوک گیا۔ اس کے نرم
 لہجے کے پیچھے گہری ہوتی ناگواری دوشا کو شدت سے
 محسوس ہوئی۔
 ”وہ..... آپ کے بھائی ہیں ہمیں۔“ رشتے کی
 نوعیت واضح کرتی ہوئی دوشا اس سے بے تحاشہ گہرا پی
 ہوئی تھی اسے ہمیں کے تیز اور ہمیں میں جتنا کر کے
 پھٹکانے دے رہے تھے۔
 ”ہاں۔“ دوشا میری بد قسمتی سے بھائی ہے میرا اور میں
 تم سے زیادہ بہتر طور پر اسے جانتا ہوں۔ اسی لیے کہہ رہا
 ہوں کہ تم اس سے کہیں بھی، کبھی بھی اس کیلئے میں نہیں ملا کرو
 گی۔“ اس کا انداز اہل اور حکیم تھا۔ دوشا کے لیے بہت
 سے محسوس تک بولنے کو کوئی لفظ نہ تھا۔
 ”وہ میرا بہت احترام کرتے ہیں عزت کی نگاہ سے
 دیکھتے ہیں مجھے بلکہ انہوں نے تو مجھی ایک نظر اٹھا کر مجھے

نگاہ بھر کے دیکھا تک نہیں بہت تقدس ہے ان کی نگاہوں
 ان کے دل میں میرے لیے کہیں۔“ ان حد تک کی نظروں
 سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی دوشا کچھ لمحوں بعد مرے
 مرے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔
 ”یہ رانگی تھینا ہی نے نہیں اذکر کرانی ہوگی۔“ ہمیں
 کالب و لہجہ طنز سے مستحسن تھا دوشا متاثرانہ نظروں سے
 دیکھتی سرنگی میں ملائی۔
 ”ہمیں انہوں نے خود سے متعلق ایسی کوئی ناگہانی مجھے
 سبھی بھی اذکر نہیں کرانی اور نہیں مجھ سے ایسا کچھ کہنے کی
 ضرورت بھی کیا ہے ہمیں؟ میں خود سے یہ سب کہہ رہی
 ہوں میں انہیں سب کچھ ہی ہوں اس احساس رکھتی ہوں مجھے
 ان کی ان نظروں میں اپنے لیے ایسا کوئی جذبہ بہت موزوں ہوتا
 دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں سے ساتھ ہوتے ہوئے مجھے بھی کبھی
 عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوا ہمیں۔“

”تو تم یہ کہنا جانتی ہو کہ تم میرے منع کرنے کے
 باوجود میری حق باتا یاد رکھتی کی پرواہ ہے کیا اس سے ہمیشہ
 ملتے رہتا جانتی ہو؟“ ہمیں کے مدہم بخندنے سے لہجہ میں
 اچانک سی بے پناہ ہی بھر گئی۔
 ”ہمیں؟“ وہ کب عادی کی۔ اس کا اس قدر دھڑلہ
 سننے کی۔ وہ تو ہمیشہ بہت نرم دوشا کے اعتماد جتنے ہوئے لہجے
 میں اس سے بہت ہل مدہم انداز میں بات کیا کرتا تھا۔
 ”آ..... آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں
 ہمیں؟“ ایک ساتھ ہی اس کی چپاں ہمیں کو اس کے تیزی
 سے ہمارا کے سر کی ہوتے ہوئے نازک لہجے میں متشعر
 ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ ”وہ مری سے بولا۔
 ”ہمیں میں تم پر شک نہیں کر رہا ہوں دوشا میں تمہیں
 اور خود کو کسی بھی بڑے نقصان سے بچانا چاہتا ہوں وہ دوشا
 وہ..... تمہیک..... تمہیک آدمی نہیں ہے۔ وہ دوشا..... آخر
 وہ اس کی بے بسی اس کی بیخبری کو کچھ کیوں نہیں رہا
 ہمیں کے انداز میں انہیں اور بھٹکلا بہت آئی۔

”آپ یقیناً ان کے بارے میں کسی مس اندر
 اسٹینڈنگ کا شکار ہو رہے ہیں ہمیں پتا ہے جب میں نے
 پر دگ کھڑی تھی۔
 ”میں نہیں جانتا ہم ایسے شخص سے ملو جس سے مجھے
 تمہارا بات تک کرنا پسند نہ ہو۔ کسی بھی جواز کے تحت کسی
 کی بھی یا پھر اس کی خواہش یا..... یا چاہے خود میری ہی
 اجازت کیوں نہ شامل ہو۔ تمہارے اس سے ملنے کے
 لیے پھر مجھ میں جانتا ہوں کہ تم اس سے مت ملا کرو۔
 کہیں بھی کسی بھی جگہ نہ ملو۔“
 ”ہمیں آپ جانتے ہیں آپ یہ سب حاسن بھائی
 کے لیے کہہ رہے ہیں۔“
 ”ہاں میں جانتا ہوں میں یہ سب کس کے لیے کہہ رہا
 ہوں۔“ ہرگز بے خطر اس میں ڈوبا بہت مطمئن لہجہ تھا۔
 ”تو کیوں ہمیں میرے لیے ان سے اس درجہ گریز
 پائی کیسے ممکن ہے؟“
 ”کچھ ناممکن نہیں ہے یہاں دوشا۔“
 ”لیکن آپ سوچتے تو ہیں کہ ان کی باز آؤ آئی کی طرح وہ
 بھی میرے بڑے ہیں ایک گہرا رشتہ ہے ہم دونوں کے
 چچا بہن۔“
 ”کوئی گہرا رشتہ نہیں ہے تم دونوں کے چچا دوشا۔“ وہ
 ہاتھ اٹھا کر قطعیت و لامعتہ سے ٹوک گیا۔ اس کے نرم
 لہجے کے پیچھے گہری ہوتی ناگواری دوشا کو شدت سے
 محسوس ہوئی۔
 ”وہ..... آپ کے بھائی ہیں ہمیں۔“ رشتے کی
 نوعیت واضح کرتی ہوئی دوشا اس سے بے تحاشہ گہرا پی
 ہوئی تھی اسے ہمیں کے تیز اور ہمیں میں جتنا کر کے
 پھٹکانے دے رہے تھے۔
 ”ہاں۔“ دوشا میری بد قسمتی سے بھائی ہے میرا اور میں
 تم سے زیادہ بہتر طور پر اسے جانتا ہوں۔ اسی لیے کہہ رہا
 ہوں کہ تم اس سے کہیں بھی، کبھی بھی اس کیلئے میں نہیں ملا کرو
 گی۔“ اس کا انداز اہل اور حکیم تھا۔ دوشا کے لیے بہت
 سے محسوس تک بولنے کو کوئی لفظ نہ تھا۔
 ”وہ میرا بہت احترام کرتے ہیں عزت کی نگاہ سے
 دیکھتے ہیں مجھے بلکہ انہوں نے تو مجھی ایک نظر اٹھا کر مجھے

ان سے اپنی برا بھلا بیان کی کر ان کی طرح آپ نے
 بھی مجھ سے بڑھتے ہوئے والی شام اپنی پسند کے لباس میں
 ڈریس اپ ہونے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے
 بالکل برائیاں بلکہ بہت فرخ زوئی سے انہوں نے مجھے
 آپ کی خواہش کا احترام کرنے کا سختی سے مشورہ دیا اور
 بولے کہ میں ہر جگہ ہر مقام پر زندگی کے ہر معاملے میں
 آپ کی پسند اور خواہش کا اہمیت اور اولیت دوں۔ آپ کی
 خوشی کا ہر دم بہت خیال رکھوں۔ آپ کے اور میرے بیچ
 قائم نکاح کے اس بندن کے لیے اس انتہا تک مخلص
 رہنے والے حاسن بھائی غلط آدمی کیسے ہو سکتے ہیں۔ وہ تو
 ایک بہت کیرنگ مہذب مخلص اور بے حد اچھے انسان
 ہیں نہیں اور آپ.....

”اوکے“ نکلتی ہی ہمیں ایک عجیب حیران انگیز
 انداز سے شانے اچکا تاکہ سر کو جھٹکتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا
 کر دوشا کی بات کاٹ گیا۔ اس کے چہرے کے پر
 تمکنت نفوس میں خاؤ آ گیا تھا۔
 ”پھر مجھے تم دونوں کے بیچ سے نکل جانا چاہیے۔ تو
 میرے خیال میں میں ایسا کرنا ہوں کہ میں انہیں ملنا
 دے دیتا ہوں اور تم پھر اس بہت کیرنگ مہذب مخلص
 اور بے حد اچھے انسان سے شادی کر لیتا۔“
 ”ہمیں؟“ دوشا پوری جان سے دہل کر کانپ اٹھی
 یا ایک تھوڑا جھپٹنے والی اس کی سرنگی میں یقین انہوں
 میں ایک گہرے خوف کے ساتھ اس کی دڑنے سے گھبرنے لگے
 تھے۔ ہمیں کامل کرتے ہی پھر وہاں نہ بھرا تھا وہ
 وہاں سے چاچا تھا اور جیسے دوشا کے بدن سے روح کو بھی
 ساتھ ہی نچنے لگا تھا۔



”وہ ناخبرانہ نہیں نے نہی آپ کی شان میں گستاخی
 کرنے کے بارے میں سبھی سوچ سکتی ہے لڑکیوں کے
 لیے جب اپنی شادی کا تذکرہ کرنا ایک گستاخی نا فرمانی یا
 گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ زمانہ اور تھا اب یہ زمانہ اور ہے۔
 زمانے کے ساتھ ساتھ وہ نوجوانوں کی ترجیحات میں بھی

بہت گہری تبدیلی آئی ہے وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم
 وقت کے ساتھ چلیں۔“ وہ پہلی بار ان سے بات کرتے
 ہوئے قدرے خائف تھا یہ شرابی منہ ان اور اس کا ہی
 کمال تھا کہ اس نے سر اس پر براے معاملے میں ناگہ
 اڑانے کی جرات و ہمت کی نہ کی طواریے اندر پیدا
 کر لی کی گہرے مشکل میں پر گیا تھا۔ ایک سخت لڑکی
 آزمائش میں گھر گیا تھا۔ بے حد اچھے ان گناہ
 خدشات کا سامنا تھا۔ اسے اس وقت ایک طرف غم کا
 احساس تھا تو دوسری طرف ان کی ناراضگی کا اندیشہ۔
 وہ آخر کچھ کہتے نہیں کیوں کیا وہ اس سے ناراض ہو
 گئے کہ جس کا یہی تہدید کے جواب میں نہیں مسلسل خاصوں
 دیکھ کر حاسن بھائی نے چپکی ہوئے تھی۔ وہ اخبار کے
 مطالعے میں مہمک تھے۔

”میرے خیال میں غم کا فیصلہ درست ہے۔ اب وہ
 محسن صاحب کوئی اتنے اچھے آدمی بھی نہیں ہیں۔ آپ کو
 بھی اس شخص کی فطرت یا سرگرمیوں سے ملل طور پر
 آگاہی تو ہے ہی پھر میں نہیں سمجھتا کہ آپ کو اس کے
 پرو پر بول کر خود کار کے رد کرنے پر کوئی ملال ہو جانا چاہیے اور
 حاسن نے مجھ کو وقت کے دوران میں کے بیڑ
 روم کے دروازے میں لہراتے ہوئے کے پیچھے سے
 بچوں کی طرح جھانک کر خود کو دیکھا جس کی آنکھوں میں
 اسے اپنے سے بے پناہ محسوسیت اور حوصلہ افزائی کی چمک
 دے تھی وہاں وہ سر کی مناسبت سے ایک بے پناہ
 گہری اور صوری سانس سینے سے خارج کی اور ہر اچکا کر
 ناکی کی ناٹ دھکیل کرتے ہوئے ایک بار پھر بدقت تمام
 لب کشائی کی بہت باندھ کر ان کی ست دیکھا۔

”اور پھر کوئی کی نہیں ہے خدا میں ڈین پر بھی لکھی
 لڑکی ہے۔ ڈینی برس پینڈل کر رہی ہے اور.....“
 ”اور ڈینی برس پینڈل کرنے والی اس پر بھی لکھی
 ڈین لڑکی کی عمر اس نومبر ۲۲ تاریخ ۲۲ برس کی ہو
 جائے گی۔“ ناچنے گانے والی اس کی ماں جسے میں نے
 میری محبت سے عزت دی، معاشرے میں ایک مقام دیا

انسان مایا کی ہر کوئی یہاں منظر اُسی جیسی سوچ یا اس جیسا جگر نہیں رکھتا کہ ایک ایسی عورت کے وجود سے اپنے گھر اپنے خاندان کی شان بٹانے کی جستجو کرے جسے دنیا سونگ کا پھر اچھا سمجھتی ہو اور اس میں ایک شگ سے کہ یہ زمانہ ایسی عورت کی بیٹی کے ساتھ بھی وہیادی سلوک کرتا ہے۔ کیا نہیں کرتا؟

ان کا خاموش رہنا ہی بہتر تھا اس کا احساس حاسن کو ان کے بولنے کے بعد ہوا وہ ان کی ہر بات پر سر جھکا کے چپ بٹھا رہا تھا۔

”کیا تم اپنا ہاں دے گے؟“ بلا وقتہ انہوں نے جیسے ایک دھماکا کیا تھا ہر حاسن کے چہرہ اطراف ایک گہرا غضب کا سناٹا چھایا تھا اور اس سناٹے میں فقط ایک آواز ترچے لرزے متطرب کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب اُبھر رہی تھی۔ جو حاسن کے کم صدمہ جانے والے دل کی منتشر ہوئی ہوتی ہر کونوں کی چمک رہی تھی۔

منظر اُسی سے اس کی سادگی کیلک سننے ان جانے خدشوں سے ابھتی آنکھوں کو حالف صدمہ میں ایک تک سکتے یا کہ اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو پر دے لی اوٹ سے دھیمی غماز کو دیکھ کر قدرے چونک گئے پھر دوبارہ حاسن کی طرف متوجہ ہوئے۔

”وہ جیسا بھی ہے خمار کے ساتھ شخص تھا اور مجھے صرف اسی پر پوزل کے رد کرنے پر ہی نہیں بلکہ ان تمام اس پر پوزل کو خمار کے رد کر دینے پر غصہ اور اختلاف ہے جو اس کے پر پوزل سے قبل خمار کے لیے آئے اور جنہیں اس نے رد کر دیا۔“ حاسن اچھی طرح جانتا تھا ان کا اشارہ حسن سلمہ کی پر پوزل سے پہلے آنے والے ان تمام پر پوزل کی طرف تھا جن کو خمار نے ڈاکڑ ویشیان کی وجہ سے ہر بار بھٹکت کر دیا تھا۔

”کھانا کھا کر جانا۔“ اسے گلو کی کیفیت میں وہاں سے اٹھتے دیکھ کر وہ بولے۔

”ہمیں سو ری اُٹھ آج مجھے جلدی جانا ہے۔ پھر کبھی سہی۔“ وہ نرمی سے معذرت کرتا ان سے مصافحہ کرنے

کے بعد ان دونوں سے نظر بجاتا اصرار سے باہر جانے والے رستوں کی سمت قدم بڑھاتا چلا گیا۔

گہری کافی قدر سے خشک رات کی سیاہی میں تھری ہوئی خانہ کی شان بٹانے کی جستجو کرے جسے دنیا سونگ حاصل اور تمام کر دے وہ بلند وسیع پھیلتے کے باقی تمام کھلی کھلی کونوں میں پھیلے سک ہوا ہے لہذا سیاہ دھنیری رنگ کے امتزاج والے جالی دار درمی پر دوڑے ہیں چمن کر آتی ہوئی اُچھوڑے چاند کی شدت چاندنی کے منتشر لرزاں ہالے میں بیڈ سے پشت دکا کر گئے گہرے پر پل کلر کے کارپٹ سے ڈھکے فرش پر ایک ٹانگ دراز کیے بیٹھے ہوئے بلند و کشادہ قامت جو جوان کے انداز نشست میں محض پر خمر دی نے ہی ولا چاری کا احساس جھکا چکر رہا تھا۔ اس کا ایک بازو عقب میں بیڈ کے کنارے پر پھیلا ہوا تھا اور دوسری ٹانگ کے کھڑے ہوئے کھٹے پر ہصری ہوئی کلائی ٹانگ کے مضبوط ہاتھ کی کشادہ پھٹی پٹھری لہی کشادہ شیم باز سیاہ آنکھوں میں چمکتی ٹی کی شفاف سطح پر ایک کرب آمیز پر اسراریت ملبورے سے لڑی تھی اور اس کی ٹی کی چمک کی لڑش کے اس پار ماسی کے پچھلے دل و ذہد دل کو لڑا منظر کی ایک نوافر سے اسرار نگ ہوئی چلی جا رہی تھی۔

یہ حلقی ہوئی شام کا ایک سا نوا لونا منظر تھا انہوں کی جوش اور صدمت سے کھلتی چمکتی آوازوں، کھٹکھٹاتی ہمتی سے بچے کراتے پر پوزل پارک کے ایک کدو کے منظر سے کئی بیچ پر دھیرے دھیرے دو آسانی ہو کر مہووار ہونے لگا ایک ۱۳ سالہ لڑکا ان کا چہرے پر چہاں چھو کر اداس کا تھکا تھکا مجروح احساس لیے اس کی بیچ پر قدرے سبے اور پارے ہوئے انداز میں غماہ بیٹھا تھا اور دیکھی ہی اداسی اس کے سامنے بھی اس چھوٹی سی لڑکی کے چہرے پر چمکی۔

”بیلر جاسن بھائی آپ نہ جاسیں“ آخر وہ ہمکن کو کیوں نہیں بیچ دیتے اس لیے نہ کہ آئی آپ کی اما

نہیں ہیں دو ہمکن کی اماں اور آپ کی اماں کی ڈتھہ ہو چکی ہے۔ پر انگل تو آپ دونوں کے پاپا ہیں۔“ اور اُنٹہ سالہ بچی اس کی پریشانی پر اس کی طرح ہی بہت خائف بہت سہمی ہوئی گی۔

”وہ ہمکن کوئیں بیچے کتنے دوشتا ہمکن ابھی بہت چھوٹا ہے ناں وہ وہاں ماما کے ہمارہ نہیں جائے گا۔“

”تو آئی ہو تو چھوٹے ہیں ہمکن سے صرف چار سال بڑے پھر کیا آپ ان کے بنا وہاں رہیں گے؟“

”ہاں نہیں۔“ وہ اس کی ذہانت سے چمکتی نظروں سے نظر چڑا کر سر جھکا کر جوتے کی ٹوہ سے گھاس کو لیر دینے لگا۔

”شاید ہاں۔“ لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ سنبل کر کچھ سوچ کر بولنا تو اس کے دھمکے بیچ میں بکلی کی لڑش کی۔

”پھر بھی آمت جائے آپ انکا کر دیں ان سے بولیں کہ وہ ہمکن کو بیچ دیں آخر وہ ہمکن کیوں نہیں بیچ دیتے ان کے پاس۔“ وہ اس کا بازو جھٹھوڑ کے اسے انکار پر آسانی پیل کے بولی تھی۔ حاسن خاموش رہا پھر کچھ سوچ کر وہ دو بار بولی پڑی۔

”آپ بیچے جاسیں گے تو میں بہت بڑو ہو جاؤں گی“ اسی پھر سے بڑو کو بلا میں کی مجھے بیڑو سے بڑھنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔“ اس کی معصوم آنکھوں میں نٹنے نٹنے اندیشہ چمک رہے تھے۔

”اچھا چھوٹا ایسا کرنا جس میں چلا جاؤں گا تو تم ہمکن سے دوستی کر لینا پھر تم کو بھی نہیں ہوگی اور وہ ہمارا دم و رک بھی مل کر ادا کرے گا اور اسکول میں بھی تو تمہاری بہت سی فریڈز ہیں۔“

”ہمکن وہ بہت خراب لڑکا ہے اسے اپنے دوستوں کے بغیر چھوٹا چھوٹا نہیں لگتا اور جب وہ مجھ پر ہتھارتا ہے۔“

”ہمکن ہمکن خراب لڑکا نہیں ہے وہ بہت اچھا لڑکا ہے دیکھنا تم اس سے دوستی کرو گی تو وہ تمہارا بہت خیال رکھے گا۔“

”اگر وہ اچھا لڑکا ہے تو پھر آپ کو روک کیوں نہیں لیتا آپ کی جگہ وہ کیوں نہیں ڈنمارک چلا جاتا؟“ وہ تیزی سے بولی تو حاسن ایک مرتبہ چرخ خاموش رہ گیا۔ اس کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور کہتا ہوتا بھی تو شاید وہ کوئی چپ رہ جاتا کہ اس کی نظریں کچھ فاصلے پر کھڑے دس سالہ لڑکے پر پڑی رہ گئی تھیں۔ وہ پتا نہیں کب اپنے دوستوں سے الگ ہو کر اُڑھ آ گیا تھا اور حاسن کے متوجہ ہونے پر وہ دوشتا کو بے حد عقلی نظروں سے گھورنے سے غصے سے پاؤں پٹھان کے قریب آچکا تھا۔ وہ ہمکن تھا۔۔۔ کیوں۔۔۔ کیوں میں ڈنمارک جا کر اٹکل آئی لوگ کے پاس کیوں رہنے لگوں میں ماما کا اپنا بیٹا ہو۔۔۔ گئے دلاؤ بھائی تو ماما کا بیٹا نہیں ہے۔ اس لیے بھائی کو ہی وہاں جانا پڑے گا اور تمہارا چلے جائے تو تم بھی بھائی کے ساتھ ہی ڈنمارک چلی جانا پھر تم کو بھی نہیں ہو گی اور تمہارا ہم و رک بھی مل کر ہو جائیگا کہ اسے کو ارم خود ہو گی خراب لڑکی میں خود سے دوستی کرنا نہیں چاہوں گا۔“

”تمہاری وجہ سے بے چارے حاسن بھائی کو ادھر سے جانا پڑ رہا ہے مذمت مصیبت اس دنیا میں آتے اور نہ ان کو یہاں سے جانا پڑتا۔“ دوشتا بہت بے خوبی سے ہمکن کے مقابل جاکر بولی تھی۔

”پاکل لڑکی اب اگر وہاں تو رہنے پر بکواس کی تو میں تمہیں جان سے مار ڈاؤں گا۔“ ہمکن زخموں اور انداز میں غمراہ۔

”اللہ کرے تم مہر جاؤ۔“ دوشتا کی کے انداز میں چلائی دوڑے ہی پل اس کا چہرہ کھوم گیا۔ پوری قوت سے اس کے کان پر پھڑپھڑا سیر کرتے ہی ہمکن وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس اچانک صورت حال نے پریشان حاسن کو مزید گڑباز کے رکھ ڈالا۔

”اللہ کرے تم مہر جاؤ۔“ دوشتا کی کے انداز میں چلائی

”دوشا“ حاسن بہت گھبرا کے دوشا کی طرف لپکا وہ گھاس گھٹنوں کے بل بیٹھی باتوں میں چہرہ چمپا کر بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرے ہوئے اسے خاموش کراتا ہوا حاسن بے بسی نظر سے ان کی بھی اسے اور بھی دور جاتے دوڑتے ہوئے دیکھ کر دیکھتا رہا تھا جو حاسن کے ساتھ مل کر جاتے جاتے کے بندھے کے تحت جھانکتے جھانکتے پلیٹ کر ایک نظر جیسے بھی ڈال لیتا تھا حاسن کا جی چاہا وہ جی چن کر سارے عالم کو بتا دے کہ وہ یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا۔ پروہ جانتا تھا کہ باوجود خوش اور شدید خواہش کے وہ ایسا بھی نہیں کر پائے گا۔

”کیا کیا ہو رہا ہے ساری دنیا میں بار بار بتی کا دکھ اٹھانے کے لیے سہاری کا درد سہنے کے لیے دنیا بھری بڑی بے نتیجہ سہارا دار لپے آ رہی ہیں“ ان میں سے کسی کو پائیں دو گنا ثواب ملے گا نہیں۔

”میں کوئی بحث نہیں چاہتا۔“ میں زبان دے چکا ہوں اپنے بھائی کو سنا تا نا زاد بھائی ہے وہ میرا کوئی غیر نہیں ہے بار بار میں دیکھ رہا ہوں۔

”میں عمر گئی کیا جو مجھ سے پوچھتا صلا مشورہ کیے بنا آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔“

”بھولیں بند کر دیت ہو جو کہ تمہارا چہرہ چمپا نہیں اس لیے تمہارا حق تو نہیں ہے حاسن پڑوہ میرا بیٹا ہے اور بس۔“

”ختم نہیں دیا ہے مگر سگی اولاد کی طرح پیارا ہے وہ مجھے۔“

”بس ختم کرو فضول بحث حاسن کا سامان تیار کر دو۔“

”پرسوں ہماری روانگی ہے پاکستان سے ڈنمارک کے لیے۔“

”مجھے کسی صورت منظور نہیں سنا آپ نے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے میں ہمیں کو انہیں دے دیتا ہوں۔“

”نہیں۔“ زینب نے دہل کر دل تمام لیا۔

”فنا کا ڈسک۔“ ظلم نہ کریں ہم پر حشام نے بھیجے ہم

تینوں پر میرے جیسے جیسے جی آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”ایسا ہے تو پھر کھوٹا بنے لالوں کو اپنے سینے سے لگا کر میں تمہارے اور اپنے بیٹے کا تمام اس بندھن کو توڑ دیتا ہوں اس سے انکم میرے دوسرے کا پاس تو رہ جائے گا ان کے سامنے وعدہ خلافی کی شرمندگی کی ذلت اٹھانے سے تو بچ جاؤں گا۔“

”فنا کا ڈسک حشام مجھے ایسی ذلت سے نہ ہمنما کر کریں میں تو جیتے جی مر جاؤں گی۔“ زینب خائف نظروں سے ان کو دیکھتی ہے کسی سے سبک نہیں حشام کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے ان کا فیصلہ اس تمام دور دونوں بچوں میں سے ایک کو ضرور ڈنمارک پہنچ کر دم لیتے یا زینب کو بچوں سمیت اپنی زندگی سے بے دخل و عقل کر دینے کا جھپٹیلے کی غفلت کی نشن کا یہی ایک حل سامنے آیا تھا۔ زینب لا چاری وہ کسی سے ایک ایک سبک رہی تھیں۔ پر حشام اپنے فیصلے سے ایک ایسا یا ایک سٹ کے لیے بھی بل بٹ کر چھ سوچے کو تیار نہ تھے۔ کرے کے دروازے میں سب سے کھڑے دونوں بچوں کے چہروں پر خوف وراس کی سائے چھانے ہوئے تھے۔ خوفزدہ سب سے ہوئے کھڑے ہمیں نے سراسیمہ ہر اسام ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے پہلو میں کھڑے حاسن کی سست چہرہ اٹھا کے دیکھا وہ کسی ساکت خالی خالی دیران آنکھوں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ ہمیں کی آنکھوں سے دوسرے ہوئے آنسو رز کے اس کے گال جھگو گئے حاسن نے چند بل ہوئی اسے خالی ساکت مجدد نظروں سے دیکھا اور پھر ہمیں کے تختی سے پیچھے ہوئے دھیرے دھیرے ہاتھ بڑھاتے ہمیں کے گالوں پر پھلتے سارے آنسوؤں کی نری سے بچھ ڈالا۔

”ایسا یا ہمیں کو یہاں سے کہیں مت بھیجے پلن۔“ حاسن کی آواز پر دونوں نے چونک کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے قریب آتے حاسن کو ہیرت سے دیکھا۔

”ہمیں وہاں مانا کے بنا رہیں پائے گا پاپا۔“ وہ کہہ

رہا تھا۔

”تو پھر تم وہاں جاؤ گے؟“ حشام کا انداز ہنوز بے لگ تھا حشام نے ایک لگا چہرہ پھیر کے دروازے سے کھڑے ہمیں کی بھرائی آنکھوں پر مجھانے چہرے کو دیکھا پھر ان دونوں کی سست ایک جگہ ان دیکھی ہی تڑپ تھی اس کی خاموش آنکھوں میں جس کی شدت کو اس وقت فقط وہی اپنے دل کے ہر گوشے میں بڑی بے رنگی سے پہنچے گاڑتے ہوئے محسوس کر لیا تھا اور چند لمحوں بعد وہ ہلکتا خورہ انداز میں سر جھکا گیا تھا۔

”ہاں میں وہاں جاؤں گا۔“

”حاسن۔“ زینب تڑپ کے ہمیں اور اسے باز دے پکڑ کے اپنی سمت کھمڈ ڈالا۔

”تم کو کیا ہوتے ہو یہ فیصلہ کرنے والے کس نے اختیار کیا ہے؟ ہمیں اسنے دہڑے ہوئے فیصلے کرنے کا۔“

زینب اسے چھوڑ دیتی تھیں حاسن کو بوئی سر جھکا کر بے حس و حرکت خاموش کھڑا رہا تھا۔ زینب ہر طرح کسکتی ہوئی اس سے اپنے ساتھ لپٹا کر اس کے چہرے اٹھانے کے لیے بولوں والے سر اور اس کے سر دانتے کو تھا شاید چوم رہی تھیں۔

”تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتے میں حاسن میں تمہیں کسی معاف نہیں کروں گی۔“ حاسن کا جی چاہا وہ ایک جھٹکنے سے خود کو ان کی آغوش کے مضبوط حلقے سے چھڑائے پروہ خود خیل ڈھاری کسی سکت ہمت و طاقت نہ پا کر ہند آنکھوں پر تختی سے پہنچی پکڑوں کے ساتھ ان کے شانے پر دھیرے دھیرے پھینچے ہوئے سر کے ساتھ بائیں ساکت کی ان کی آغوش میں رہا تھا۔

پھر حاسن اس گھر سے چلا گیا۔ یہاں سے جانے کا فیصلہ خود اس نے کیا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیوں ڈنمارک کا رہا کہ جیسے نہیں کھو کر رہ گیا۔ زینب حشام اور ہمیں کی بہت کوشش رہی کہ وہ ان سے کسی طرح سے رابطہ میں رہے پھر ان کی اپنی جیسے ہر رابطہ کے ذریعہ وہ بھی ان میں سے کسی کے روبرو ہو کر ایک اجڑی

ملاقات تک کے لیے انتظار کی راہوں میں امید کا کوئی ویب چلانے سے مسلسل اور مکمل طور پر گر بڑاں دے نیاز لفظی لائق رہا تھا۔ مہران اور فیضی کی کوششوں سے سال میں بھی ایک دو بار اس نے ان سے بات کی بھی تو بہت سرسری اور گرجوئی کے کسی بھی احساس سے بے خبر خالی عاری انداز میں اور اس کو اس شب کی وہ اذیت آج بھی اپنی روح اپنے دل اپنے احساس اپنے پر جندے اور ہر دھڑکن میں سر نہیڈا لپٹتی تھی محسوس ہو رہی تھی جو اسے اس کی طرف سے ایک بے حد بدگمانی لگتی ہوئی ایسی میل موصول ہونے کے بعد اپنی ذات میں کسی مامور کی مانند پھینچ کر محسوس ہوئی تھی۔

”دوشا کے رخسار پر پڑنے والے تمہارے ہاتھ کے اس بے رحم چمپاں میں تمہاری وہ بدگمانی وہ نفرت آج تک نہیں بھولا اور پھر تم دوشا کے لیے میری کوچہ میری محبت میری نکت میری اہمیت بھول گئے ہو ایسا ہے ہو سکتا ہے۔“ بے حد غیر متوقع بہت اچانک انتہائی سستی نیز الفاظ تھے جو کہیں کو پوری جان سے دہلا کر رکھ گئے تھے۔ دوشا اور اس کے نکاح کی خبر حشام نے مہران اور فیض تک بھی پہنچادی تھی حاسن کے سمسٹر زکی وجہ سے ان دونوں نے پاکستان آنے سے معذرت کر لی کی نکاح میں وہ لوگ سر تک نہ ہو سکیں گے۔ حاسن کو شاید خبر ہونے میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں اس کا ایک بدگمان تخفیر اور تو بھیر کے رکھ دینے والا روبرو ہمیں کے سامنے آیا تھا۔ جواس کی زندگی میں ایک کھلم کھلا گیا تھا۔ ہمیں کی پر اعتبار و سوسلوگانی کے مضبوط عداوت جیسے عداوت سے کھوٹکی ہوئی تھی۔ اسے لگتا سی کہ اس نے کوئی بھی کیا مذاق کیا ہوا اسے آنکھوں دم گڑتا کہ کہیں اسے الفاظ کو پڑھنے میں غلطی نہ ہو گئی ہو بہت جاہلانے کے حاسن سے کسی طور رابطہ کرے اور اس سے کہے کہ یہ اگر کھن ایک شرارت کی بذات تھا تو بہت تکلیف دہ ہے حد کرنا کہ تھا روح کو توڑ دینے والا اس کے تمام درجوں کو چھڑا دینے والا۔

”نہیں انتہائی باؤسی سے اذیت کی ایک لہر من کے کسی گوشے سے اٹھی اور روم روم میں شدید کرب کی موجیں پھیلاتی نکھیرتی چلی گئی۔

”کیا میں دوشا کے بغیر جی سکوں گا؟“
”نہیں۔“

”کیا مجھے دوشا کے بغیر جی لینا چاہیے؟“

”نہیں۔“ خود سے سوال کرتا خود ہی جواب دیتا وہ اس گھڑی جیسے اپنے حواسوں میں نہ تھا۔ ایک عجب خود فراموشی کی سی کیفیت میں وہ اب ریوالور کی نال کو اپنی پیشانی کے وسط میں جما چکا تھا۔ یقیناً دوشا کے بغیر اس کا اس دنیا میں جینا بے کار ہوگا۔“ سوچتے سوچتے وہ چوڑکا ”یہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں، کسی کی جدائی کے ڈر سے حرام موت کو اپنانا چاہتا ہوں اس سے تو بہتر ہے کہ میں جائز زندگی کی آغوش میں گھٹ گھٹ کر جیتی سکتی زندگی کو قبول کر لوں پھر میں اسے کسی اور کا ہوتے کیسے دیکھ پاؤں گا میری دوشا کسی اور کی ہو جائے اس سے بڑی قیامت اور کیا ہوگی؟ نہیں دوشا میری ہے اور وہ جب تک میری ہے کوئی اسے مجھ سے کیسے چھین سکتا ہے کوئی نہیں کوئی نہیں چھین سکتا۔ دوشا کو مجھ سے کیا وہ؟“

”نہیں میں دوشا کو مجھ سے چھین لینے والے کی زندگی اس سے چھین لوں گا“ میں اسے ایسی موت دوں گا کہ خود موت بھی اس کی زندگی کے ایسے بھیا تک انجام پر رد پڑے گی۔“ بس ایک پل لگا تھا اس کی ذہنی حالت بدلنے میں ٹریگر پر مضبوطی سے ایک دو بجے پر دباؤ ڈالتے مضبوط انگلیوں کی دوؤں کشادہ پوروں کا دباؤ یکفخت نرم پڑ گیا تھا۔

”ہاں مر جانا چاہیے پر مجھے نہیں تمہیں۔“ اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے پھر اس کے کمرے تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے اس کا انداز انتہائی جارحانہ تھا۔ اس کے کمرے کے دروازے کو نیم واپا کر وہ ایک لمحے کو رکا پھر اگلے ہی پل وہ ریوالور والے ہاتھ کو عقب میں پشت کے پیچھے دھرتے ہوئے بڑھا اور دل میں وہ بے آتش فشاں

مگر معلوم نہیں وہ کیسا خوف تھا کہ جس نے اس سے کسی بھی قسم کی پیش قدمی کی ساری کی ساری ہمت چھین کر اسے تہی دامن کر ڈالا تھا پتا نہیں کسی خدشے کے سچ ثابت ہونے کے ڈر سے اس نے حاسن کی ذات کی پرچھائیوں تک کو اپنے ذہن سے کھرچ ڈالا وہ بھول گیا کہ اس کا حاسن سے کوئی رشتہ ہے۔ وہ بھول گیا کہ حاسن نامی کسی انسان کا وجود دنیا میں ہے۔ پر یہ حقیقت تھی وہ اس کی یاد کو تو جھٹلا سکتا تھا۔ مگر اسے ہرگز بھلا نہ سکتا تھا۔ بہت بار کہ اس نے اس روز کے بعد سے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ اگر کوئی مذاق وہم تھا بھی تو وہ ایسے کسی بھی مذاق وہم خدشے یا خوف کو تصدیق کے اجالے تلے لے جانے کا خود میں حوصلہ نہ پاتا تھا۔ اسے یاد کی تو فقط دوشا۔

اسے معلوم تھا کہ وہ اور دوشا ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں وہ جانتا تھا تو بس اتنا کہ وہ دوشا سے بچنے کے اگر جی بھی گیا تو وہ کبھی خوش نہیں رہ پائے گا اس لیے کہ وہ دوشا سے بچنے کے کبھی خوش رہنا نہیں چاہے گا۔“

اور آج یہ تمام تھا کہ وہ اپنے کمرے میں پر سکون بیٹھی نیند سو رہا تھا اور وہ لوڈ ریوالور کی نال کو تختی سے اپنے سینے کے وسط میں جمائے نڈھال و بے دم کر دینے والے تباہ کن احساسات کی یلغار میں گھرا کھڑا تھا۔ دوؤں ہاتھوں کے انگلیوں کی کشادہ پوروں کو ایک دو بجے پر کرتے ہوئے ٹریگر پر دھیرے دھیرے دباؤ ڈالتے ہوئے سینے میں اس کا دل تیز ہوا سے لرزتے کسی پتے کی طرح تھر تھرا رہا تھا۔

”کیا وہ دوشا کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے؟ ہاں وہ اس میں کامیاب ہو چکا ہے۔ میری غیر موجودگی کے لحاظ سے ہی کسی ایک چور لمبے میں کتنی آسانی سے اور معلوم نہیں کب؟ کیا مجھے ماما کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔“

کیا وہ میرا ساتھ دیں گی میرا سہارا بنیں گی اور دوشا کیا میری بات کا یقین کر لے گی؟“

کے ایک ایک آمار پر پاؤں دھرتا وہ بے حد خاموشی سے کمرے کے تہ و دروازے کوئی سے پھیل کر بنا کوئی آہٹ پیدا کرے کسی میں داخل ہو گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھایا اور ریوادر سے بیڈ پر نرم کیے پر سر دگے سے خبر سوتے ہوئے شخص کے تین دل کے مقام کا نشان لیا۔ کب سو جا تھا۔ اس نے کر دئے زمین پر اس شخص کا وجود جس کی ذات کے لیے اس حد تک ضرر کا باعث بھی ہو سکتا ہے کہ جس کی وجہ سے کوئی راہ نہ پا کر آج اس کی بے بسی صبر اور شرافت نجات اور کاسالی کے حصول کی آس لیے پالا خراسان ایک انسانیت موزن فیصلے کے سنگدو تار یک بوسیدہ ٹھنڈے زہد تھکانے میں اتار کر اس کی ریوادر خال دل و دماغ کے درپچوں پر مشدد دانہ بیٹے دلوام کی تکلیف دہ دستک کی گونج نے اس کے گرد بھجڑ بھجڑ پر احساس کو کھٹکھٹاں پٹکان کر کے کیدم سے آگے لڑا تھا اور وہ اپنے روح و بدن پر چھائی درد سے بھل کر اصل انگشت خدشات کی گرد سے آلودہ مایوی کی آنکھوں سے چپکے آنسوؤں سے بھیگتے خانے میں نیکھت خوفزہ فریادوں کی عالم میں پھریا یا ساسکتا تھا افسانے زندگی میں کسی کوئی ایسا تجربہ حاصل نہ ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ روادار کے فاصلے سے چلائی جانے والی کوئی ایک انسانی وجود کے آدے پار ہو کر اس کے پچھے اڑتی ہے۔ پولیٹھوں میں کہ انسان کو دوسرا سانس لینا بھی نصیب نہیں ہو سکتا اور سائنٹسٹ گھر ریوادر سے فائز نہ ہونے کے برابر آواز گہری ٹینڈوس ہوؤں کو بیدار نہیں کر سکتی اور جو جاگ رہے ہوں کہ انہیں انہی سانسوں کو کھینچنے پر بھی لے لے لے رہا ہوں پر محض دھوکے کا کمان گزرنے گا۔ اس کے پاس وقت بھی تھا اور موقع بھی پھر وہ ریوادر کو بیڈ پر سوتے ہوئے وجود پر تانے کن سوچوں میں الجھا کر انہیں میں گھرا اکٹرا تھا۔ فیکر پر بھی اس کی آہنی کے دھیرے دھیرے بڑھتے دباؤ کا ٹکڑا چنا خوراس کے لیے بھی نہ سمجھ میں آنے والے انہیں کب باعث تھا کون تھا اسے یہاں دیکھنے والا؟ کون جان سکتا تھا کہ ریوادر تھا تھے

والے گولی چلانے والے ہاتھ کس کے تھے۔
 ”کیا نہیں نہیں معلوم تو کیا ہوں دیکھنے والا کون ہے اور کون جان سکتا ہے کہ ریوادر تھا تھے والے گولی چلانے والے ہاتھ کس کے تھے ہاں دیکھ رہا ہے وہ نے کوئی آنکھ نہیں دیکھ پائی اور جان سکتا ہے وہ جس سے کچھ بھی اوجھل نہیں رہ سکتا۔“ پاس ہی کہیں سے ایک آواز ابھر کے اس کے دل میں اتاری تو جیسے بدن میں اس کی روح اور سینے میں اس کا دل ایک خوف کی دہشت سے کانپ اٹھا۔
 اسے اپنے انسان ہونے پر شرم آئی۔
 ”تمہیں سوچنا چاہیے انسان آخراً کہاں تک خود کو دھوکہ دے سکتا ہے اپنے جیسے کچھ کے لیے اور کے دامن میں ڈال کر اسے اس کی خوشیاں بھلا کوئی کیسے بچھن سکتا ہے چاہے کوئی کچھ کر لے اپنی زندگی کو ختم کر کے ہزار زندگیاں بنالے یا ہزار زندگیوں کو موت کے گھاٹ اتار کے اپنی حیات کو محفوظ کر لے پھر بھی وہ اپنے مقدر سے بچت نہیں سکتا۔“ بھی بھی نہیں۔“ اس کا تھکا ہوا غمیر بہت دیر سے جانے کہاں کھوئی ہوئی اس کی شرافت کا ہاتھ تھا سے ایک بار پھر اس کے راستے میں آجی ریوادر نے چلا آیا تھا اور ایک مرتبہ پھر اس کے تھیراں کی شرافت نے اس سے اس بھیا کر فیصلے کا دامن چھڑا کر اس کے خطرناک عزم کو ایک جھٹکے میں مساکر ڈالا تھا۔ اس نے اس کے سوتے ہوئے چہرے پر پھیلے کمرے سکون کو اس کے زندگی سے ہٹا دیا اور اپنے وہاں تے وطنیت کی سرخی میں رہے ایک ایک ہر کمینٹ نقش کی بلا میں لپٹی تروتازگی سے گزری زندگی کو بے حد ریشک آئیز حسرت سے ٹکا تھا اور پھر ریوادر والا ہاتھ آہستہ سے پیلو میں گراتے ہوئے وہ جس خاموشی سے آیتا تھا خاموشی سے پلٹ گیا اور اس کے پلٹنے ہی بیڈ پر پہنچا پر سکون گہری ٹینڈوس سوتے ہوئے شخص نے بہت خاموشی و آہستہ سے کھینکھینکھول دی۔ اس کی پہلی نظر نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے شخص کے دامن ہاتھ میں موجود ریوادر کو بہت کرب آئیز حیرت سے دیکھا تھا اور پھر اس

کی دوسری نگاہ کمرے سے نکلتے اس بلند قامت شخص کی کشادہ شانوں والی مضبوط پشت پر پڑھتے ہوئے بہت تیزی سے ڈبڈبائی کی سائیکل کی آہستہ کی آہستہ کی تیزی کی گمراہی میں اس کے من کے کسی گمراہ گوشے سے بھی اور اس کی بے نیستی سے ابھی حیران کھلی جلتی آنکھوں سے نکلتے ہوئے ٹھیکن پانی کے قطرے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے میں بندھ بونے لگے۔ آپ کی ذات کو کوئی چوٹ لگے تو کچھ میرا نے خدشوں کی آفت کا احساس بھی نہ کرے سر سے جاگ اٹھتا ہے۔ بالکل ویسے ہی اس وقت وہ بھی ایک دھڑکی آہستہ کی آہستہ تھا۔
 وہ لڑکی بہت شدت سے ٹھیکن کو یاد آتی تھی جسے اس نے اپنی ٹھکانا آقا دھکارا تھا جسے کبھی اس کی راہوں پر چلنے ہوئے منزل تک پہنچنے سے قبل ہی اس کی تقدیر نے اسے ٹھکانا آقا دھکارا تھا جسے اس نے مٹا اور ڈالا تھا۔ جانشن صبح پانے وہ لڑکی جانشن صبح سے آج احیا ایک بہت ٹوٹ کر یاد آتی اور وہ جانشن چلتی روح سمجھنے لگے تھا قدموں سے اس تک لے جانے والی راہوں پر چل رہا تھا جسے بسے ہواؤں کی ٹھنکی اور رات کی تاریکی کی پروا کیے بنا۔
 ”تم چاہتی تھیں ناں کہ میں تمہیں اپنا دل میری محبت کے دھبے سے میں تمہیں خوشیوں مسرتوں اسٹیکوں آرزوؤں کی تمناؤں سے وابستہ رکھنے والی تمہاری زندگی کی راہ کو کچا دلوں روشن کر دوں تو آگیا ہوں میں تمہارے پاس تمہیں اپنانے کے لیے تمہاری محبت کو سمجھنے میں مجھے کچھ دیر ہوئی آئی انہم سوئے اسے جذباتی پن میں تمہاری محبت کو بھی میں ایک جذباتی فیصلہ سمجھ بیٹھا تھا میں نے تمہیں نادان اور غلط سمجھا پر اب میں..... جانشن میں چاہتا ہوں کہ کل شام سے پہلے پہلے ہم..... میں..... اور کمرے میری کمر میں اور میں تم دونوں کی کورٹ میری کوٹ سے چھپا کر اسے چاہوں گا کہ نہ زانے سے اور نہ..... دوشتا سے میں چاہتا ہوں کہ سب کو ہمارے درمیان قائم ہونے والے بندھن

کا علم ہو اور دشا کو بھی علم ہو اور وہ خود..... وہ خود حالت کے ذریعے سمجھ سے طغ کا مطالبہ۔
 ”ہاں بہت کمرے میری نہیں کر سکتے نیکل شام سے پہلے پہلے اور نیکل شام کے بعد بھی..... کیونکہ شمعوں سے میری کھلی ہو چکی ہے جس شام تم نے مجھ سے انکار کیا اس میں کچھ میری روحیں شمعوں مجھے پر دلوں کر چکے تھے۔ سوری میں تم کچھ نہیں بلکہ بہت زیادہ لیت ہو گئے۔“ اپنے تئیں اس کی زندگی کی سب سے بڑی اور اہم خوش خبری سناتے ہوئے ٹھیکن نے نگاہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں مسرت کے رنگوں کی اہلیں روشنیوں کی چکا چوندیاں کس کے چہرے پر محبت کی لالی کی قوس و قزح کے سایوں میں اس کی حاجت کے سمت دے خود ہونے کا پرفوں منظر دیکھنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی پر کچھ ہی لمحوں بعد جانشن کی مطمئن آواز سرشاراب و دلچسپی مدھر ٹھنک پر وہ بے اختیار اٹھا کراس دیکھنے لگا۔ ٹھیکن نے آج کا کھانہ نے دہی کچا کھا ہے جو اس نے سنا اسے ٹھیکن نے آج کا کھانہ اس کے سامنے پیش ہوئی ہے ظاہر کیا ناگزیر اس کی اس قدر مضبوط ہو سکتی ہے جو کسی اس کی چاہت میں پاگل تھی اور آج جانشن اسے بالکل اپنی نظر سے نکلی ہوئی کسی قدر اطمینان سے ٹھیکن ہی جیسے کوئی نقل نہ ہو جیسے کوئی خواہش نہ ہو۔
 ”پھر جانشن..... میں.....؟“ وہ پتا نہیں کیا کہتے کہتے اب کچھ ایک ایک گہری تکلیف دہ ٹھیکن نے اسے چل میں مغلط کر ڈالا۔
 ”ہاں ابھی ابھی دوست ہیں ٹھیکن مجھے فکس ہے کہ میں نے تمہیں بہت ستایا تنگ کیا پر ٹھیکن میں انسان ہیں ناں نہیں جانتے کہ ہمارے لیے ہمارے پروردگار نے کیا کچھ سوچ رکھا ہے اپنی ہی دامن میں جس اپنی من میں لپٹی چلا کر تھے میں ہاں آخرو ہوا ہے جس میں پان ہمارے نے چاہی قسمت میں لکھ دیا ہوتا ہے۔“ جانشن ٹیکس بدلی ہوئی لڑکی کے روپ میں نہایت برابری اور

عامری سے بول رہی تھی، ہمیں کو بکھت اپنے بدن کا ریشہ ریشہ ہوتا ہو، ہواؤ نہ جانے کس ان دیکھے سلگتے مٹاتے را کہ بناتے ہوئے کرب کی شدت سے تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔

”ہمیں روکو تو ہمیں..... ہمیں“ وہ بکھاری ہوئی اس کے پیچھے دو دروازے تک گئی تھی کہ ہمیں اس کی پکار پر نہ غصہ اٹھا۔ گاڑی اشارت ہونے کی آواز سے منہ پر ہیلارہونے کا عشرت تھی وہ گھر سے پیدل چل پڑا تھا اور راستے کی طوالت کے خیال سے وہ بھی پراس طرف آیا تھا لیکن اب سخت اپوری و ایک ان دیکھے اشتعال کی کیفیت میں کھرے اسے پیدل چلے ہوئے راستے کی طوالت کا خیال تھا۔ نہ دروسم کی پڑاؤں میں اتر جانے والی ٹکی کی شدت کا احساس نہ دھتک سادات کی کہری منہ مبارکی میں تاروں کی حدنگاہ تک پہنچنے مل کسا ہی ہوئی سیاہ لمبی سرک کے بیچ تھکے ہارے شکستہ خوردہ نڈھال انداز میں تھکے تھکے تھکے قدموں سے چٹا وہ پتا نہیں کتنی دور نکل آیا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی سنان کی پر شور چال نے اس کے قدموں سے پیدا ہونے والی اور سنان سرک پر چھائی ہو چھل خاموشی میں ایک دھمک سے جاگ اٹھنے والی آہوں کی گونج کو بہت تیزی سے نکل لیا تھا۔ گاڑی دھیرے دھیرے روکتی ہوئی اس سے تقریباً گاڑی ٹوکے کا صلے پر کھڑی تھی اور ڈرائیونگ سیٹ پر مسلسل ہان پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر تھیں جیس سوٹ میں ملبوس سبھے ہوئے طیلے کا مالک خوش حال و جوان خامسے جھنجھلائے ہوئے انداز میں گاڑی سے اتر کے اس کی طرف بڑھا۔

”بھائی صاحب کیا سیالہ سے آپ کے ساتھ یہ سرک سے کوئی تقریبی پارک یا آپ کے گھر کا لان نہیں ہے ہر کوئی میرے جیسی عطا ڈرائیونگ کا غادی نہیں ہوتا ہے رات کے وقت ڈیرہ ہے یوں خود فراموشی و لا رہا وہی سے سنان سرک پر چھل قدی کا شوق یا ہوا خوردی کا شفقہ آپ کی جان بھی لے سکتا ہے۔“

”میں موت سے نہیں ڈرتا یہ دیکھو میرے پاس رہا دوسرے لوڈ ڈرائیونگ میں پوری چھ گولیاں ہیں کیا تم اس رہا دوسرے ایک بھی گولی میرے سینے سے اتر سکتے ہو۔ میں تاقیات تمہارا یہ احسان یاد رکھوں گا۔“ اس کا سیالہ لب و لہجہ انتہائی سنجیدہ ہے حد درجہ۔ مقابل کھڑے ہو وارڈ نے اسے جیکٹ کی جیب سے رہا دوسرے برآمد کرتے ہر بہت گھبرا کے دو قدم چھپے بٹھے ہوئے ہفتوں کی طرح منہ کو لے منگوک انداز میں اس کی سمت گھبرا نظر دے دیکھا تھا۔

”ارے جی یہ آپ کیا بولیں آدھی رات کو اس سنان سرک پر رہا دوسرے سے اسے اچھے جا کھرے ہوئے بو ارے بھڑاڑ میں چھوٹا اسے کیا خون خرابی پاگل ہے مجھے تو اس کی دماغی حالت ٹھک گئی آپ آئیے جلدی سے گاڑی چلائے پہلے یہ ہمیں گھر پہنچنے میں بہت دیر ہوگئی ہے چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ اور یہ خطرناک راستہ۔“ گاڑی میں تجسس و قدرے متشکر بھی خاموشی نے تو جوان کی توجہ اپنی اور گاڑی میں بیٹھے خند کے اثر سے تقریباً ہٹ گئے ہوئے سینہ اور پیکی کی سمت پھٹا۔

”اگر میرے ساتھ اس وقت میرے پوسی سینے نہ ہوتے تو میں ابھی طرح ہمیں تمہاری اس شوخی کا مزہ چکھا دیتا۔ اس کی اس حرکت کو کسی بڑے ہوئے امیر زادے کی شواری نہیں تھا۔ چان کر وہ تو جوان بڑے متشعل تیور سے بولتا ہے کیونکہ تو نظر دوسرے سے تھوڑے سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور اس تمام تانے کو ہمیں کے عتب میں ہے حد درجہ اپنی پریشانی و بالکل خاموشی سے کتنی ہوئی کچھ ہی دور کھڑی یا جائتے گا گاڑی اشارت ہونے کا انتظار کیا اور گاڑی زدن سے آگے نہ گزرجانے کے بعد گاڑی کے پیچھے اڑتے چوہیں کے مرغولے کے پاس ٹکست خوردگی سے عالم میں ساکت کھڑے ہمیں کی جانب لگی۔

”ہمیں“ اس نے پکارا کہ ہمیں اسی کیفیت میں خلاء میں گھورتا ساکت کھڑا تھا۔

”ہمیں چلو“ جا کٹھ اب اس کا بازو تھا۔ کہہ رہی تھی۔ ہمیں نے چہرہ دھیرے سے پھیر کے اپنے لیے پریشان دے دے جھٹک کر ہی اس لڑکی کی سمت خالی خالی نظروں دیکھا وہ یقیناً اس کے گھر سے نکلتی یہ ایک فکر کے عالم میں ہمیں کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی۔ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی آج رات ہمیں کچھ تمہاری جاؤ سویرے کھر چلے جانا چاہیے، کم ان ہمیں چلو میرے ساتھ“ جا کٹھ نے ہمیں کے ہاتھ سے رہا دوسرے کر ہمیں کی جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا اور اب بولی اس کا بازو زنی سے تھا۔ وہ ہمیں کو اپنے ساتھ لے جانے پر مصر تھی ہمیں نے ایک تھکی تھکی دھتک زناہ دہ لے کر کی سمت جانے والے راستے کی جانب دیکھا پھر وہ خاموشی سے پلٹ کر جا کٹھ کے ساتھ اس کے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ اس کے ساتھ قدم اٹھائی جا کٹھ کے دل میں کی ان جانے دوسرے سوار ہارے تھے وہ چلد از چلد جانا جاتی تھی کسی آخرا یا کیا ہوا تھا جس نے زنی سے پھر پور ہمیں کی با اعتماد ذات کو ایک زندہ لاش بنا ڈالا تھا۔



”تو آپ ہیں مسٹر جان علی شام ہمیں کے بڑے بھائی سو تیلے بھائی“ آخری دو حرف کو اس کے بے حد چپا چکر کش فرشتہ انداز میں کہنے پر مقابل کے پرسکون چہرے پر ایک ہلکا سا تھپہ ہوا تھا۔ جا کٹھ نے ایک نظر سر ہا ڈالتے ہوئے اسے سوجھتی نظروں سے دیکھا وہ جھمبے جھمبے بلند سر پہ کھٹکی ہوئی سرخی مال رنگت کا مالک ایک پریش و خوش روح تھا قاتمب نقوش والے چٹمکتے چہرے پر اس کی اشادہ انکھیں نمایاں تھیں اس کے بال ہمیں کے سیاہ لگی بالوں کے برعکس سیاہی میں لگیے براؤن اور ہیرے دار تھے وہ ہمیں کی طرح کلن شو تھا۔

”آپ کی تعریف“ لیکن آپ پہلے تعریف تو رکھیے

”چلیں۔“ وہ دم انداز میں رسا زنی سے مسکرا اور انفس کے کارنر میں موجود سونے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بیٹھنے کے بجائے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی مزید بولنے سے روک گئی۔

”بہت ہو چکا حاسن علی شام صاحب بہت ہو چکا اب بس بیٹھے کیونکہ آپ کی ضد نے آپ کی زیادتی نے ہمیں پیسے مضبوط انسان کو توڑ پھڑو کر اسے اس کی زندگی سے اس قدر رنج کر ڈالا ہے کہ دنیا کی نظروں میں تو وہ جیتا جاگتا سانس لیتا انسان ہے مگر اپنے لیے وہ کل رات مر چکا ہے کیا کھلیا ہے آپ نے اسے کہہ ایک بے غیرت و بے حیت شوہر ایک بے گھر بے حس انسان ہے ہمیں حاسن صاحب غلط سوچا آپ نے وہ شریف و محل مزان بندہ ضرور ہے نہ غیرت سے عاری ہے غیرت آدمی نہیں اور وہ تو خود غرض نہیں ہمیں سے بھی تو..... جی تو اس نے تمہارا ڈال دیے ہیں وہ بہت ٹھک چکا ہے وہ بہت ٹوٹ چکا ہے۔ بار چکا ہے دوشا اگر آپ کے بچپن کی محبت سے تو اس کے خیال میں آپ کو آپ کو کھٹکت سے دوچار کرنے کے بجائے اپنی ہاتھ سلیم کر کتنی چاہیے اسی واسطے وہ دوشا سے دیشوار ہونے کا فیصلہ کر چکا ہے اور اس سب کے ذمہ وار آپ ہیں اگر آپ سالوں تک دوشا کی صورت کو اپنے دل میں سجا کر چھو چپ اس کی پوچا پریش میں معروف رہنے کی حافیت کرتے رہے تو اس میں صورت تو دوشا کا ہے جو آپ کی اس کوئی محبت سے بے خبر ہے اور نہ ہمیں جس کا اس میں کوئی دوش ہے اس نے سوچا کچھ کر دوشا سے محبت نہیں کی اور نہ ہی اسے دوشا سے متعلق آپ کے جذبات کا کوئی علم تھا اور نہ شاید وہ دوشا سے محبت کی راہوں یا اس کی خواہش کے سفر کے پہلے موز پر ہی اپنے صرفا کو دور کر لینا چاہتے تھے جاتا پلٹ آتا۔“ وہ ہمیں صرفا اس کی سبے سناہے آتی کی اور کھٹکت کو پلٹ گئی تھی اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا کھڑا اور دوازے سے اس کی آہٹیں لڑکی سے پہلو بجا کر اندر آئی ہوئی دوشا کو کہتے ہوئے اس لڑکی کو پکارا تاں بھول کر بیگنٹ ساکت رہ گیا تھا۔ دوشا

کی اچانک آمد پر چیخ کر اب تک خاموش تماشا ہی بنی بیٹھی
 نماز بھی پریشانی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”دشنا! حان کے لیوں پر ایک بے آواز جنبش بکھر
 گئی۔ دوشا چھوٹے چھوٹے تھکے تھکے قدموں سے پلٹ کر
 اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اس نے اسے ہونٹوں کو سختی
 سے پیچھ کر رکھا تھا۔ اس کے چہرے کے نازک نقوش میں
 بے پناہ دھچکی تھی اور آنکھوں میں برقی ہوئی نمی کی چمک
 خاموش آواز سے اسے باوجود اس سے نظر نہ چما کا تھا۔
 ”تو میری بہن کے دل میں مجھ سے بے وفائی
 کا جذبہ ابھر رہا ہے کوئی بے وفائی بدگمانی کوئی دشمن کوئی
 عداوت مجھ کو مجھ سے نفرت کرنے پر اس کا سننے میں بھی
 کامیاب ہو جائے تو بھی مجھے بہن کے سنگ زندگی
 گزارنے میں کوئی شک یا چھٹک کوئی اعتراض محسوس نہ ہوگا۔
 بہن کی کمر تبت مجھ سے چھن جائے ان کی محبت مجھ سے
 روٹھ جائے بھی تا عمر میرا نصیب وہ ہی رہیں گے
 میرے لیے ان کا چل کر بھرا دیا ایک لمحے کی جھلک بھی
 کافی ہے۔ ان کا نام ہی کافی ہے میرے لیے یہی احساس
 بہت ہے کہ وہ میری زندگی میں موجود ہیں۔ چاہے میں
 ان کی حیات میں موجود دشاں رہوں یا نہ رہوں یا چاہے
 کوئی مجھے اس سے زیادہ چاہے والا بھی مل سکتا ہو گی
 کبھی بھی نہیں ان کی زندگی سے دور کرتا نہیں چاہوں گی
 کبھی کسی کے لیے کسی نہیں چاہے وہ کوئی بھی ہو اور اگر
 زندگی میں مجھے بھی یہ خبر ہو کہ کوئی مجھے بہن سے بھی زیادہ
 چاہنے کا دعویٰ دار ہے تو معلوم ہے میں اس سے کیا ہوں
 گی؟“ وہ ہل بھر کے لیے خاموش ہوئی لکھ کر اس نے
 حان کی آنکھوں میں پھیلنے سناٹوں کو ایک مسخرانہ نگاہ
 سے دیکھا اور پھر اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک طنزیہ
 مسکراہٹ پھیلنے لگی۔
 ”آئی ہیٹ یو چاہے وہ کوئی بھی ہو چاہے وہ آپ ہی
 کیوں نہ ہوں۔“
 ”حان“ دوشا چلی گئی تھی جب اسے کسی بات کی
 مانند پھر اسے کھڑے دیکھ کر خمار نے ملاحت سے پکار کر

اس کی ذات کے گرد کھیلے سکوت کو منتشر کر ڈالا وہ ایک تھکی
 تھکی خالی نگاہ کے منتظر چہرے پر ڈال کر ابھٹتی تھی
 اپنی چیخ پر براہجان ہو گیا۔ اس کی سر جھکا کر دونوں
 آنکھوں کی مضبوط انگلیوں کو ایک دوسرے میں اسیر کرنے
 کی بے اختیار حرکت بائیں لاشوری بھی خمار چند لمحے
 خاموشی سے اسے دامن آگوشے کی پور کو خاطر اسی انداز
 میں بائیں ہتھیلی پر ملے ہوئے دھچکی رہی پتلی بھی اور
 اسے اس وقت سر جھکا کر نظریں چرائے پتلی اس شخص پر
 بے اختیار زبردستی آ رہا تھا۔
 ”حان! میننگ کا وقت ہو گیا ہے۔ آئی تھک میں
 چلتی ہوں۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی شرکت بھی
 کافی ہے۔“ وہ تھیل پر اس کے سامنے پڑی فائل اٹھاتے
 ہوئے بولی حان نے اسے ایک دم حتم سرکراہٹ کے
 ساتھ سر اٹات میں ہلاتے ہوئے بے حد ممنون نظروں
 سے دیکھا تھا۔
 ”او کے تم آج ریٹ کرو۔“ وہ بھی نرمی سے مسکراتی
 ہوئی آنس سے نکل گئی۔ حان تبدیل سے اس کا مشکور
 تھا۔ اسے واقعی اس وقت تھانی کی ضرورت تھی۔ وہ اب
 دونوں باتوں کی انکشاف ایک دوسرے میں بیہوش سے
 باتوں کو سامنے ٹھیک کی شفاف کپ پر رسکے پوئی سر
 جھکا کر بیٹھا اسنے بائیں ہاتھ کی گلابی میں بندھی بے حد
 خوب صورت بیس تینت رست داغ کو دیکھ رہا تھا۔ یہ
 رست داغ دوشا نے برقعہ بے والی شام اسے اس کے
 برقعہ ڈے گفٹ کے طور پر دی تھی۔
 ☆ ☆ ☆
 ”ہیکسکوڑی پلیز۔“ وہ گاڑی اشارت کر رہی تھی۔
 جب کسی نے بہت جگت میں اسے پکارا اس نے چہرہ ہما
 کر بائیں سمت نگاہ کی یہ وہ ہی لڑکی تھی جسے اس نے کچھ
 دیر پہلے حان علی شام کے آفس میں داخل ہونے سے دیکھا
 تھا اور اس سے بھی پہلے اس صورت کو اس نے کوئی کمین
 کے وارث میں ہرچیز موجود رہنے والی تصویر میں دیکھا تھا۔
 وہ بہت تھکے میں کسی کوئی غلط خلاف تہذیب بات اس

کے منہ سے نہ نکل جائے۔ بس اس لیے وہ اسے نظر انداز
 کر گئی تھی روتی ہوئی چاہا تھا کہ وہ اسے دین آفس کے
 دروازے میں روک کر اس کی بھی ایک کاس لے لے
 اسے خوب کھری کھری سناے۔
 ”میں..... میں دوشا..... دوشا تمہیں میں از مانی یہ سید
 میں بہن کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ بہن سے ملنا چاہتی ہوں
 کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہیں میرا
 ان سے ملنا بہت ضروری ہے پلیز۔“ وہ اداہ کھلے خستے پر
 جھکی لیے حد حاجت سے بولی۔
 ”بھئی۔“ جانش نے اس کی ٹانگوں کو دیکھتے ہوئے
 لمبے بھر کو کچھ سوچا پھر چن چن کر کے فریڈ ڈور اس کے
 لیے آواز دیا وہ منونیت بھر سے انداز میں شکر یہ ادا کرتے
 ہوئے فوراً فریڈ سیٹ پر براہجان ہوئی گی۔
 ”دیکھو آفیسر تمہیں کومزید پریشان کرنا چاہتی ہو تو میرا
 مشورہ ہے تم سنبھلیے سے واپس چل جاؤ وہ پہلے ہی بہت
 پریشان ہے بہت تھرا ہوا ہے بہت ٹوٹ گیا ہے ٹانڈے
 تمہارے آنسوؤں نے اس کی پریشانی اس کی تکلیف میں
 مزید اضافہ ہی کرتا ہے نہ کہ یہ اسے کسی آسانی یا مسرت
 سے مستعار کریں گے۔“ وہ بہت صاف گولاڑی تھی۔ اسی
 واسطے بلا تکلف و بلا لحاظ و مرمت کچھ بھی بول جانے کی
 عادی تھی تھی اسے اسے چپکے چپکے آنسو چھلکا کر دیکھ کر وہ
 بہت دیر چپ نہ رہ سکتی تھی۔
 ”موسمی۔“ اس نے نیکی میں ان کے لیے فکر مند ہوں اور
 مجھے بہت ڈرگ با ہے۔ میں کہنے کا سامنا کر لوں گی
 وہ..... وہ مجھ سے بہت بائیں ہوں روٹھ کر گئے تھے۔“ وہ
 آنسوؤں کو جلدی سے اٹھالے کے پلو میں سمیٹتی کر زیادہ
 نازک کیلے میں پوچھتی ہوئی اسے بے حد معصوم و قابل رحم
 لگی تھی کبھی بھی اسے سمجھا نہ دوسوں میں کھری کی برائی کی
 مانند وحش دہرا سا۔
 ”کیا اسے تم سے روٹھ کر نہیں جانا چاہیے تھا ہر طرف
 سے تاامید اور بائیں ہو کر بہت مشکل میں گھرنے کے
 بعد وہ ایک آخری آس لے کر تہا رہا ہے پاس آیا تھا۔ اسے

یقین تھا کہ جس کی مجبوری کو اس کی مشکل کو انڈر اسٹینڈ
 کرنے کی ضرورت کو شکر کر دے اس کا سہارا ہوگی پر تھنے تو
 اسے بہت بری طرح سے ڈی کر پڑ کر دیا اس کی آنکھیں
 اس کی پریشانی کو مکمل طور پر ادا میڈ کر کے اسے دوسری
 بائیں دوسری آنکھیں دوسری تکلیف سے دو جا کر ڈالا وہ
 وقت بہت کڑا ہوتا ہے۔ دوشا تمہیں جب نہیں جس کی
 قربت کی خواہش جس کا سہارا مطلوب ہو وہ نہیں
 ہمارے دکھ ہماری تکلیف کو بائیں نظر انداز کر دے ہم
 جسے چاہیں وہ ہی ہماری حاجت کی شدت کو نہ سمجھے۔ اس
 خسارے کے بعد پھر زندگی میں ہمارے لیے بچا ہی کیا
 ہے۔“
 ”میں اپنا قصور تسلیم کر چکی ہوں۔“ وہ بے حد تادم نگ
 رہی تھی۔
 ”کیسے لوگ ہو تم محبت کرتے ہو محبت کو نظر انداز بھی
 کر دیتے ہو محبت تو ایک بہت معتبر مقدس آفاقی جذبہ
 ہے انسان کی ذات کی پہچان روح کا مان پھر محبت میں
 کسی غلطی یا غلط فہمی کو دور نہ بدگمانی بے نیازی کی گنجائش پتا
 نہیں کہاں سے نکال لاتے ہو تم لوگ۔“ جانش کی صاف
 گولی اسے ہنوز گہری مٹا سٹوں سے دو جا کر رہی تھی۔
 ”میں..... میں آئیں سانوں کی وہ..... وہ مجھ سے
 زیادہ دور تھا نہیں رہ سکیں گے۔ اس کے پر یقین لہجے میں
 اسے دیکھا جلتے دم بڑھ گلابی اور فریڈ کڑے کے اجڑا
 کے کہاں اس وقت وہ سوگوار اور بے حد خواب ناک
 سے روپ سمیت اس وقت منجم کھٹنے والی کو نیترنگ کی
 مانند پرسوں اور محرکینزنگ رہی تھی۔
 ”ہاں تم اسے سامنے کیوں نہ خاندو تم سے ناظر نہیں رہ
 سکتا کیونکہ۔“ جب وہ تہا رہے لیے سب کچھ ساری دینا
 اپنی زندگی تک ٹھکرا سکتا ہے تو پھر وہ ہے اپنی ناامنی
 ختم کیوں نہیں کر سکتا۔“ جانش ایک انجانی ہی تک کو سن
 کے کسی وراں کو شے میں کراہتے محسوس کر کے دھڑے
 سے کہتی ہوئی نگاہ پھیر گئی۔

”آپ ہمیں کون سے جانتی ہیں؟“ دوشا کو تعارف کا خیال آیا جانشن نے ایک جھکی ہوئی نگاہ لیے اسے دیکھا۔

”ہم پچھلے تین برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں ہم دونوں کی ملاقات کراچی سے اسلام آباد کی دوران ہوئی تھی پھر میرے بار بار صراہ پر ہماری دوستی ہو گئی، ہمیں ایک بہت کیرنگ انسان کے علاوہ ایک بہترین دوست بھی ہے۔“ جانشن نے ٹوٹی نظروں سے دیکھ کر بول رہی تھی۔

”آپ کا نام؟“ دوشا کی آنکھوں میں اس کے لیے کوئی شک یا حسد کی جگہ نہ تھا کیونکہ وہ ان دونوں کی دوستی کا سن کر کسی بھی بڑی کی طرح چونکی تھی جہاں جذبوں میں ایک دوسرے کے لیے تجوہوں کوئی شک یا بد اعتمادی سر نہیں اٹھاتی تھی وہ بھی اس درجہ یقینان سے تھی جانشن نے سوچا اور ایک لمبی سانس سیتے سے آزاد کرتے ہوئے اس کے سکرانے چہرے کو دھتکتی ہوئے سے سکرانے ہوئے اپنا نام بتانے لگی۔



کل کی رات اس کی زندگی میں آنے والی تیسری بھیا تک رات تھی پہلی رات وہ جب اس نے امانہ دے کر پاپا کی وفات کے روز روئے سکتے گزاری تھی دوسری وہ جب ایک ای میل کے ذریعے یہ روح شکاف انکشاف ہوا کہ دوشا اس کے علاوہ بھی کسی اور کی خواہشوں میں ہے اور اب یہ کل اس پر قیامت کی طرح بیت جانے والی تیسری رات ہر رات پر بھاری تھی جس میں اس نے دوشا کے لیے اپنی زندگی کو سوت کی وادی میں دوشا کی چاتوں پر چڑھنے کا فیصلہ کیا پرنا کا مر رہا۔ پھر اس نے دوشا کے لیے ایک اور زندگی کا نام و نشان صفحہ سنی سے منائے کی جرأت خود میں پیدا کی مگر وہ پھر نا کامیاب رہا اور بالآخر اس نے سب کچھ چھوڑ دینے کا فیصلہ دوشا کو اپنی زندگی سے نکال دینے کا فیصلہ کیا پر وہ ایک بار پھر ہار گیا۔ جانشن نے یہ سب سنا تو اسے ہلکا کر دیا کیونکہ اس کی یادیں ابھی اس کے

جانشن بھی جس نے موسموں سے پہلے جاہت بدل لینے کا ہنر جانے کہاں سے سیکھا تھا اور کیا عجیب انسان تھا یہاں اس کے اندر رہتا جیتا سانس لیتا انسان، ہمیں لی شام ہمیں کو اعتراف تھا کہ اس نے اس جیسا اپنے فیصلوں میں کردار اور ادبوں میں بزدل انسان اپنی پوری زندگی میں دنیا میں اور کوئی نہیں دیکھا تھا اور اس کی یہی کڑوی کم بختی یہی بزدلی اس کے لیے جاہت میں خللی کا باعث بنی تھی جو دوشا نے اس کے علم پر جاسن کی شام کی کوئی گزشتہ دن اور اس کے کہنے کو تسلیم کرنا حاسن علی شام کی بھرپور حمایت پھر ہر طرف داری کرتے ہوئے وہ اس کی بات کی اس کی ذات کی بلا جھجک لگی کر گزری جو اس کے لیے اذیت ناک ہی نہیں ناقابل برداشت بھی تھی۔ کم از کم اس وقت لیکن اسے کیا کرنا چاہیے؟ وہ آگے نہیں بڑھتا کرتے اپنے فریض شیوہ پرے کو آگے نظروں سے گھور رہا تھا۔

”کہا اسے دوشا کو طلاق دے دینی چاہیے؟“ یہ سوچ ہی نشتر بن کے اس کی روح اس کے دل کو کریدنے جمید نے لگی اس کی ذہنی اور پھر سے سکتے کو تو پھر وہ دوشا کے بنائی کر کیا کرے گا؟ انسان دنیا میں کس کے لیے جیتا ہے اسے لیے یا کسی کے لیے۔ دوشا سے جدا کی بعد وہ کس کے لیے جیتے گا؟ اپنے لیے وہ فائدہ دینا نہیں چاہیے گا۔

”یہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟“ اس نے گھبرا کے سر جھٹکا اس کے شانوں سے پھسل کر کیچے کے دلانا ٹاول اس کی توجہ نہ پاسکا تھا۔ ”کیا وہ پاگل ہو رہا ہے یا پھر وہ پاگل ہو چکا ہے؟“ اپنی ہی سوچوں اپنے ہی فکس سے گھبرا کے ہمیں سکتی لپٹنیوں کو سختی سے سہلاتے ملتے ہوئے آئے دشت سامنے سے ہٹ گیا۔ ایک ان دیکھی جانی کی دشت اب بھی اس کے دل اس کی دھڑکنوں کو ٹوٹ کر دیتی تھی جانشن کے بہت مدت کاہت کرنے پر سخت ہے دلی کے عالم میں اس نے شیوہ بنائی تھی اور شاید بھی لیا ہر خیال کو

ذہن سے جھٹک کر اپنے جھٹکے ماندے اعصاب کو جھٹک کر سوچوں کی جگہ سے آزاد کرنے کی اس کی ہر کوشش بہت بڑھال اور کڑوہری۔ وہ دھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر جانشن کا انتظار کرنے لگا۔ جانشن کی چھوٹی بین اور والدین کل شام سے خاندان کی کسی تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ طبیعت کی سانسز کے باعث جانشن نہ جا سکی تھی اور جانشن کے چوکیدار ملازمہ کے ساتھ گھر میں تنہا اس لیے اس سے یہاں رہنا مناسب نہ لگ رہا تھا۔ رات وہ نکلے بس ہو گیا تھا اور جانشن کی کھلنے کی طرح تمام کرات یہاں سے لے آئی تھی آخر وہ کیوں یہاں چلا آیا۔ اسے خود پر غصہ نہ لگا اور جانشن پر بھی جانشن جیتا ہے اس لیے جیتا ہے کہاں کی اور کیا وہ پھر سے کسی سے سمٹ کر سوچوں سے لگا تو گھر بھاگا۔

”لیکن وہ جانشن کا انتظار کیوں کر رہا ہے اسے جلد یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“ ان ہی سوچوں میں اچھے جھٹکاتے ہوئے وہ بائیں طرف بیدار کون پر بھی مرٹ کی طرف بڑھا اور اسی دم ایک مانوس تھک اس کی سانسوں میں کل کر دم دم کو معطر کر گئی اس کے اعصاب پر یکلیف ایک جھوٹ چھا گیا۔ وہ ٹھنڈے جانے والے فکس اور دھکے سے رہ جانے والی دھڑکنوں کے ساتھ بہت آگے بڑھنے کے ساتھ دھیرے سے پٹانا اور ایک ہی پل میں جیسے ہر منتظر بدل گیا۔ اس کے اندر باہر کے مسودہ اور اس پر آگندہ ہوسمل کو خوبصورت کر دینے والی میک اس کے وجدان کو کوئی دھڑکن اس کے فکس کی کوئی تکلیف و شہرت نہ تھی۔ دروازے کے وسط میں سبھی کھڑی وہ پھر یہی دوشا تھی اپنی ذات میں چھپی تمام تر عداوت و ملاحت کا عکس سادہ سے روپ میں سموئے خائف خائف پشیمان پشیمان۔

”دوشا؟“ ہمیں کے دل میں مدت سے سکونت پذیر دشتیں پل میں اڑن چھو ہو گئیں۔ اس کے اندر پھر کتنے الاؤ پر تیزی سے ٹھنڈی ٹھنڈی پھولاری پڑنے لگیں۔ رات تک میں جل ٹھل ہونے لگا رگ رگ میں ملاوے

کی طرح کھلنے تمام تر چیز اس کے درمہم سے پھوٹ کر شبنم کی چلی گئی۔ اس کا بڑھایا اداس چہرہ اولین بھاریں کھلنے والے پہلے گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس کے کندھ اور اس کی بولی پر چختے والی دھم مکان میں بے پناہ شائستگی اور تروتازگی بھر گئی اور اس کی دیران کھٹکی بھی آنکھوں میں سے امتیاز سرت و تراوت کا پر جوش سمندر ٹھنڈے مار اٹھا، شش نقش سے زندگی کا بھرپور احساس جھٹک لگا۔

”تم؟“ دوشا تھمت۔ یہ تم ہی ہوں وہاں دوشا وہ مائی گاڑی۔ اس کے ٹوٹے چھوٹے جھٹکے بچھے بچھے میں یکدم ڈھیر اور بشارت کھٹکھا اٹھی وہ خوشی سے قابو لیے بیٹنی سے دو چار کی بیٹنی کی پکڑی کی مانند اور دوسری بیٹنی پستاس کی خواب کی بی کیفیت میں اس کی طرف بڑھنا دوشا کی ہاتھوں پر مضبوط ہوئی اس کے ہاتھوں کی گرفت میں محفوظ بھرا احتیاق تھا۔ اپنا ایسا مان بھرا سوگت دوشا کے لیے ناقابل یقینان اور حیرت کا باعث تھا۔ وہ بھرائی آنکھوں میں شدید حیرت سے ہمیں کو دیکھ رہی تھی۔ جس کا چہرہ اسے مضبوطی سے جھنجھ کر پٹی بے پایاں سرت کو بھٹانے کی کوشش میں مضبوط و جس کی حدت سے سرخ چہرہ چڑا ہوا تھا۔

”ہمیں جیسے معاف کر دیجیے۔ میں نے دانائی میں آپ کی حکم نہ دلوئی کی۔ آپ کابل دکھایا آپ کو تکلیف دئی آپ کو ناراض کیا۔ سو رہی ہمیں۔“ وہ سرتا پائے غماضوں کی دلدل میں جھکی ہوئی تھی۔

”انجانے میں ہر بات تو میں نے بھی تمہیں کیا دوشا تمہیں تجھے معاف کر دو معلوم نہیں کیسے وہ سب کچھ میں نے تمہیں کہا تو مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا دوشا۔“ دوشا کی غماض اسے بھی نام نہان لگی۔

”میں نے آپ کے اعتبار کو بھروسہ کیا وہ جواب مجھے سوچنے آئے تھے۔ میں نے آپ کی ذات کی فکری کی آپ کے درد کو سمجھ پایا اور آپ مجھے سے ناراض نہیں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہمیں۔“ دوشا کی آنکھیں جھٹک

پڑیں۔

”تمہارے یہاں آنے کے بعد اب مجھے کچھ یاد میں دوشتا۔ وہ اب بھی سرکار ہاتھا۔“

”ہمیں“ وہ یوں ہی بے یقینی سے دیکھتی کچھ کہنے کو چلی۔

”یکہ موت کو دوشا مجھے یقین کر لینے دو کہ یہ تم ہی ہو میں مر کے آج پھر سے زندہ ہوا ہوں مجھے زندگی کو محسوس کر لینے دو پلیر چکے موت کو دوشا۔“ اس نے سڑی سے سینٹے ہوئے وہ بدستور ایک جذب سے سرکار ہاتھ اس کے قریب کے احساس کی شروعات کے آگے بڑھا حال وصل ہو کر وہ گھر کسرک ابھی ہمیں کے تھوڑے جڑیلوں کی سرکش لہروں کے مقابل دوشا کو اپنا آپ بہت بڑی وقعت بہت حقیر لگ رہا تھا وہ اس کے لیے کسی قدر حساس دل رکھتا تھا۔ وہ یہ جان کر حیرت زدہ تھی۔

”کچھ تو کہیں کوئی سزا تو دیجیے کم از کم ذانت ہی دیجیے ہمیں۔“

”میں نے کہا ناں مجھے کچھ یاد نہیں دوشا یہ ہے تو فقط وہ ذات با برکت و بے مثال جس نے ایک بار پھر مجھ سے جدا کرنا نہیں چاہا اس جیسا سا ہو کا تو دو دو گالوں کی نہیں دوشا وہ جادو المعجز ہے۔ اس مہرمان نے مجھے میری برباد شاعری کی طاقت سے زیادہ آزمائا میرے ساتھ زیادتی بنا اور اس کی شفقت سے مجھے جاہت میں سرخروی کا اعزاز عطا کر دیا۔ اس وقت کہ جب تم میرے دو درو میرے میرے جذبات کی صداقتوں کی یا بیکڑی کے یقین سمیت میں..... دوشا میں اس کے اس احسان کے صدمے میں اسی وقت مر جانا چاہوں گا مٹ جانا چاہوں دوشا۔“ اس کے آخری الفاظ پر دوشا نے دشت زدہ نظروں سے گھبرا کر چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا آنسو اب بھی دوشا کی آنکھوں سے برکت کراس کے گل بگولہ سے تھے۔

”پلیر آپ ایسی بات نہ کریں کہ دوشا کی آنسو چھلکنا کی آہٹوں میں ایک خوفناک اثر آتا تھا ہمیں بے اختیار اس کے نرم رخسار پر دھکی جھکی جتنی بھی کو اس کی

پکوں پر جھکی لڑتی دشت کو نرم گلابی مسکراہٹ سے نکلتی محبت دیتے ہوئے مسکرایا دوشا کے حواس خوشبو بن کر بکھر نہ گئے۔

”جملہ ملما کو تھہارے گھر بھیجوں گا میں چاہتا ہوں تم جلد میرے گھر آ جاؤ میں بھر دوسل کے شب روز کی دینا میں سے آزمائشوں سے نبرد آزما اس تنہائی کا جو بوجھ دھوتے دھوتے گل ہو چکا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔ اور جیسا مزید کسی آزمائش میں اچھٹا نہیں چاہتا میں دوشا میں وہ ملکا کو تھہارے میں اور تھہارے میں نہیں اپنی اپنی حیات کے درد پر آزمائش پر خوشی میں نہیں اپنے سنگ دیکھنا چاہوں گا دوشا۔“ اس کی شخصیت اس کے الفاظ اس کے متکبر قریب کی طرح اس کا شہد چھلکنا تھا لہذا وہ اس کا بھی خوب صورت تھپا پتوں اور دھیرا وہ اپنے بیڑوں کے ایک بہت اہم مقدم خواب کی پرسوں گھبراہٹوں میں اثر اس کی شمار آدروہتوں میں کم ہوتے ہوئے بہت شانت و پرسکون تھا۔ جیسے دروہ دوسل وہ خود بایں وہ تھا ویسے ہی اس نے اس ناچک انعام کو بایں نہیں لٹایا تھا اور وہ اس خوب روی دانی پر حیرانی کی حدت چھلنے سے بھی بھری خبر میں تھپ کے دم توڑی اس صورت سمیت سیکھتے تھے حصار میں بھی نرم شائے کی طرح جھلکی چھوٹی موٹی کے جیسے مٹ کسما کے مسکرا کے رہ گئی۔

☆☆☆☆

”شفیق! مانا جا چکی ہیں آس؟“ خمار کو پک کرنے کے ارادے سے لٹکا حان چمچہ سوچ کر لپٹ آیا۔

”نہیں جی وہ تو ابھی چھوٹے صاحب سے کمرے میں ہیں چھوٹے صاحب کی طبیعت رات سے خراب ہے۔“ شفیق کے تفصیلی جواب کو سنتے ہی وہ بلا ارادہ ہمیں کے بیڑوں کی طرف آ گیا۔ ہمیں زینب کی کوس میں سر رکھے شاید سو با تھا۔ زینب کچھ پڑھ کر نکلتی پر چھوٹی اس کا سر دیا رہا میں۔

”مانا کیا وہاں کہیں کو؟“ بیڈ کے دوسری سمت آکر بیٹھے ہوئے حان نے سر گوش میں پوچھتے ہوئے آہٹکی کے

ساتھ اپنی انگلیوں کی پشت سے ہمیں کی گردن کو چھو کر بھاری کھنٹ کو محسوس کرنا چاہا ہی دم ہمیں نے آنکھیں کھول کر بہت سر دنگا ہوں سے اسے گل بکھرتے کے بعد نظریں پھیر لیں۔

”رات سے یونی ٹر حال ہو کر ہسٹ پر پڑا ہوا ہے صورت دیکھو کسی مرتبہ کے رہ گئی ہے۔“ زینب اس کے لیے بہت گرم زمین۔

”مانا میں ٹھیک ہوں ناں! سر میں ڈراما دروہی تو ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“ ہمیں کی صورت کی طرح اس کے کچھ بھی بے تحاشا تھکن گئی۔

”کیا خاک ٹھیک ہو گا۔ رات سے ایک تو آرام نہیں آیا۔“ لڑائی ہوں میں دوشا کو ہی نہیں چیک اپ کے لیے آدہ کر کے گی۔“ زینب نے دھرم کیا۔

”آپ دوشا کو نہ میں مانا وہ خوشخوار پریشان ہو جائے گی۔ میں افطار کے بعد چلا جاؤں گا چیک اپ کے لیے پراس۔“ وہ ایک چور نظر پیلو میں بیٹھے حان پر ڈال کر دھیرے سے گویا وہ حان لاطحاً سنا بیٹھا تھا۔

”وہیے باہل اور قاتیل کے معاملے میں میرا وارث قاتیل کے حق میں ہے۔ دنیا میں پہلے آنے کے ناتے اپنی خوشیوں کو پانے کا قاتیل کا پہلے حق تھا۔“ ناں مانا؟“ اس کے خدیج کے دران فریجی جیسا میں رضوان کینز اور احمد کے موضوع پر زور دھو رہے خطاب کرتے مولوی صاحب باہل و قاتیل کے واقعے کی مثال بیان کر رہے تھے جیسے پھر غور شاہنا معلوم کیوں اچانک زینب سے مخاطب ہوتے ہوئے ہمیں کو روح کی گہرائیوں تک تڑپا کے کہہ کہ اس نے یقینت سینے میں بھڑک اٹھنے والی آتش میں سکتے دل سمیت ایک سے حد بھری بھری کی نگاہ لیے حان کو دیکھا۔ ظاہر ہونٹوں پر بے ضرر سادہ سی مسکراہٹ لیے وہ جھپٹی ہوئی نگاہوں سے ہمیں ہی کو دیکھ رہا تھا اور وہ یوں اس کی تڑپ پر محظوظ کن انداز میں مسکراتا اس سے ہمیں کو انسائیت کا کوئی بہت شفاک عیار بے دروہی پار کی دکھائی دے رہا تھا۔ زینب

حان کی بات کے جواب میں ایک آدہ بھرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”بس نیچے جسد جذب ہی ایسا کہ بہر وقت نہ مرو ہے جب یہ خناس بن کر دماغ میں سا جائے شیڈوں کو کمرہ کر دے اور دلوں میں اثر جائے تو حق و باطل چھٹا بڑا اپنا پرایا کچھ بھی دکھائی دھائی نہیں دیتا۔“

”او“ مانا میں اب چلوں خمار کو بھی کب کتا ہے۔“ کلائی سے بند کی گھڑی میں وقت دیکھنا حان غلات میں مگر کتا ہوتے ہوئے اچانک ہمیں کی طرف ایک بھر پور مسکراہٹ لیے ہوئے چھکا اور ہاتھ بڑھا کہ ہمیں کے بے ترتیب رشتہ کی طرح منتشر بایوں والے سر کوئی سے سہلاتے ہوئے یونی مسکراتا مضبوط دھموں پر چلا وہاں سے چلا گیا۔ ہمیں کو ایک تلخ مسکرتی ہوئی کی بدگمانی کسی کھولنے ہوئے سیال کی مانند تیزی سے اپنی رنگ رگ میں پھیل گئی ہوئی محسوس ہوئی۔

”جس تہاڑی ڈھارک کے لیے دھانگی کب ہے حان؟“

”عید سے پہلے تک ممکن ہے“ کیا کچھ مگوانا چاہتی ہو؟“

”نہیں عید یہاں نہیں گزارو گے پنے ملک میں اپنے لوگوں کے سچ؟“ اس کے غیر متوقع الفاظ پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”اپنے لوگ؟“ وہ ذریعہ بڑا بڑا خمار نے غور اس کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت کو اسٹیرنگ پر سخت ہوتے دیکھا جن کی کشادہ تھیلیوں کی ہلکے دیوں والی پشت پر تناؤ کے سبب گیس اٹھ رہی تھیں وہ نظریں پر آیا۔

”تم کچھ پریشان ہو جاؤ؟“

”نہیں میں پریشان نہیں ہوں۔“ خمار چند لمحوں سے یونی دیکھتے رہنے کے بعد چہرہ پھیر کے دوڑتے بھاگتے متناظر کو دیکھنے لگی۔

”تم نے اس روز بابا کی بات کا برا تو نہیں مانا حان؟“ چند ساتھیوں کی خاموشی کے بعد وہ اس کی

جانب دیکھے بنا پوچھ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں پوٹی
خفت کو محسوس کرتے ہیں۔ بے اختیار اس کی سمت
دیکھا۔ اب وہ نظرس چرائی رہی۔
”ذرا سہل کر بیان کر لو گی تم کوں سے روز والی بات
کر رہی ہو تمہارا انداز سمجھانے سے زیادہ اچھا نہ والا
ہے۔“ پتا نہیں وہ خود خواہ انجان بن رہا تھا یا واقعی وہ بات
اسے بھول گئی تھی۔
”میرے لیے وہ سب دہرائو تو کیا سوچنا بھی شدید
ابانت۔۔۔۔۔“
”خدا۔“ حاسن ایک افسوری سانس بھر تاہم لہجہ میں
اسے تو کتنا سرفیس میں بلائے ہوئے کہنے لگا۔
”تم کا سامانی کے جس قابل رشک موڑ پر آج کھڑی
ہو ناں خدا وہاں ہمیں کسی سے نظر نہیں چرائی جا پیے میں
کبھتا ہوں اس مقام پر پہنچ کر تو تمہیں اس خود غری سے
حاصل سے نکل آنا چاہیے اور اگر تمہارا ساتھ تمہاری ہر اسی
کسی کے لیے بھی کسی قسم کی ابانت کا موجب نہیں ہے
تو میرے خیال میں میں تمہارے ساتھ پانٹر شپ سے
ہی انکاری ہو جاتا ہوں روک سکنا تھا وہ درہنہ میں
فقط ماما کی خواہش سے منتظر انکل کی مجھے تمہارے
ساتھ پانٹر شپ کی آفر کو قبول کیا میری اپنی مرضی اپنی
خوشی بھی شامل تھی اس میں دن تمہاری میری وہ پہلی
ملاقات تھی تو میں کتنا جانتے تھے میرا ایک دوسرے کو ماما کی
بیٹ فریڈ کے بھائی ہیں تمہارے بابا اس اتنی ہی بچپان
انتسابے نامعلوم تو کافی نہیں ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے
انتہار کرنے کے لیے ایک دوسرے کو لانا سونپنے کے لیے
تم کو میری سوچ میرے معیار پر پورا اترنے کے بعد ہی
میں نے برنس میں پانٹر شپ کے لیے او کے کیا کیا تاں
خدا۔“
”بہر حال بابا کی طرف سے میں تم سے
معذرت۔۔۔۔۔“
”جی۔۔۔۔۔ بچوں جیسی بات مت کرو۔ منتظر انکل
میرے لیے بزرگ کا درجہ رکھتے ہیں۔ میں ان کی کسی

بلا کر اور پر سرزد کر کی شرت ذہب تن کے بے ارجان وہ
تو جوان ہمسن تھا۔ وہ بار بار کھانی سے بندھی کھڑی میں
دنت دیکھ رہا تھا۔ یہ پتا چاہے پر سکون تھا مگر اس کی آنکھوں
میں جھجکا ہوا چل رہی تھی۔ اس کی ہلکے دم والی بی بی تاک
کی اٹھان کی وجہ سے گہرے ہوئے تھے۔ دم والے لبوں کے
گوشتوں میں اٹھن پتی ہوئی تھی۔ نیت کر کے مجبور منہ
میں ڈالنے کے بعد حاسن نے پڑا کیا میں اٹھایا۔
”منو وہ روزی روزی سے ہے۔ اسے بھی کچھ دو اور
پڑا کر روزہ افطار کر لے۔“ وہ بظاہر بے نیاز بن کر دھیسے
کے گویا وہ بار بار چل کر اسے لے لے ٹھک کر اس ناچھ میں
آنے والے شخص کو استقبال سے نہکتی پھر اس کے کپے
پر غل کر سونگی۔
”ہیلو ایکسکوز می یمن؟“ اس نے ہمیں کو پکارا وہ
کچھ چونک کر اس کی جانب توجہ ہوا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر
شان بے نیازی سے اسے اٹھان انداز میں چہرہ دیکھ کر بیٹھے
حاسن اور پھر اپنی جانب بڑھا اس کے بیٹھ کر دیکھتے
ہوئے اس کی آنکھوں میں اٹھن لہرائی۔
”روزہ افطار کیجئے گھر پہنچنے تک بہت دیر ہو چکی ہو
گی۔“ وہ مسکرائی ہمیں نے اس شخص کو بی بی کی لڑکی کی
مسکراہٹ کے جواب میں دھیرے سے شکر سے کہتے
ہوئے بیٹھ کے ایک عذر مورو اور رخ بنے ہوئے کہتے
ایک بار پھر بے نیاز دیکر ماضی بنے بیٹھے حاسن کو دیکھا
اور دے پائی میں لگاں اس پر سے ہٹاں۔
”روزے کے حالات میں اسے پیاس بہت تنگ کرتی
ہے۔“ پڑا کے پائس لیتے ہوئے حاسن نے غیر محسوس
انداز میں اپنی گود میں دھرا بیٹھ کر پائس کا پائس پائس
خفا انداز میں خدا کو کھانا خدا نے اپنی بے ساختگی کو بے
مشکل دیا اور ایک بار پھر ہمیں کو پکارا۔
”اس کی ضرورت نہیں تھی۔“ اچانک ہی بہت ہے
چنی محسوس کر اٹھنے والے ہمیں نے خدا کے پھر سے
پکارنے پر اس کی جانب دیکھا اور بیٹھ کر کان اپنی جانب
بڑھا پکاروہ بظاہر بچپان کر سرفیس میں بلائے ہوئے جبراً

لے لیے کھڑا ہو کر کھانا تھا۔
”لے لیجئے آپ کے بھائی نے دیا ہے آپ کے
لے پرے کر منہ حاسن کو اور اس کی کھانا۔ خدا کو پائس
کرنے کی کہانت دینے بغیر وہ زن سے گاڑی نکال لے
گیا۔ اٹھاری کے لیے نیت کے کلمات پڑھتے ہوئے
ہمیں نے حاسن کی گاڑی کو بہت دور تک دیکھا تھا۔ ایک
بے نامی کسک اس کے دل پر چٹکیاں لینے لگی۔
”مجھے بہت ضرور کی پیاس لگ رہی ہے بھائی۔“
”تو ٹھیک سے پانی پی لے ناں یار۔“
”میرا روزہ تو نہیں لوٹ جائے گا مجھے گناہ بھی نہیں
لگا بھائی؟“
”نہیں پیار دیکھ دو کہ اس کی حالت میں اگر بڑے پانی
کی پیس ناں تو روزہ ڈوٹ جاتا ہے میں پانی پیوں گا تو مجھے
گناہ لگے گا تو تو چھوٹا ہے ناں تیرا روزہ تو نہیں ٹوٹے گا
گناہ بھی نہیں لگے گا۔“
”ماضی کے ایک دل گداز منظر میں حاسن چھال ہمیں
کو پیاس سے غافل و ہر مجاہد کچھ کر اسے روزہ نہ ٹوٹنے کا
یقین دلا کر اس کے لیے فریج سے پانی نکال کر لاتے
ہوئے اس کے لیے بہت کر منہ تھا وہ یہ مگر منہ ہمیں
کے پانی پینے کے بعد ہی رخ ہوئی تھی اور اس وقت گاڑی
میں بیٹھ ہمیں اپنے تصور میں اس ایک معصوم یاد کے
جاگ اٹھے پر بہت مضطرب ہو اٹھا تھا۔ بیٹھی کے
چھوٹے چھوٹے سب لیتے ہوئے ٹیگٹ ہی اس کی جل
اٹھنے والی آنکھوں میں ایک کھٹی ہوئی سی دشت تیرے
ہوئے دھیرے دھیرے ہر منظر کو دھندلا لے گی۔
☆ ☆ ☆
”واٹ ایک نیٹ ہمیں۔“ وہ توپ کے پانی جاگے سے
اٹھا۔
”کیا ہو حاسن؟“ منتظر انکی اور دشا بھی گھبرا کے اٹھ
کھڑے ہوئے۔
”ماما ہمیں ماما ہمیں تو ٹھیک ہے ناں۔۔۔۔۔ ہاں میں
ہاں پہنچ رہا ہوں۔ میں آ رہا ہوں میں۔۔۔۔۔ میں آ رہا

ہوں۔“ ابھی کچھ دیر قبل وہ ان دونوں کے ساتھ بیٹھا ڈنر کے دوران بلی بھٹکی کھنکھار رہا۔ یہ سمجھ کر اسے شپ کر رہا تھا لیکن اب ایک ہی لمحے میں وہ کسی کھانے پر بندے کی مانند چڑچڑا اٹھنے والے امن سمیت پارے کی طرح پھرا کر رہ گیا تھا۔

”ہمیں ونڈا مسکین کا شیشہ ڈوٹے کی وجہ سے شیشے کی کرچیوں سے ہمیں کی چیشائی اور کروڑ پر معمولی خرابیاں آتی ہیں ان خرابیوں سے زیادہ اس کے وجود یا چہرے پر کوئی گراہم نہ لگا تھا لیکن جان کا دل سینے میں ان جانے بھانے غدا شت کی دہشت و اذیت کے اثر سے ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ وہ سب کچھ فراموش کیے بے تابی سے اس کی سوت بڑھا تھا اور اسی تپ سے اب انداز میں ہمیں کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر بہت پریشانی سے اس کی ہر خرابی کو سناٹے چاٹنے سے متوجہ نظر دے رہا تھا۔

”تو..... تو کھک ہے ناں ہمیں؟“ توجہ بھرنا سارالہجہ و انداز ہمیں کے لیے نیا تھا۔ پر جیسے ہی صدیوں بعد اس کی ترستی سامعین میں اترا تھا وہی وہ حیران و دبے نصیق آنکھوں سمیت گم رہ گیا تھا۔

”اس رخصت کر دیاں میں جہاں نے فیر کی گاڑی ہمیں کی گاڑی سے کچھ ہی دور سی جب میں نے یہ سب ایک منظر دیکھا اور سمجھو میری تو آنکھیں ہی جیسے تاریک ہو گئیں

اس کی ترستی سامعین میں اترا تھا وہی وہ حیران و دبے نصیق آنکھوں سمیت گم رہ گیا تھا۔

”اس رخصت کر دیاں میں جہاں نے فیر کی گاڑی ہمیں کی گاڑی سے کچھ ہی دور سی جب میں نے یہ سب ایک منظر دیکھا اور سمجھو میری تو آنکھیں ہی جیسے تاریک ہو گئیں

اس کی ترستی سامعین میں اترا تھا وہی وہ حیران و دبے نصیق آنکھوں سمیت گم رہ گیا تھا۔

”اس رخصت کر دیاں میں جہاں نے فیر کی گاڑی ہمیں کی گاڑی سے کچھ ہی دور سی جب میں نے یہ سب ایک منظر دیکھا اور سمجھو میری تو آنکھیں ہی جیسے تاریک ہو گئیں

اس کی ترستی سامعین میں اترا تھا وہی وہ حیران و دبے نصیق آنکھوں سمیت گم رہ گیا تھا۔

”اس رخصت کر دیاں میں جہاں نے فیر کی گاڑی ہمیں کی گاڑی سے کچھ ہی دور سی جب میں نے یہ سب ایک منظر دیکھا اور سمجھو میری تو آنکھیں ہی جیسے تاریک ہو گئیں

تھا۔ پر جیسے ہاتھوں کی عین گہری دلدل تھی جس میں حاسن دھیرے دھیرے دھست چلا جا رہا تھا۔

”نادانی کی باتیں مت کریں۔ دنیا والوں کی طرح وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ مجھے سے شادی سے پہلے آپ نے ایک خفیہ شادی پہلے ہی کر رکھی اور آپ کی بیٹی یہی ہے اس کی ماں جس کی پیدائش کے چند گھنٹوں بعد عمری اور آپ کسی طرح مجھے راضی کر کے اسے یہاں لے آئے۔ اب یہ تو ہم ہی کی محرومی ہے کھرا اس کا آپ نے حواس بد دیکھ جانے سے لڑا پ کیا تھا اس کا آپ نے کوئی شیم جھانے سے لڑا پ کیا تھا اس کا آپ نے کوئی خونی شیم لڑا پ کیا ہے۔ وہ اور اس اتنے سال ہم نے اسے کئی اولاد کی طرح ہی عزیز و اہم رکھا ہے شام۔ گراہم ہم اس کی خاطر نہیں کو تو خود سے جدا نہیں کر سکتے۔ ہم ان بھائی اور بھائی بی بی کے ہمارے اولاد ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں بلکا شاہ نہیں کہیں۔ وہ اسے ہماری بی اولاد سمجھ کر بہت عزیز رکھیں گے۔ ہم انہیں مایوس بھی نہیں کر سکتے شام اور پھر حاسن کا مستقبل شاندار ہوگا۔

پھر وہ یہاں پر یاہاں بلک کر فراق پر تڑپا ہے۔ ایک لاوارث کے لیے کچھ بھی نہ آئے۔

”ہمیں کچھ تو اس پر بہت ترس آتا ہے۔ میں اس مسئلے میں کوئی بات نہ کر پاؤں گا تم ہی کچھ گڑبگڑ۔“

”وہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ زور بروقت کے بجائے عقل سے کام لینا پڑے گا۔ ٹھوڑی سی ایکٹنگ کی ضرورت ہوگی۔ اس کے بعد مجھے یقین ہے وہ خود اپنے منہ سے یہاں سے جانے کی بات کرے گا۔“

”ایکٹنگ کیسی؟“ شام نے چونکے ہوئے نو پوچھا تھا۔

”وہ ہمیں سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ یہ بات بھی برداشت نہیں کر پاتا کہ اس کی ذات کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی تکلیف پہنچے۔ بڑے بڑے بھی نہیں چاہے گا کہ ہمیں ہمیں سنا گھر سے چھڑا دے۔“

”اور میں جو بھی یہ برداشت نہیں کر پاتا تھا کہ میرے

تھا۔ پر جیسے ہاتھوں کی عین گہری دلدل تھی جس میں حاسن دھیرے دھیرے دھست چلا جا رہا تھا۔

”نادانی کی باتیں مت کریں۔ دنیا والوں کی طرح وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ مجھے سے شادی سے پہلے آپ نے ایک خفیہ شادی پہلے ہی کر رکھی اور آپ کی بیٹی یہی ہے اس کی ماں جس کی پیدائش کے چند گھنٹوں بعد عمری اور آپ کسی طرح مجھے راضی کر کے اسے یہاں لے آئے۔ اب یہ تو ہم ہی کی محرومی ہے کھرا اس کا آپ نے حواس بد دیکھ جانے سے لڑا پ کیا تھا اس کا آپ نے کوئی شیم جھانے سے لڑا پ کیا تھا اس کا آپ نے کوئی خونی شیم لڑا پ کیا ہے۔ وہ اور اس اتنے سال ہم نے اسے کئی اولاد کی طرح ہی عزیز و اہم رکھا ہے شام۔ گراہم ہم اس کی خاطر نہیں کو تو خود سے جدا نہیں کر سکتے۔ ہم ان بھائی اور بھائی بی بی کے ہمارے اولاد ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں بلکا شاہ نہیں کہیں۔ وہ اسے ہماری بی اولاد سمجھ کر بہت عزیز رکھیں گے۔ ہم انہیں مایوس بھی نہیں کر سکتے شام اور پھر حاسن کا مستقبل شاندار ہوگا۔

ہوتے ہوئے ہمیں کو کوئی دکھ اٹھانا پڑے۔ یہ حقیقت جان کر معلوم نہیں کیوں میں کچھ خود غرض ہو گیا۔ میں نے بہت دعا میں مائیں کر کی طرح میں وہاں نہ جا سکوں میں نے بارہو چاکر میں انکار کروں اور ملا سے پاپا سے کہوں کہ وہ مجھے یہاں سے نہ بھیجیں خود سے دور نہ کریں اس گھر سے ہمیں سے دور نہ کریں اور یہ میں حقیقت جان چکا ہوں۔ میں نے ان دونوں کی باتیں سن لی ہیں کہ میں ان کی باتیں سن گیا ہوں ایک لے پاک ہوں۔ اس لیے وہ پر کوئی حق یا اختیار نہیں رکھتے۔ میں اس لے کچھ نہ کہہ سکا۔ شاید سب اپنی ذات کی اس جھوٹ میں کی شناخت کر کھو دینے کا خود میں حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ یہ سب میرے ساتھ میری تقدیر ہے کیا۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ مجھے ان حالات کے سامنے بنا کی مزاحمت کے عاجزی کے ساتھ سر بیڈر کر دینا چاہیے تھا۔ پر میرے دم دم میں بدگمانی کا زہر بھر گیا۔ مجھے کسی سے سب پاپا کی وجہ سے میرے ساتھ ہوا جنہوں نے مجھے دنیا کے سامنے اپنا بیٹا کہہ کر متعارف کرانے کا جھوٹ بولا تھا مجھے کسی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ میرے رخ پر اپنی اپنی تھا وہ ہمیں کی طرح میری ذات کے لیے کچھ بھی نہ کہتی تھی۔ جنگ لڑتیں اور ہمیں میری سیاہ بختی جیت نہیں اور مجھے کسی سے سب میرے ساتھ ہمیں کی وجہ سے ہوا جس سے میں نے جنون کی حد تک اور ہر حد سے زیادہ ٹوٹ کر محبت کی جو کچھ بھی ہو مجھے اس سب کا محرم ہمیں کی ذات کی اور میں ماما پاپا اور اپنی قسمت کی طرح ہمیں سے بھی بدگمان ہو گیا۔ میں چاہتا تھا جیسے میں سے سکون رہ رہا تھا۔ دیکھ ہی وہ سب بے سکون رہیں اور اپنی اپنی گھٹیا خواہش کے آگے میں دنیا کا گھٹیا تر شخص بن گیا میں چاہتا تھا میری طرح ہمیں بھی ترے اور ہمیں کی تڑپ ان دونوں کو نہ دے تاکہ انہیں میری تڑپ کا احساس ہو انہیں یہ احساس ہو جائے اپنی خوشنودی سے جدا ہو کر کوئی کیسے جیا کرنا ہے۔ اپنی اس مکروہ خواہش سمیت میں نے ایک دن یہاں آنے کا

فیصلہ کیا تاکہ قریب قریب سے اس کو تڑپے ٹوٹے ٹوٹے دیکھ سکے اور پھر
مجھے بار بار کاغذی کا مندرجہ لکھنا پڑا جو اسے ہندوہ میں کل
والا دروازہ اور تکلیف کو اپنی چھوٹی سی چھوٹی زمین کو بھی ہر
کسی سے چھٹوٹو شکر کرنے والا بل میں بے چین و ہرج
ہرج اس ہو جانے والا ممکن ہندوہ میں بعد ہر تکلیف کو
چپ چاپ خاموشی سے اپنی ذات پر پھیل جانے والے
معدود کو انجان کے روپ میں میرے سامنے تھا کہیں اپنی
خاموشی سے کسی سے میرے ہر حربے کو کام نہ جاتا ہوا
کہیں اپنی مصلحت پسند نظریات سمیت نہایت عاجزی
کے ساتھ جتن قدمی کے ذریعے میرے گھٹا ارادوں کو
سہارا کرتا ہوا کسی اپنی غیرت و اشتعال کے برابر آجاتا
والی شرافت کو لکھتے چھڑو کے کھد دینے والے ضمیر کے
سامنے ملول و شرمسار ہو کر گھٹنے جکیتے ہوئے تو کبھی اس
کا ہل کی قدرت کا ملہ کے ساتھ ستر ملے قریب قریب کے اپنی
تکلیف تسلیم کر کے غلامانہ و قسمت کے آگے ہتھیار
ڈالنے ہوئے میرے فائدہ پر غور نہ جانے کب سے غفلت کی
نیدرستی ہوئی انسانیت کو اپنی عاجزی و سادگی شرافت و
معصومیت سے بیدار کرتا ہوا کل جب مجھے اس کے
ایکسٹنٹ کی خبر ملی تو مجھے کچھ ایسے کرنے کی ایک ہی جھلک
میں میرے بدن سے روح نکلتی تھی وادھر مجھ پر یہ راز
کھلا کہ میں اپنے غریب سے اسے ایسی خوشبو کبھی خوشبو
دیتا آیا ہوں۔ پر..... پر یہ سچ ہے دوشا کہ میں نہیں اس
سے چھٹا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ تو اس سے لانا چاہتا تھا جتنا
تھا اور اس کی تڑپ کے سامنے مانا کو تو پتا تصور کر کے مجھے
ہمیشہ ایک نہایت عینی و تسکین حاصل ہوتی تھی۔
”لیکن آپ آپ کیسے مجھ کیوں بتا رہے ہیں۔
آپ کو اپنی زیادتیوں کا یقین کے سامنے اعتراف کرنا
چاہیے نہ کہ میرے سامنے۔“
”تم دوشا..... تم اس سے کہو کہ وہ مجھے معاف
کر دے۔ میرے نفس نے مجھے یہ بتا دیا۔ بدلتن کر دیا
بھڑکے یا دوشا میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ دوشا ہمیشہ
ہمیشہ کے کہیں بہت دور دروازہ ہو جاوے سزاوے

مجھے پر مجھے معاف کر دے وہ اگر مجھے گاہے گاہے تو میں گھر بھیج دے اسے اپنی صورت بھی نہ دکھاؤں گا۔ یہ بودشا نہیں یسین کی قسم اسے کہو مجھے معاف کر دے۔ بودشا بد بخت کو وہ معاف کر دے اور تم بھی مجھے معاف کرو۔ دوشا دوشا میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں دوشا یہ سوچ نہیں ہے۔ میں تم سے واقعی بہت محبت کرتا ہوں۔ ایک بھائی کی طرح دوشا پلیز مجھے معاف۔۔۔۔۔

بالکل اچانک ہی کسی نے عقب سے اس کے شانے پر زبردستی ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ بات مٹل کر بھول کر کہی۔ یہی سانسوں سے آہستہ سے پلٹا اور یکدم ہی اسے دیکھ گیا۔

”ماما۔۔۔ وہ زینب تھیں اور ان کے عقب میں روانہ ہوئے۔“

کھڑا ہو گئے۔ زینب نے بہت شفقت سے حان کے ہاتھ سرخ پر جانے والے چہرے کو شیعہ تھوپوں میں تھام لیا۔ حان نے اسے نظر چڑا کر کہیں بھٹکا لیا۔

”دھکی کر کے پٹیاں ایک دن دوسرے گھر چلی جاتی ہیں۔ پڑیاؤں میں ہوتی ہیں ان اسی لیے شام کو بیٹوں کی خواہش زیادہ کی شادی کے کئی سال بعد کی اپنی کے بعد آ کر نہیں آئے ایک ایسے بچے کو اپنا بچہ کرنا بالکل لازماً ہوتے ہوئے گود لینے کے بعد دوشا میں اس کے ہمارے سوا کوئی نہ ہو۔ ہمیں دھڑکا بھی اچانک اس بچے کو کوئی طلب گار بن کے نہ آ جائے۔ بہت تلاش کے بعد ہم نے ہمیں پایا مگر ایک مسئلہ تھا کہ ہمیں کسی عمر کا بچہ اور دوسرا قریبی جلد مانوس ہونے والا بچہ نہ تھے۔ میں نے عمر کا بچہ راز دوشا کے ساتھ نہیں اپنا کر لیا تھا۔ بچہ دیا۔ ایک برس کے عمر سے میں تم ہم سے اتنے مانوس ہو گئے کہ خود سے ہمارے ساتھ رہنے کی خواہش کرنے لگے۔ وہ دن ہماری زندگی کا خوب صورت ترین دن تھا۔ جب تم نے مجھے اماور شام کو پایا کہہ کر پکارا۔ تمہارے اس گھر میں آنے کے بعد ہماری سوئی ویران اور اواسی یہ ادھوری

[illegible][illegible]

واپس بلوالینا چاہیے، پھر اپنے کیے گئے عہد کا سوچ کر بے بس ہو جاتے وہ تمہیں دیکھ کر اپنے عہد کو توڑنے کا فیصلہ نہ کر لیں اسی لیے اکثر ارادہ بنانے کے باوجود تمہارے پاس تم سے ملنے جانے کی خواہش کو پورا نہ کر سکے۔ یہ سب جاننے کے بعد بھی تم کو کوئی گلہ ہے تو میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔“ زینب اب اس کے آنسوؤں میں بھیکے چہرے کو اپنے دوٹپے سے نرمی سے صاف کرتے ہوئے محبت سے مسکرا رہی تھیں۔

”ماما دوشا آئی ہے۔“ قدموں کی آہٹ پر یمن نے اپنے پیچھے جھانک کر زینب کو اطلاع دی۔

”افوہ تم ابھی یہیں کھڑے ہو لڑکے کیسے لا پرواہ ہو۔ میں نے ہی دوشا کو بلایا ہے۔ ہر بار بھول جاتے ہو میری جان اب دوشا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اب میں کیا غیروں کی طرح اسے عیدی دینے جاؤں جاؤ ساتھ لے جا کر کچھ عیدی کی شاپنگ کرواؤ اسے، بچوں کے لیے یہ تو عیدی کی رونق ہوا کرتی ہے ابو میں یہ کہنے آئی تھی۔ حاسن بچے تمہارے اور یمن کے سونڈ کے لیے میں نے آرڈر دے دیا تھا۔ جو تم بیچ کر کے لے آنا اور اس لا پرواہ لڑکے کے بھی اسے تو کچھ ہوش نہیں کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں 29 کی عید ہو گئی تو پھر پرانے جوتے ہی گھسٹتا پھرے گا۔ میں تو تم دیکھ رہے ہوں اکتی مصروف ہوں۔ گھر کے لیے بھی وقت نہیں بچتا۔ میرے پاس تمہارے پاپا بڑس کو اتنا پھیلا گئے ہیں کہ وقت اور توجہ کم پڑ جاتی ہے۔ پر کام ختم نہیں ہو پاتا۔“ وہ کسی ماں کی طرح ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

”ماما مل اس کے کہ وہ ہر بات کو بھلا کر نظر انداز کرتی۔ وہاں سے جاتیں حاسن نے بے تابی سے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں بھینچ کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بے تحاشہ چوم لیا۔

”سوری ماما،“ وہ ننھے سے بچے کی طرح ان کے سینے میں منہ چھپا کر گڑ گڑایا۔

”حاسن! بیٹا بس، بہت ہو گیا رونا دھونا، شکر کرو کہ

یابوی کا کفر تو ٹوٹ گیا ناں بنے، فقط حقیقی، خونی رشتوں کے دم سے ہی تو نہیں قائم یہ دنیا، ایک رشتہ محبتوں کا بے غرض رفاقتوں کا بھی تو ہوتا ہے ناں میرے بچے۔“ وہ نرمی سے اس کے گھنے بالوں والے سر کو چوم کر مسکرا کے کبھی حاسن کو بہت عظیم بہت مقدس لگی تھیں۔ انہوں نے یونہی مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کو شوق ہاتھوں سے تھپکا اور پھر یمن کے بھی سر پر ہاتھ پھیر کر وہاں سے چلی گئیں کہ دوشا مسلسل ان کو پکار رہی تھی۔ ان دونوں کے بیچ ایک گہری خاموشی چھا گئی۔

”رات خمار کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ یمن ماہ رمضان جیسے رجتوں برکتوں کے مہینے میں کوئی کافر بھی دست طلب ہمارے سامنے پھیلائے تو ہمیں حکم ہے کہ اسے مایوس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ مایوسیوں کا نہیں محبتوں کا مہینہ ہے اور اس عظیم مہینے میں عداوتوں، رنجشوں، بدگمانیوں، نفرتوں کے ببول کو پروان چڑھانے والا کافر سے بھی زیادہ بدتر اور گمراہ ہوتا ہے۔ میں ایسا کفر کرنے والا کافر سے بھی بڑا بدتر گمراہ بننا نہیں چاہوں گا تو کیا یہ جاننے کے بعد بھی تم میری طرف سے اپنا دل صاف نہ کرو گے بھائی۔“ وہ کیا کہہ رہا تھا حاسن نے بے یقینی سے اس کی سمت دیکھا جو محبتوں کا پیام آنکھوں میں روشن کیے اپنی ازلی سادگی سے مسکرا رہا تھا۔

”یمن۔“ خود آپ اپنی ہی نظروں میں گر جانے کی اذیت کی شدتوں سے دوچار ہوتا حاسن جیسے نظر اٹھا کر اس سے آنکھ ملانے کے بھی قابل نہ رہا تھا۔

”میں تو بہت برا ہوں یمن، بہت گھٹیا حاسد میں اس محبت کے لائق نہیں تو..... تو بس مجھے معاف کر دے یار۔“

”ایسی خواہشیں جو ہمیں دکھوں کے سوا کچھ نہ دیں انہیں آغاز میں ہی نہ مار دیا جائے تو پھر وہ ہمیں مار دیتی ہیں اور جیتے جی ہم اپنے اندر جیسے اپنی موت آپ ہی مر جاتے ہیں، میں یہ جانتا تھا پھر بھی ان خواہشوں کا غلام بنا رہا ہر دم نفس کا تابع دار بنا رہا، تھوڑا ہی سہی گھٹیا پن کا

”یعنی تم سمجھ رہی ہو کہ میں تم سے کوئی بھرداری وغیرہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”بس ختم کرو اس ٹاپک کو حاسن۔“ وہ پتا نہیں کیوں بہت جھنجھلائی ہوئی تھی نظر تک نہ ملتا رہی تھی۔

”تمہارا! میں اور! یمن تزاوتح کی ادائیگی کے لیے منظر انکل کے ساتھ مسجد جا رہے ہیں! واپسی پر مجھے تمہارا جواب چاہیے ہاں میں۔“ وہ ددوٹوک انداز میں بولا تو خمار بے بسی کے احساس سے یکدم ہی بھرا آنے والی آنکھوں میں آتے آنسو چھپانے کو رخ موڑ گئی۔

”تم بہت برے ہو حاسن۔“

”میں اچھا ہوں یا برا اس کا یقین دلانے کے لیے ایک عمر بڑی ہے۔“ وہ اعتماد سے مسکرایا پھر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر ایک مدھر سرگوشی کی۔ ”میری طرف سے پیشگی عید مبارک اور کوئی بھی جواب دینے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ اب میں ہر عید تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“ نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر یونہی اعتماد سے مسکراتا وہ پلٹ گیا۔ اسے دور جاتے ہوئے دھمکتی خمار یکلاخت پر سکون ہو کر مسکرائی تھی۔ یہ سوچ کر۔

”جو شخص اس کے لیے اس کی موجودگی میں اپنی اسوکنگ کی عادت کو فراموش کر سکتا ہے وہ زندگی کی شاہراہ پر اس کے ساتھ اعتماد سے چلنے کا حقدار کیوں نہیں ہو سکتا!!“



”ظاہرہ تو میں نے بھی کیا بھائی۔ تمہاری جان تک لینے کے در پے ہو گیا۔ کیا تم میری اس چھوٹی اور گھٹیا حرکت کو معاف کر دو گے؟“ وہ معافی کے جواب میں معافی مانگتے ہوئے حاسن کو اس سے اعلیٰ ظرفی کے سب سے اونچے منبر پر کھڑا محسوس ہوا۔ وہ اب مسکراتے ہوئے حاسن کے قریب آ رہا تھا۔

”ہیمن۔“ تڑپ کے اسے اپنے ساتھ لپٹا ہوا حاسن بے اختیار ہو کر دوسرا پڑا۔



”یہ..... یہ کیا مذاق ہے حاسن؟“ خمار کو ان لوگوں کے اپنے ہاں آنے کا مقصد معلوم ہوا تو وہ تباہی پاتے ہی اس پر جھنجھلائی۔

”یہ مذاق نہیں ہے یہ سب واقعی بنیدہ ہیں۔“

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟“

”جیسے دنیا میں اور بہت کچھ ممکن ہے بھی ویسے ہی.....“

”پر تم جانتے ہو کہ میں ڈیشان.....“

”دھت۔“ وہ دمزدہ سا ہو کر سر جھٹک گیا۔

”کیا اس رقب روسیہ کا ذکر یہاں بہت ضروری تھا۔ اس وقت۔“

”پلیز حاسن میری بات کو مذاق میں مت اڑاؤ اور اس حقیقت سے بھی نظر نہ نہ چراؤ۔“ وہ رو ہاکی ہونے لگی۔

”یعنی اگر تم نے اس گھونچو کے جھوٹے وعدوں پر یقین کر لیا تو اب تمہیں تمہاری اس حماقت یا غلطی کی تا عمر سزا ملتی رہنی چاہیے کیا خمار۔“

”میں اس قابل نہیں تم چاہے جو بھی دلیل دو مجھے اپنی حقیقت۔ اچھی طرح معلوم ہے۔“

”خیر فکر مند تو مجھے بھی ہونا چاہیے کہ میرا ماضی تو تم سے بھی کہیں زیادہ مشکوک ہے۔“

”مردوں کو ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا ان کی ذات تو پھر بھی مضبوط اور پر اعتماد ہوتی ہے۔“

(نقطہ نمبر 3)

محبہ و شہ

محبت سحر بٹالہ

بات تھی اُن سے تو ایفائے وفا کی حد تک
کیا خبر کیسے یہ اب سود و زیاں تک پہنچی
ہم نے تو ضبط کا پتھر رکھا سینے پر مگر
دل دھڑکنے کی صدا اہل جہاں تک پہنچی

عمر کا ٹکڑی پر ٹوٹنے والے صدمے کا درد اس نے اپنے دل و دماغ میں پوری شدتوں سے محسوس کیا تھا۔

کھنٹوں وہ شہید نشین کے زیر اثر اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔

”ضدونی! کیا ہوا ہے تمہیں؟“

شدت گریہ سے سرخ ہوئی اس کی آنکھیں دیکھ کر صبا گھبرا گئی تھی تو وہ خود پر سے قابو کھو کر اس سے لپٹ کر بچھڑے
سک اٹھی۔

”خدا کے لیجئے! کیا تو سبھی کیا ہوا ہے؟“ وہ ہراساں ہونے لگی تھی۔ ”میں چچی جان کو بلاتی ہوں۔“ اس نے کہا تو
”جی! نے بے اختیار اس کا ہاتھ تمام لیا۔

”کی نے ڈانٹا ہے کیا معید بھائی نے؟“ ”بابا نے پریشانی کے عالم میں اندازہ لگا ناچاہا تو خود کو سنبھالتے ہوئے اس
نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پھر کیا ہوا ہے کیوں رورہی ہو؟“ ”بابا نے تھیرے سے اسے دیکھا تو وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میری فریڈ کے اکاؤنٹی ڈھونڈ رہی ہے۔“

”اوہو! وہ کیا کوئی تاسف نے گھیرا تھا۔ پھر اس کی دیگر گول حالت دیکھ کر اسے تسلی دینے لگی۔

”لیکن اس میں انسان تو کچھ نہیں کر سکتا تاہم اتنی نشین صحت کو۔“

”پتہ نہیں؟“ جب سے میں نے سنا ہے میرے دل کو سکون نہیں آیا۔“ اس نے بے بسی سے ہر لہجے میں کہا تو
آنکھیں پھر آنسو بہانے کو تیار ہو گئیں۔ صبا بیچاری اسے تسلیاں دے رہی تھی۔ مگر اسے ایک پل کو بھی سکون نہیں مل رہا

تھا۔
 چھپنے کی دنوں کی انجھی ہوئی کیفیت جیسے سٹیج پر کئی عموماً غمگیناں ہوتی تھیں۔
 ”عز کا ش میں اس وقت ہمیں کسی کے دے حرف ہی کہہ سکتی۔ کچھ ایسا کر سکتی جس سے تمہارے اس دکھ کا مداوا ہو سکتا۔“
 وہ خود کو سخت مجبور دلا چار محسوس کرتے ہوئے سسک اٹھی تھی۔

خیال و خواب ہوئی ہیں مختصی کسی
 لبو میں تاج رہی ہیں وحشیہ کسی
 نہ شب کو چاند ہی اچھا نہ دن کو مہر اچھا
 یہ ہم پر بیت رہی ہیں قیاس کسی
 وہ ساتھ تھا تو خدا بھی تھا میراں کیا کیا
 پچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کسی
 اس کی بھیجی طبیعت اور خاموشی کے لیے تشویش کا باعث تھی۔
 ”ایک بار جا کے اپنی دوست سے مل لیں اسے کسی دے لیں تو سکون مل جاتا تھی۔“
 ”تائی جان نے اسے اس قدر
 حساس ہونے کو دیکھ کر صاف سے کہا تو وہ نہ سوچتی مسکرا دی۔
 ”اب تو میں ٹھیک ہوں تائی جان کوئی بھی شوگ کہنے دوں تک نہ مانا جاسکتا ہے۔“
 ان سے زیادہ خود کو تسلیم دی تو اس نے اس کے شانے پر بازو دار کرتے ہوئے پیار سے کہا۔
 ”اسی خوشی میں میری طرف سے کئی کے پسندیدہ فلمیں دے کر کسی کس کریم ہو جائے۔“
 ”بھائی جان پچھلے ایک ماہ کے فراخ دل ہو گئے ہیں۔“ وصال نے حساب لگایا تو وہ مسکراتے ہوئے اسے
 حوروں نے لگا۔

”میں تو یونی کر رہ رہا تھا! انہیں پیسے نکالیں تاکہ آپ کی دگوت سے لطف اندوز ہوا جاسکے۔“ اس نے ڈرنے کی
 ایکٹنگ کی تو وہ اپنا وارلٹ نکالنے لگا۔
 ”میرے خیال میں تو سچی نے انگریز کو کراہنے پر سروسا کر لیا ہے۔“ تائی جان نے اندازہ لگایا تھا پھر اپنا بیت بھرے
 انداز میں اسے ڈانٹنے لگیں۔ ”گر تیار ہی نہیں ہے تو مت امتحان دو وگرا ہی صحت کا بیڑہ خرقت مت کرو۔“
 ”کس بات ہے سچی؟ کیا واقعی امتحان کی تیاری نہیں ہے؟“ چچا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ تیزی سے ہلکیں
 جھپٹی آنکھوں کی کئی کئی دندریں نہیں تائی جان سے دی۔
 نوے کا چھبیس کی تک محسوس کر کے معیہ نے بے ساختہ اس کے مچھلے ہوئے چہرے پر جا چٹکی لگا دی تھی۔
 ”ابو! یہ سب تو یونی ہوا میں تیر چارے ہیں۔ بالکل ٹھیک ہوں میں اور آج کل تو امی کے ہاتھوں سے بے پرائے
 کا ناشہ بھی کر رہی ہوں پھر بھی یہ لوگ مطمئن نہیں ہیں۔“ بات کرتے کرتے بلارا درازہ معیہ سے نظر مل گئی تو اس نے
 کسمسا کہہ کر پلوں لیا۔

”ابو! یہ سب تو یونی ہوا میں تیر چارے ہیں۔ بالکل ٹھیک ہوں میں اور آج کل تو امی کے ہاتھوں سے بے پرائے
 کا ناشہ بھی کر رہی ہوں پھر بھی یہ لوگ مطمئن نہیں ہیں۔“ بات کرتے کرتے بلارا درازہ معیہ سے نظر مل گئی تو اس نے
 کسمسا کہہ کر پلوں لیا۔
 ”ابو! یہ سب تو یونی ہوا میں تیر چارے ہیں۔ بالکل ٹھیک ہوں میں اور آج کل تو امی کے ہاتھوں سے بے پرائے
 کا ناشہ بھی کر رہی ہوں پھر بھی یہ لوگ مطمئن نہیں ہیں۔“ بات کرتے کرتے بلارا درازہ معیہ سے نظر مل گئی تو اس نے
 کسمسا کہہ کر پلوں لیا۔
 ”ابو! یہ سب تو یونی ہوا میں تیر چارے ہیں۔ بالکل ٹھیک ہوں میں اور آج کل تو امی کے ہاتھوں سے بے پرائے
 کا ناشہ بھی کر رہی ہوں پھر بھی یہ لوگ مطمئن نہیں ہیں۔“ بات کرتے کرتے بلارا درازہ معیہ سے نظر مل گئی تو اس نے
 کسمسا کہہ کر پلوں لیا۔

انہی بات پر چھٹی برائیتی نگاہ ڈال کر اس نے ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے رساں سے کہا۔
 ”میں تو کچھ خاص مطمئن نہیں ہوں لیکن اگر آپ خود چھان بین کرنا چاہیں تو.....“
 ”تم نے کہہ دیا اس ٹھیک ہے۔ معاملہ ختم ہو مزید چھان بین کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ تائی جان نے اطمینان
 سے کہا تو عجیب سی شرمندگی معیہ کو گھیرنے لگی۔
 ادھر سچی کے کندھوں پر سے تو جیسے منوں بھاری بوجھ سرک گیا تھا جو کئی دنوں سے اطمینان کا وہانی کے غیر متوقع پر پوزل
 کی صورت میں موجود تھا۔

”مجھے ایک دوست کی طرف جانا ہے۔“ وہ تنہید سا کہتا تھا کھڑا ہوا تھا۔
 ”معیہ! جلدی آ جانا۔“ تائی جان نے اس کی طبیعت سے واقف ہونے کے باوجود حسب عادت تنبیہ کی تو وہ
 اثبات میں سر ملاتا چلا گیا۔
 ”اس قدر انگریزی ہو کر کھینچیں گی!“
 صبا کی یہ یلغار کس وجہ سے تھی وہ کچھ نہیں پاتی تھی۔ سبک میں برتن رکھتے ہوئے وہ اس کی طرف پلٹ گئی۔
 ”کہا ہوا کیا ہے؟“
 ”ابھی کھانے کی میز پر ہوں وہ لاوا مکمل تمہاری ساعت سے نہیں نکرایا۔“ وہ جل کر رہ گئی تھی۔
 ”کون سا میری صحت والا؟“ اس نے جان بوجھ کر ناگہی کا مظاہرہ کیا تو صبا اٹھ کر بولی۔
 ”تمہاری قسمت والا۔“

”چ..... صاف صاف کہنا۔“ وہ چڑ کر کہتے ہوئے برتن دھونے کے لیے پلٹ گئی تو صبا نے مایوسی سے کہا۔
 ”صاف صاف اب کیا کہوں جب رزائی ہی گندا آیا ہے۔ معیہ بھائی نے تمہارے پر پوزل کو درج کٹ کر دیا
 ہے۔“
 ”تو اس میں میرے اداس ہونے کی بات ہے یا تمہارے؟“ سچی کی بڑ مر دی دور ہو چکی تھی۔ بھولہن سے پوچھا تو
 صبا نے تھوڑی نظر ڈال کر سہاے دیکھا۔

”نہیں زرا بھی اسوں نہیں ہوا صوفی۔ اتنا چھاپر پوزل!“
 ”میرا کون سا طہر چل رہا تھا اس کس کے ساتھ۔“ اس کے لب و لہجے میں محسوس کن طعنائیت تھی۔ غلط بھر کچھ
 سوچنے کے بعد صبا کی آنکھوں میں چمکی اتر آئی۔
 ”صوفی! انہیں ایسا تو نہیں کرتے اور معیہ بھائی.....“
 ”کیا؟“ وہ زور سے سچی کو صاف کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔
 ”نہیں! میرا خیال غلط ہی ہو سکتا ہے۔“
 ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ سچی نے دانت چس کر کہا۔

”یہ نہیں! انہیں اطمینان کا وہانی میں کیا خیال نظر آگئی ورنہ اس سے پہلے تو انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“ صبا نے
 جیسے تے کا ظہار کیا تو سچی کو بھی خیال آیا۔
 ”کیا واقعی وہ اس معاملے میں مجھے سپورٹ کرنے کو تیار ہے؟“ اور یہ خیال اس قدر خوش کن تھا کہ وہ کئی خوشدشات کی
 گرفت سے نکل کر خود کو ہلکا محسوس کرنے لگی تھی۔
 معیہ صحن سے بھی مدد مانگنے کا عہد نہیں دور جا سوا یا اس نے اپنے گزشتہ رویے پر معیہ سے معذرت کرنے کا پکا

ادارہ کر لیا تھا۔ سو اسی رات دل کڑا کرتی اس کے سر سے تک آہی گئی۔ اس بار وہ روزہ ٹھکنے کا راجازت لینا نہیں بھولی تھی۔

وہ بستر پر کھنٹی کے بل نیم دراز کی فائل میں مہمک تھا۔ اسے اپنے کمرے میں دیکھتے ہی چیشیا پر بل بگڑے۔

”کیا بات ہے؟“

اس کے لیے جس بھی کسی تھی۔ وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتتی رہی پھر بہت مشکل سے اپنی آہ مدی وجہ بیان کی۔

”آئی ایم سوری معید اس روز میں سے بہت بد پتیری کی گی۔“

”میں نے آؤٹ بھی آئیں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہ رہا۔“ وہ سگ اٹھا تھا۔ وہ اس کے غصے سے ڈری گئی مگر کچھ اپنے غزشتہ رویے کی بدصورتی کا احساس تھا اور کچھ اس کے مددگار اندر دے گا اس لیے ہنسی سے بولی۔

”تم اپنے اس رویے میں حق بجانب ہو مگر میں واقعی تم سے معذرت کرتے آئی ہوں۔“

”میں تم سے اگر کچھ پوچھ رہا تھا تو اس کا بھی کوئی مقصد تھا جواب تم پر بہت اچھی طرح واضح ہو چکا۔“ وہ تنہی سے بولا تو وہ شرماہوئے گی۔

جب دوسرے کے بعد وہ تنہی سیدھا ہوتے ہوئے تختی سے پوچھنے لگا۔

”کیا سوچا ہے تم نے آگے کے بارے میں؟“

”وہ..... تم کے فارکی دیکھتے ہوئی ہے۔“ اس نے بشکل بتایا تو وہ خاموش ہو گیا۔ خود ہی کے دل کی بھی عجیب سی حالت ہونے لگی تھی۔ امتحان پر تھے اور وہ ایک لفظ بھی بڑھ نہیں پارتی گی۔

”تم نے اس سے کنٹیکٹ کیا ہے؟“ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ وہ مجرمانہ انداز میں بولی تو ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے وہ تنہی سے کہنے لگا۔

”جو کچھ ہو رہا ہے اور جو آگے ہو گا اس کی ذمہ داری مجھ پر مت ڈالنا میں روز روز کسی اطہر کا دوائی کو بیٹا کسی خامی کے نہ چٹکتا نہیں کر سکتا۔“

”میں اس سے کیسے کنٹیکٹ کرتی معید وہ خدا بھی پر اہم میں ہے۔“ وہ بے جا رنگ سے بولی تو اس نے نکھرے ہوئے ہوئے اہل انداز میں کہا۔

”اطہر کا دوائی کو نہ سکتے کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے قابل نہیں تھا بلکہ میں نے صرف اپنی زبان کا پاس رکھا ہے لیکن صرف یہی آواز خرابی بار اس کے بعد چاہے مگر کارپور پوزل آئے یا کسی ایکس دوائی دیکھنا سب کی طرح میں بھی اس کی حمایت ہی کروں گا۔“

کتنی ہی دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی تھی۔ اس خاموشی کو معید کی نگاہوں نے توڑا تھا۔

”اور کیا کہنا ہے؟“

اس کے پوچھنے پر کئی کو اپنی تمام تر ہمت جمع کرنا پڑی تھی۔ جو بات اتنے دنوں تک سوچنے میں بہت آسان لگ رہی تھی اسے معید کے سامنے بتانا ایک بہت مشکل مرحلہ تھا۔

”وہ اگر اب عمر..... فی الحال پروڈیوزل بیچنا انورڈ نہ کر سکا تو کیا تم مجھے چند سالوں تک گھر والوں کے سامنے سپورٹ کر سکتے ہو لیکن اور شرت نہ کرنے پر؟“

اس کی غیر متوقع درخواست پر معید کو اپنی نپٹیاں سلگتی محسوس ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر تلے اثرات حقیقتی کبھی گئے تھے۔

”کبھی اپنے آپ سے نکل کر بھی سوچ لیتے جی میں میر۔“ وہ بے حد تنہی و ترشی سے پوچھنا تھا۔ ”تم تنہا نہیں ہوتے تم سے شلک اور تنہی بہت سے رہتے ہیں تمہارے راجاتے برسے فیصلے کا جن پر مگر پورا اثر ہوتا ہے۔“

”میں اور کیا کروں.....؟“ اس کا ضبط جواب دینے لگا تھا۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانا اس کے کس میں نہیں رہا تھا۔ وہ جڑ سے پھینچ کر مارتے دیکھنے لگا۔

”زندگی صرف اپنے لیے جینے کا نام نہیں ہوتا گی۔ اتنا کچھ سوچ لیا تھا تو یہ بھی سوچ لیج کہ ”چند سالوں“ کا سب کو کیاریزن کس کر دی؟“ اس نے استہزاء سے لہجہ میں پوچھا تو وہ بوکی کھڑی آئی۔ آنسو بہا رہی۔ وہ کوفت کا شکار ہونے لگا تھا۔

”رونے سے کسی مسئلے کا حل نہیں نکلتا میر۔“

”وہ ابھی بہت پر اہم میں گھر اہم ہے۔“ وہ بہت شکستہ دل ہو رہی تھی۔

معید نے اپنی مضطرب کیفیت کو دباتے ہوئے جتانے والے انداز میں کہا۔

”اس کے پر اہم سے تم اپنی طرح واقف ہو گی تمہارا خیال اسے بہت بعد میں آئے گا۔“

معید کا سخت خاندانہ اثر تیر کی طرح اس کے دل میں کھتا تھا۔

”عمر ایس نہیں ہے اور پھر انسان کی زندگی میں ہر چیز کی ایک الگ اہمیت ہوتی ہے۔ ایک وقت میں کسی اور چیز کو توجہ دے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ میری پر اہمیں کرتا۔“ وہ سخت ابرو بولی گی۔

”ہن.....“ وہ نخوت سے بڑھا انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ تنفر سے بولا۔ ”تو پھر انتظار کرو کہ وہ دوسری ”چیزوں“ سے کب فارغ ہوتا ہے۔“ اس قدر تنہی و ترشی برداشت کرنا بھی کے کس کی بات نہیں تھی سو وہ جواب میں ایک لفظ بھی کہے بغیر اس کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

چند منٹ بعد بوکی تھیں پھینچنے کھڑی رہنے کے بعد طول سانس لے کر اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے اس نے پر سکون ہونے کی کوشش کی گی۔

”لعنت ہے مجھ پر ہر بار اس سے مایوس ہونے کے بعد اسی شخص سے مدد مانگنے چلی جاتی ہوں۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف برکتی ہوئی خود کو کوس رہی تھی۔

معید سے ہونے والی گفتگو نے اس کے ذہنی خلفشار کو بڑھا دیا تھا۔ اسے ہمیشہ کی طرح معید سے مدد مانگنے پر ناسف سمجھنے لگا تھا۔

”ہیلو ڈسٹر سٹریٹ۔“ فی دی کے سامنے راجمان وہ جہان نے اسے روک لیا تو ذہنی پراگندگی کو دور کرنے کی خاطر وہ اس کے پاس بیٹھی۔

”سانے کیا حال آپ ہے ایگزیکٹو کی ٹینشن میں مبتلا ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ذہنی تالافتی نہیں ہوں میں۔“ اس نے اپنا ذہن بنانا چاہتا تھا۔

”میر حال کسی بھی کیوں نہ ہو آپ مجھ سے بلا ٹھیک رابطہ کر سکتی ہیں۔ میرے تعویذوں سے بڑی بڑی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔“ وہ اتراہٹ آمیز لہجہ میں بولا تو تنہی نے اسے گھبرا کر دیکھا۔

”تم نے تب سے تعویذ گننے کا کام شروع کر دیا ہے؟“

”میں نہیں میرے بابا جی جھنڈے والی سرکار نے یہ گراماٹ دکھائی شروع کی ہیں۔“ وہ بڑی عقیدت سے کہہ رہا تھا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو دینی پھینڈنے والی سرکار کون ہے؟“ بھئی نے تھیرے سے پوچھا تھا۔
 ”بڑی کرامت والے بابا جی ہیں ایسے تو بڑے پتے ہیں کہ ہر مشکل منٹوں میں اسان ہو جاتی ہے۔“ وہ مسکراہٹ
 دہاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بھئی نے متاسفانہ نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”کیوں اٹنے کیلئے چکر میں پڑ رہے ہو۔ ایسا بکوتا دیا تو ساری کراتیں بھول جاؤ گے۔“
 ”بہر حال میری آفر بدستور ہے۔ ایسا نورانی سرمایہ کمال کا کہہ بیٹھ دیتے ہوئے کھلی کتاب سامنے دکھائی دے
 گی۔“

”ہاں جی اب نورانی سرے ہی کے ذریعے تو کالے کارنامے ہوں گے۔“ بھئی نے طنز کیا تو وہ ڈھٹائی سے بولا۔
 ”مجھوری میں شب جائز ہوتا ہے جی۔“
 ”خیر مجھے تو کسی کوئی مجھوری نہیں ہے اور نہ ہی میں اتنی ملاقاتی ہوں کہ مجھے ایسے شوٹے کی ضرورت پڑے۔ البتہ
 تمہیں ضرور اس نورانی سرے کی ضرورت پڑے گی کیوں کہ ابوبی کے سامنے جاتے ہی تمہاری آنکھوں کے آگے
 اندھیرا چھا جاتا ہے۔“ بھئی نے اسے دھمکا دیا تو وہ ہنسنے لگا۔
 ”بھئی اتنی ہی توجہ سے پڑھ بھی لیا کرو۔ پڑی انجیل شربت رکھی ہے اور کام تمہارے لائن میں جیسے ہیں۔“ بھئی اٹھ
 کھڑی ہوئی۔
 ”آپ سے تو اچھا ہی ہوں پڑھائی میں۔ ہمیشہ میرا گریڈ آپ سے بہتر میں ہوتا ہے۔“ اس نے جتایا تو وہ بھی اسے
 چرانے والے انداز میں بولی۔
 ”اب کی بار دیکھیں گے۔ میں تو آپ کرنے والی ہوں۔“
 ”مالا لاتی میں۔“ وہ جان نے شرارت سے لقمہ دیا تو وہ مسکراتا رہا۔ اب اسے گھورتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی
 آئی۔

تنہائی پا کر پھر سے وہی مایوسی اور شرموگلی اس پر غلبہ کر گئی۔
 کھانا کھانے کے بعد دل کا عجب حال ہے
 ہمیں اب ہر پل تیرا ہی خیال ہے
 مجھ سے یہ مجھ سے یہ ہمید بھی کھلا
 تنہائی غناب ہے وحشتوں کا جال ہے
 تیرے ہجر نے بے حال کر دیا ہے مجھے
 رگ رگ میں برپا دھت ملاں ہے
 وہ غم حال ہی اپنے ہنسنے پر گر پڑی تمام خوشیوں کو جیسے پالست کی، منگل مار کر ذہن کے تاریک کونے میں دب گئی
 تھیں اور وہ ابوبی کے دھاروں پر بے دست و پا بہت ہی چلی جارہی تھی۔



”شکر ہے خدا کا کہ یہ بات سرے ہی سے ختم ہو گئی ہے۔ میں تو پہلے ہی اس رشتے کے حق میں نہیں تھی۔“ تانی جان
 نے اطمینان سے کہا تو اس نے بھی اس حقیقت کو اجرت نہ لکھ لیا۔
 ”آپ کو کیا اعتراض تھا بھائی؟“
 ”اعتراض کیا ہوتا ہے مگر میں نے ہمیشہ معید کے لیے اپنی ہی کو سوچا ہے۔ کیوں نہ رہے؟“ تانی جان نے مسکراتے

دوے چینی جان کا عندیہ لینا چاہا تو وہ کھل اٹھیں۔
 ”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“
 ”مبارک کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کہ نہیں تھی۔“
 ”معید بھائی کے لیے؟“
 ”ہاں بالکل۔“ تانی جان مطمئن تھیں۔

گھر اس خوش خبری سے صبا کو زیادہ خوش نہیں کیا تھا۔ معید اور بھئی کے آپس کے تعلقات سے وہ بہت اچھی طرح
 واقف تھی۔

”آپ نے معید بھائی سے پوچھا ہے؟“
 چینی جان کے جاتے ہی مبارک کی گند بکھڑا کرنا شروع ہو گیا تھا۔
 ”اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آج تک اس نے میری کوئی بات کب مانی ہے۔“ وہ بڑے مان سے کہہ
 رہی تھیں۔ صبا بھائی آ گئی۔
 ”کوئی عام سی بات یا فرما کر نہیں ہے جو سر جھکا کر فرمانبرداری سے پوری کر دیں گے زندگی بھر کا معاملہ ہے۔“
 ”بھئی میں کیا ترخانہ ہے؟“ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا تو اس نے ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے کہا۔
 ”یہ تو آپ معید بھائی سے پوچھیں نا۔ دم نہ توڑتی ہیں ان کی آپس میں۔“
 ”کر نرن کے درمیان پھولے سوئے لڑائی جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اور پھر میں نے تو کبھی معید کو اس سے
 کوئی فضول بات کرتے نہیں دیکھا۔ تو ان کی جھگڑے کی بات کر رہی ہوں۔“ انہوں نے استعجاب سے اسے دیکھا تو وہ
 بولی۔

”مجھے پتہ ہے نا معید بھائی مذہبی معرکے کی ان سے ذرا بھی نہیں آتی۔“
 ”جب یہ رشتہ طے ہوگا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہر شے کی اپنی ڈھیلاڑھتی ہے۔“ وہ ہنوز پرسکون تھیں۔
 ”بہر حال آپ اکلور درمیان میں لائے بغیر معید بھائی کی مرضی ضرور معلوم کر لیجئے گا۔“ صبا نے انہیں مشورہ دیا تھا۔
 ”ان دو درمیان میں میں لائے بغیر کیوں؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگیں۔
 ”وہ تو ایک بار کہہ دیں گے اور معید بھائی فرمانبرداری سے سر جھکا دیں گے۔ اس لیے کہہ دیں ہوں کہ ان کی مرضی کا
 فیصلہ کیجئے گا۔“ صبا نے سمجھواری کا مظاہرہ کیا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ پھر قدم سے پریشانی سے بولیں۔
 ”میں نے تو زہرہ سے بات بھی کر لی ہے۔“
 ”وہ بعد کی بات ہے۔ وہ بھی تو ضروری ہے پوچھنے کی بغیر فیصلہ کر سکی اور اس کے تیوروں سے مجھ سے بہتر
 طور پر اور کون واقف ہوگا۔“ صبا نے انہیں تسلی کی۔
 ”خدا کرے کہ دونوں ہی جانیں جوڑی تو بہت اچھی ہوگی ان کی اور پھر گھر کی بچی کے ساری عمر کے لیے معید کی
 طرف سے مجھے سکھ رہے گا۔“

انہوں نے دعا کی تو مبارک سے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”واقعی جوڑی تو بہت اچھی ہے۔“
 ”تم جی سمجھانا کی کو۔“ انہوں نے صبا کو مبارک تو اس نے یونہی اثبات میں سر ہلادیا۔ ابھی اظہار کا وہانی کے پردوں پر
 اے جانے والے اس کے کمرش کہاں بچھوئے تھے۔ معید حسن کا تو نام ہی اس کے کردہ قیامت لگے تھی۔

”میں تو سمجھا ہی دوں گی مگر فیصلہ ان دونوں ہی کا ہوگا۔ ایسے معاملوں میں کپڑوں پر سے کام نہیں چلتا۔“ صبا نے جھپکے سین کر کہیں والی پلٹ اٹھائی اور رام سے ہنسی چکن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بھی کسی سانس بھر کے رو گئیں۔



میرے چارہ گر
میرے سردی تھے کیا خبر
تو میرے ستر کا شریک ہے
تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ تک
وہ جو تھکے ہوئے ہاتھ کا حفاظت
کئی مہینوں میں بدل گیا
اسے ناپے اے کانے، میرا سارا وقت نکل گیا
نہیں جس پر کوئی نشان یا
میرے سامنے ہے وہ گھر گھر
میرے چارہ گز میرے سردی تھے کیا خبر
یہ جو ریک وقت فریب ہے
میرے راستوں میں بھی ہوئی
کسی کو نہ یہ پتہ کہ کہیں
یہ نورات سے میرے چاروں
گھر اس کی کوئی تحریریں
نہی چھاؤں سے نہ ہو کوئی
میں نے چھان دیکھا ہر حجر
میرے چارہ گر
میرے سردی تھے کیا خبر

عمر سے اس کی ملاقات پہلا پیپر آف ہونے کے بعد کینے میرا میں ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ خود پر سے ضبط کھوئے مگر بھرائی ہوئی آواز میں اتنا ہی شکوہ کر سکی۔
”بہت برے ہو تم عمر۔ اتنا نہیں ہو سکا کہ مجھے خون ہی کر دیتے۔“
وہ اتنا شکایت اور کم زور لگ رہا تھا کہ اس سے لڑ بھی نہیں پائی۔
”میری تو خود کچھ مجھ میں نہیں آتی۔ یکانخت ہی زندگی نے جتنی سلتگی دھوپ میں لاکھڑا کیا ہے۔“
اس کی آنکھوں میں ضحیک سرخیال اترنے لگیں تو ”جی“ بھی رو دی۔
”انگل کی ڈی۔ جھ کا مجھے اتنا صدمہ ہوا ہے اور تم تمہارا تو ان سے رشیدی اور تمہا۔“
”جو قدر میں لکھا ہے وہ تو جو صلے سے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے جی۔“ شاید اس سے جی نے زیادہ اپنا حوصلہ بڑھایا تھا۔
جی نے دیکھا اس کے چہرے کی سرخی کے ساتھ ساتھ آنکھوں کی چمک بھی ماند پڑ چکی تھی۔

”تم جو حوصلہ کر گئے تو اب سب کی بھی ہمت بندھے گی عمر۔ اب تو سہی ان کا سہارا ہو۔“ تسلی کے لفظ کہتے ہوئے وہ ڈوٹا بدیدہ ہوئی گی۔

”ہوں۔۔۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بات بدل گیا۔
”بیچہ کیسا ہوا ہے تمہارا؟“

”گزرے دنوں بچھا تخی فیشن رہی ہے کہ پیپر ز دینا ہی قسمت ہے کہا اچھایا ہوا۔“ وہ زور لگی کا شکار تھی۔
”دو سال کی محنت کو یوں ضائع مت کر دوںی۔ پوری توجہ سے پیپر ز دو۔“ وہ جھجک سے اسے سمجھا رہا تھا۔
”یہ میرے بس میں تو نہیں ہے عمر تمہیں سوچنے کے لیے مجھے شعوری کوشش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تو میرے لیے کوئی ضروری ہو جیسے زندہ رہنے کے لیے سانس۔“ وہ نے اختیار بولی تو وہ اسے لی انور کو لگا۔
”کوئی کسی کے لیے اتنا ضروری نہیں ہوتا جس تم از کم اتنا تو زندگی نے پچھلے دنوں مجھے بہت اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ شیشوں میں بکڑے سانس پتہ کو دیکھ کر میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ اگر آپ نہیں کچھ ہو کیا تو میں مر جاؤں گا یہ میں تو میری سانس چل رہی ہیں مگر وہ نہیں۔ میں زندہ ہوں سانس لے رہا ہوں۔“
اس کا بچا اس قدر خچ تھا کہ وہ ششدر رہ گئی۔

کس قدر بائیں اور شکستہ دل ہو چکا تھا وہ جیسے اپنی زندگی بار چکا ہو۔

”عمر! اسے تم زور مت پڑو تم تو پہلے مر چکے ہو۔“ وہ لوگ تو جانے کیسی کیسی مصیبتیں کاٹ کر بھی حوصلہ نہیں ہارتے۔“

اس کی آنکھوں میں اتر آنے والی سرخی کا دل جیر رہی تھی۔

گنتا مجبور اور بے بس پاتے ہیں آپ خود کو جب آپ کے پیارے کسی شدید دکھ میں مبتلا ہوں اور آپ ان کا زور برابر دیکھ کر خود میں نہ سو سکیں۔

جی بھی اسی تکلف و نہایت میں مبتلا تھی۔

مگر عمر کو اب ان طفل تئیسوں کی شاید ضرورت نہیں تھی وہ بہت کچھ سوچ سمجھ کر اس سے ملنے آیا تھا تبھی تو اپنے لب و لہجے پر قابو پا کر یہ بتاتا ہے انداز میں بولا۔

”اب وہ وقت آ گیا ہے جی کہ میں تمہیں ہر بندھن پر وعدے سے آزاد کروں۔ زندگی بہت مشکل ہو چلی ہے جی“
اور میں تمہیں کانوں پر نہیں ٹھیکے سکتا۔ میری طرف سے تم بالکل آزاد ہو۔“

اسے اپنے سر پر پہنا زونفا محسوس ہوا تھا۔

آنکھوں کے سامنے اتنی تیزی سے دھند چھائی کہ اس کے نقوش گڑبڑ ہونے لگے۔ کس قدر پر یکایک اور صاف گو شخص تھا وہ۔

حکمراتی صاف گوئی۔۔۔۔

سنگدلی اور سرفا کی کے زمرے میں نہیں آتی تھی کیا؟

وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا؟

آسان شائستہ کی بھوکی آواز کو تو ایمان سمجھنے والی؟

”اگر تمہیں کسی سے سرخی کی جو ہو رہی ہے تو صاف گھٹاؤں میں کہو عمر۔ میں تو ہر حال میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

"ابھی یہ میڈیسن کے زیر اثر ہے مگر جا کر چند گھنٹوں کی ٹینڈل لگی تو فریٹس ہو جائے گی۔"
اس کے سنے ہوئے چہرے پر نظر ڈال کر گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے معینہ نے انہیں تسلی دی تو وہ بھی دوسری طرف سے ہو کر اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ صبا اس کی گاڑی میں تھی۔
"تم سے کوئی بات نہیں کی اس نے؟" گاڑی اشارت کرتے ہوئے معینہ نے اچھٹی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے ہر پر انداز میں پوچھا تو وہ حیران ہو کر بولی۔

"کما مطلب، کسی بات؟"
"کوئی؟" ابھی کیا وہ کچھ پریشان تھی آج کل؟ "وہ عام سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔"
"پریشان تو نہیں کی یا نکل نہیں۔ صبح بھی بالکل اچھی تھی پیچھے دے گئی تھی۔ یہ تین دن آخری غراب حالت کیسے کر لی۔"
وہ وہ بھی اچھی ہوئی تھی اور اس کے لیے سے معینہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جموت نہیں بول رہی مگر عموماً لڑکیاں ایک اسے سے اپنی کوئی بھی پرل بات نہیں چھپاتی ہیں، ای بات کے پیش نظر معینہ نے کہا۔

"اور بھی کچھ شہر نہیں کیا اس نے تم سے؟"
"اور وہ اپنی ہر بات کو مجھ سے تکررتی ہے۔" اس نے قافتر کے کہا تو قدرے توقف کے بعد معینہ نے پوچھا۔
"اور وہ جو پروپوزل تھا اس کے بارے میں کیا خیال تھا اس کا؟"
"خیر! خیال! یاد آئے پروپوزل کے بعد وہ رے بچکانی تھی۔"
"وہ مضامند نہیں تھی، کتنی تھی کیا بھی بڑھنا جانتی ہے۔"
صبا کا خیال تھا کہ تائی جان جی نے بھی کا پروپوزل اس کے سامنے پیش کر دیا ہوگا تبھی موصوف بھی کے دل کا حال جان

لے رہے ہوتے ہیں۔
"وہ اسے اس پروپوزل کو لے کر وہ بیمار نہیں ہوئی ہوگی۔ وہ تو شکر رہی تھی کہ آپ نے اس پروپوزل کو رد کر دیا۔"
"صبا نے مزید بتا کر اس کے خدشات دور کرنے کی کوشش کی۔
"مگر کیوں؟" وہ بہت دوستانہ انداز میں کچھ لگوانے کے موزن تھا۔
"وہ تو مجھے نہیں بس اپنی اہل و عیال و ہواشای نہیں کرتا چاہتی۔ شاید کچھ سالوں تک۔"
اس کی زبان پر کھل گئی تو بے اختیار معینہ کی طرف دیکھا کہ وہ اس کے الفاظ پر جو کچھ بغیر نظر اسکرین کے پار نظر اس

ماہے ہوئے تھا۔
"اس کی کوئی خاص وجہ؟" اس نے پوچھا تو صبا کو اندازہ ہوا کہ وہ اتنا بے خبر تھی نہیں جتنا کہ وہ اس کو سمجھ رہی ہے۔
"یہ تو مجھے بھی نہیں پتہ۔" اس نے صفائی سے کام لیا تھا۔
اور سوچ میں سر ہلا کر رہ گیا۔ صبا نے جتنیوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی مگر کوئی اندازہ نہیں لگا
"اور وہ بھی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے تھی سے متعلق سوچنے لگی۔
"ایک ایک جیسے میں اس کی حالت بگڑتی چلی رہی تھی۔
چنی جان سے مستحکم جانے نماز سنبھال رہی تھی۔
"میری ہی نظر لگ گئی ہے میری ہنسی کتنی بچی کی۔"
اس کے آنکھیں کھم کھم رہے تھے کبھی کی پریشانی حد سے سوتھی۔ لے دے کرب کو بچہ بڑی کی ٹینڈن کا خیال آتا

تم تو عزم والے ہو
بلا کا ضبط رکھتے ہو
نہیں کچھ بھی نہیں ہوگا
مگر دیکھو!
جسے تم چھوڑے جاتے ہو
اسے تو ٹھک سے شاید
بچھڑا بھی نہیں آتا
سُنو!

تم تو عزم والے ہو
اسے مت چھوڑ کے جاؤ
اس کے لب خاموش تھے مگر اس کے ہر آنسو نے پکار پکار کر کہا تھا مگر وہ جانے والا کبھی گونج نہیں ڈاگایا تھا۔
کبھی جانے والوں کے پیچھے نہ جانا
کبھی آنے والوں کا رستہ نہ تنگنا
کر ان جانے والوں کو
آتا نہیں ہے
اسے سب کچھ تم ہوتا محسوس ہوا تھا۔

♥ ♥ ♥
صبا کی خون کال پر وہ پریشان سازا مارا مجاہد کے اسپتال میں پہنچا تو وہاں اس پہلے ہی سے موجود تھا۔ ساتھ تائی جان اور صبا بھی تھیں۔
"خیر بت تو ہے.....؟" وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھتا ہوا اسے دیکھ کر وہ ہمیشہ کی طرح مطمئن ہونے لگا۔
"پارٹی کی طبیعت کا چابک بہت بگڑ گئی ہے۔ بی بی خطرناک حد تک ہو گیا ہے۔"
"کب..... کیسے؟" اس کی پریشانی فطری تھی۔
"یہ تین دن آخری غراب حالت میں جانے والی ہوئی تھی۔ گھر تک کیسے آگئی۔ ٹھنڈے پیسیوں میں نہ پانی ہوئی ہاتھ پاؤں بالکل بے جان۔" صبا نے اسے بتایا تھا۔
پریشانی بچانے کے لیے وہ اس کے ہمراہ ڈاکٹر کے دم کی طرف بڑھ گیا۔
"اس عرصہ میں عموماً لڑکیوں کو ڈاکٹر ڈاکٹر کی بات ذہن پر لینے کی عادت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے بھی پیچھے زکی شہر
لی ہو۔" ڈاکٹر زارا مجاہد قدرے مسکرائی تھیں۔ پھر پروپوزل انداز میں بولیں۔
"اب اس کی کنڈیشن بہت بہتر ہے۔ اسے پیش فرمی رکھیں اور دندہ بارہا دیکھی براہم ہو سکتی ہے۔ آپ اسے گھر
جاسکتے ہیں۔ تھوڑی سی، ایک تھیں سے مگر براہر کیریز اینڈ ڈائنٹ سے بالکل فرادہ ہو گئی۔"
وہ پتہ نہیں کیا کچھ سوچتا رہا جب تک اس ڈاکٹر کے لفظ کو بغور نہ سنا تھا۔ معینہ اور صبا نے اسے مبارکبادیں دیں۔
میں، صبا تھا۔ معینہ نے دیکھا چند گھنٹوں میں اس کی ساری شادابی میں کھنکھن کر رہی تھی۔
وہ بے حد خاموش اور جاگزیں تھی۔ یہی بات تائی جان کو بھی پریشانی کر رہی تھی۔

”اتنی لائق تو ہیں ضحیٰ! آپ انہیں پیپرز کی ٹینشن لینے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“ صرہ کو اعتراض ہوا تھا جو کہ سو فیصدی سچ تھا۔ بہت محنت کیے بغیر بھی وہ اچھا گریڈ لیتی رہی تھی۔

”بھڑا میں جائے یہ پڑھائی میری بچی کیوں سر پر سوار کر لیا ہے تم نے اسے۔“ اس کی طبیعت قدرے سنبھلی تو بچی جان نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”یہ صرف میری شادی کی ڈیٹ آگے بڑھانا چاہ رہی ہے اور کچھ نہیں۔“ انس نے بڑے غور و خوض کے بعد اندازہ لگایا تھا۔

”ضحیٰ! اب جلدی سے تندرست ہو جاؤ تاکہ انس کی شادی کی ڈیٹ فکس کی جاسکے پہلے تو تمہارے پیپرز کی وجہ سے لیٹ ہو رہے تھے اب تو ان کا بھی ڈر نہیں اگلے سال سہی۔“ تانی جان نے اپنے مخصوص محبت بھرے انداز میں کہا تو وہ بے جان نظروں سے ان سب کو دیکھنے لگی۔ یہ سب جو اس کے اپنے تھے مگر وہ تو سب سے زیادہ اپنا لگتا تھا۔

پھر کہاں چلا گیا وہ؟

زیست کے اس سفر میں کب کہاں وہ کون سا موڑ مڑ گیا۔ وہ کیوں نہ جان پائی۔

کتنا سہل جانا تھا
خوشبوؤں کو چھو لینا
شام کا ہر اک منظر
گھر میں قید کر لینا
روشنی ستاروں کی
مٹھیوں میں بھر لینا
جگنوؤں کی باتوں سے
پھول جیسے آئین میں
روشنی سی بھر لینا

اسے نظر کی خوش فہمی اس طرح نہیں ہوتا، تیلیاں پکڑنے کو دور جانا پڑتا ہے اس کے اندر سے تکلیف کا شدید احساس اٹھانے لگا تو اس نے آنکھیں موند کر اپنے تاثرات سبھی سے چھپانے کی سعی کر ڈالی مگر اس کی آنکھوں کے کناروں سے ٹپکتا پانی کسی سے بھی مخفی نہیں رہا تھا۔

”کم آن ضوکی..... یار ہمت پکڑو ہم کون سا پیپر زندہ دینے پر تمہیں ڈانٹنے والے ہیں۔“ عماد نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے دلجوئی کی تھی۔

”اتنے سارے محبت کرنے والوں سے ایک شخص کی بے وفائی کا بدلہ کیوں؟ اس کا دل ہسکتے لگا تھا۔“

”مگر اتنے سارے محبت کرنے والوں کے ہوتے ہوئے بھی اس دل سے جینے کی امنگ کیوں ختم ہوئی جاتی ہے۔“

وہ اپنی اندرونی اکھاڑ پھچاڑ سے نڈھال ہو رہی تھی۔

صبا نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

”اب بس کرو تا مچی۔ ذرا بھی مزہ نہیں آ رہا تمہارے بغیر۔“

اس کی آنکھیں بھگتے لگیں۔

اور یہ ان سب کی بے پناہ محبتوں ہی کا اعجاز تھا کہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی۔ اور جب وہ اپنے تئیں خود پر بے حس و

لہذا وہ چہا جی جی تب معید حسن اس کے ذمہ کر دے آؤ موجودہ۔

نیم تاریک کرے میں وہ بکے سے ٹیک لگائے اپنے بستر پر نیم درازم تھی۔

معید حسن کی موجودگی کو محسوس کرنے کے باوجود وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی البتہ جب اس نے آگے بڑھا

لاشعاً ان کی تب اس نے ناگواری سے ضرور دیکھا تھا۔

”کسی طبیعت سے اب تمہاری؟“

وہ یونہی بہتا ہوا انداز میں اسے دیکھتی رہی تو وہ کرسی چھوٹ کر اس کے بستر کے پاس رکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔

”ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اب تم بالکل ٹھیک ہو مگر تم نے کیوں بستر سنبھال رکھا ہے؟“

ایک سرسری نگاہ ہی میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چند دنوں کی بیماری اس کی ساری دلکشی و نشاطانی نچوڑے گئی تھی۔

”میں بات کی ٹینشن لے رہی ہوں۔“ اس نے کادوانی کا پروڈولز تو بکثرت ہو چکا ہے۔“ اس نے اپنی بات کہہ کر کئی

رجل دھکیٹنا چاہا مگر وہ ہنوز جلد و سکتا نہیں تھی۔

”تمہاری وجہ سے سارا گھر ڈسٹر ہے مگر تمہیں کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔“ گھر میں تمہیں کسی بھی مسئلہ کا سامنا

نہیں ہے پھر تم اپنے مسئلے سے ان سب کو کیوں پریشان کر رہی ہو؟“

اب کی بار اس نے قدرے سختی سے پوچھا تو وہ جیسے بھٹ پڑی۔

”تم ہر لمحہ میری کوسلیں اپنی دلالت کی صلاحیت استعمال کرتے آ جاتے ہو۔“

”کیوں کہ تم خود ہی ٹھیک ہو نہ تھیں چاہئیں اور یہ بھی کہ تمہیں صرف اپنی پروا ہے نہ کسی کی پریشانی کی اور نہ غما

ڈسٹرشن کی۔“ وہ رسان سے کہہ رہا تھا۔

”میں نے کسی کو ڈسٹر ہونے کو نہیں کہا ہے۔ اور تم..... خدا کے لیے معید مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ وہ جیسے دنیا بھر سے

اکٹا کر بولی تھی۔

”میں تو میں پوچھتا چاہتا ہوں کہ تمہارے دل میں اکیلا رہنے کی خواہش کیوں پیدا ہونے لگی ہے؟“

وہ اب بھی ہمیشہ نرم نہ تھیں میں پوچھ رہا تھا مگر اس سوال کے جواب میں کئی کے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہونے لگا

تھا۔

”معید حسن! تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔“ سیدھی ہو کر بیٹھے ہوئے وہ بہت سختی سے بولی تو انداز بھی تھا جیسے اسے دل

ہوا جانے کو کہہ دیتی ہو مگر اس کی آواز میں اتنی ہی حید تھی جتنی ہنسنے پر لگی۔

”ایک ہی جہت تلخ ہے ہونے لگی باتیں منجھکاؤ پر لگی ہیں میری۔“ وہ جیسے اس کی بچکانہ بات سے لطف لے

ہوئے منگرایا تھا۔ پھر اسے یاد دلانے والے انداز میں بولا۔

”اور پھر تم نے خود ہی تو مجھ سے مدد طلب کی تھی۔“

”مجھے نہ تو کسی مدد کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی توقع ہے کسی مدد کی۔“ وہ سختی تھی مگر وہ اس کے غصے کی پروا کیے

بغیر اطمینان سے بولا۔

”کہا بات ہوئی ہے تمہاری عمر سے؟“

اس کے دل کی تاروں پر بہت اوچھا ہاتھ پڑا تھا۔

یہ تاہم یہ سوال.....

نکتنے ہی دن لگے تھے اس ٹینشن سے آزاد ہونے میں۔ اور جب بدقت تمام وہ اپنے کمرے کی کرسی و جوا

میں بہت کمرنگی کی طرف لوٹنے کی قیاسی سوال پھر اپنی پوری سفاکی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

اشتعال کی شدت پر ایک بل ہی میں بے چارہ اور بے بسی حاوی ہو گئی تھی۔

”کچھ نہیں کہا اس نے کچھ نہیں۔“

اس نے غصت انداز میں کہتے ہوئے ٹخنوں کے گرد بازو لپیٹ لیے۔

اس کی آنکھوں میں جھنجکی کی اور بے لکڑی آرزوئی معید کے لیے بہت چوڑے نکال دینے والی بات تھی۔

”میری پریشانی میرا دوسرے۔“ مجھے تم سے کسی بھی قسم کی مدد نہیں چاہیے۔ میں اپنے مسئلے کو حل کر سکتی ہوں۔“ وہ

برائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

معید نے چاچتی نظر دے اس کی سپید پرتی رنگت دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم جس مسئلے میں ابھی ہو وہ صرف تم پر چھوڑ دینے والا نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہیں کوئی بے وقوفانہ فیصلہ کرنے کی

اجازت دے سکتا ہوں۔“ اس کا انداز سراسر کج رہائی والا تھا مگر جانے کس لفظ نے اس کے دل پر اتنا شدید اثر کیا تھا کہ وہ

اب پریشان پڑی۔

”ہر کوئی اپنے مسئلے کا اپنی پسند اور مرضی سے حل کرتا ہے۔ تم مردوں کے پاس عقل کی باور آفاٹا نہیں ہے کہ عقل

میں اور عقل فیصلے میں تمہیں کر سکتے ہو۔ کیا لڑکیوں کا اپنی زندگی پر اتنا بھی حق نہیں ہوتا کہ وہ خود سے متعلق ایک بھی فیصلہ

کر سکیں۔“ لوگ لوگ تم کو ایک فیصلہ کرتے ہوئے صرف اور صرف اپنی ذات کو مد نظر رکھتے ہو۔ اپنی پسند اور مرضی اپنی

لڑکیاں۔“ پانی بہتے چڑ بڑ انسانانہ بے وقعت سے تم لوگوں کے لیے تم لوگوں فیصلے کی زندگی پر کیا اثر ڈالتا

ہے اس سے تمہیں کچھ غرض نہیں ہوتی مگر میری نظر میں تم لوگ بڑل ہو رہا۔“ اس کا غصہ بڑھتے ہوئے اشتعال کی

مدد کو چھوئے لگا تو ہسٹریائی کیفیت کا شکار ہوتے ہوئے وہ بے یقینت ہی جھنجکی لے۔ ہاتھ مار کر اس نے سامنے ٹھیل پڑھا

پانی سے بھرا کھنکھی زین پر گر کر اٹھا تھا۔

اس کے اس قدر غیر متوقع مگر شدید رد عمل پر مضبوط اعصاب کا مالک معید حسن بھی کمر بڑا گیا تھا۔ اس پر مستزاد

راز پر کھولی کر جانے کو ان کو ان کا اندازہ کیا تو وہ اپنی پوزیشن کو اور دیکھیں کرنا تھا کھڑا ہوا۔ معید کے اندر اشتعال کی شدت یہ

پہاڑی تھی جس کے زیر اثر اس نے کسی کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے جھک کر اس کا بازو ہاتھ میں جکڑا اور ایک بھر پور پھینسا

کے۔“ تم ہو مارا۔“

معید کا رد عمل اس قدر غیر متوقع تھا کہ کبھی انفوس بے یقینی کے عالم میں کھڑے رہ گئے تھے۔

”یہ..... کیا ہو رہا ہے معید؟“

مائی جان کو سب سے پہلے ہوش آیا تو انہوں نے تڑپ کر آگے بڑھتے ہوئے سختی کو سینے سے لگا لیا جو ہسٹریائی

ذہنیت سے نکلنے کے بعد اب روٹنے لگی تھی۔

”آئی ایم سوری مگر یہ بالکل باطل ہو رہی تھی۔ اور اسے خواہش میں اس کا یہ واحد حل تھا۔“

وہ ڈراہنی آپ آپ کو سنبھال گیا تھا۔ اس قدر پرسکون انداز میں اپنی غلط حرکت کی توجیہ پیش کی کہ کبھی کے خدشات

پل ہو گئے۔

”جانے کیا ہو گیا ہے میری بچی کو۔“ چچی جان بھی رونے لگی تھیں۔

”ٹھیک ہو جائے گی یہ۔“ لڑکیوں کی عادت ہو گئی ہے ڈراؤنا سی بات کو لینشن بنا کر یونہی بستر سے لگ جاتی ہیں۔“

لگتی لگتی وہاں جان کے سینے میں منہ پھپھانے کی جھنجکی پڑا لے ہوئے وہ صبا کی طرف پلٹا تھا۔

”اے ایک ٹیلیٹ دوتا کاس کے اعصاب پر سکون ہوں اور نہ بات بے بات یونہی چلائی رہے گی۔“
اسی اطمینان سے مشورہ دیتا دھرے کر سے نکل گیا۔ دھڑکی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ذلت کا احساس رگوں کو کاٹنے کا
تو وہ پھر سے رونے لگی۔



”اے سہیلی! شام انجوائے کی جارہی ہے۔“
وہ اشارہ کر کے باہر آیا تو وہ سب لانا میں موجود تھیں۔ موسم کافی خوش گوار تھا اس لیے نگین اور ادینہ نے شام کی
چائے کا انتظام لانا میں کر رکھا تھا۔
”تمہیں کس نے روکا ہے۔ تم بھی آ کر انجوائے کرو۔“ ادینہ نے اس کے لیے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے
دعوت دی تو وہ اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا۔
”وہ تو میں کر دیا گا، کرسی کے موسم میں اگر کبھی ایسی شام آئے تو اس کو انجوائے نہ کرنے والا بدذوق نہیں بلکہ گناہ
گار ہوتا ہے۔“ اس نے ادینہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔
”کیا ہم بھی لیں؟ میں نے سننے پر لپٹے سے بنائے ہیں۔“ نگین نے پرشوق انداز میں کہتے ہوئے کہا کہ اس والی
پلیٹ ٹوفل کے سامنے کی تو اس نے منہ بند کر کوخفیفی جیش دے کر مسکراتے ہوئے ایک کباب اٹھا لیا۔ اس کے
کباب ختم ہونے تک نگین اسے امید بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ تو قے تو یہی تھی کہ اب وہ تعریف کرے گا۔
”کیسا تھا؟“ بہت اشتیاق سے پوچھا تو وہ منہ بنا کر بولا۔
”وہ اتنی جیسا پہلے ہوتا ہے۔“
”کیا..... یعنی آپ کو کوئی ہی محسوس نہیں ہوا؟“ سخت صدمہ پہنچا تھا۔
”میں فرق تو ہے۔“ وہ ایک اور کباب اٹھا کر دیکھتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر سادگی سے بولا۔
”پہلے تو اسے گول شیب میں بنائی تھیں اب چونکر بنایا ہے۔“
”آپ.....“ وہ دانت پیس کر رہ گئی تو وہ ہنسنے لگا۔
”یونہی غافل کر دیا ہے۔“ میں نے کہا بہت اوجھے بنے ہیں۔“ صالحہ بیگم نے اس کو تلی دی تھی۔
”جلی بھر کر روٹی تیار کی شادی تک تم کو نگ میں پر ریٹ ہو جائی گی۔“ ادینہ نے بھی اسے چپکرا تو وہ ٹوفل کی ٹپسی
پر کھسبات کا شکار ہوئے تھی۔

”جی نہیں میں اس لیے نہیں سکھ رہی ہوں سب۔“
”ہاں جی سرال میں تو یہ جھوک پڑتا لگ رہا ہے۔“ ٹوفل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”آپ تو میری سرال کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“ نگین نے ج آگئی تھی۔
”وہاں میں.....“ ٹوفل نے ساندھ مسکرا کر کہا کہ اب چاندرا چوہہ بن کے فلک پر اپنی تابانی نکھرنے لگا تھا۔
”تم جی چلو ٹوفل اس کی طرف جانے کا پروگرام بنانا ہے۔“ صالحہ بیگم کو یاد آ گیا تھا۔
”وہ کس خوشی میں؟“ اپنے اندر اٹھتے پہلے پھٹک کر خوشگوار سے احساس کے تحت مسکراتے ہوئے اس نے پوچھا
وہ بولیں۔
”وہ جو پتی سے ناچتی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کی عبادت بھی ہو جائے گی اور اسی بہانے
ان لوگوں سے مل بھی لیا جائے گا۔“



”نگین بھابی کے گھر والے کچھتے ہیں۔“ حمر نے آکر پر جوش انداز سے اطلاع دی تھی۔

”میرا وہاں کیا کام ہوگا؟“ اس نے اپنی غیر یقینی خاطر کیا جا چکی تھی۔
”کام کیوں نہیں ہوگا بھلا! بہن کی شادی ہو رہی ہے اس گھر میں۔“ بہنوئی کے ساتھ انھونیہ منہ سے تو دتی ہے مگر
اس کی عادت وغیرہ کا اندازہ ہو جائے گا۔“ کم گوئی زریہ بیگم نے اسے بھجایا تھا۔
”جی پیچھا آپ کا حکم سر آ کر قبول پر۔“ وہ بہت تابعداری سے بولا تھا۔
”تو پھر کل ٹھیک رہے گا۔“ صالحہ بیگم نے اطمینان سے کہا تھا۔
”ممانی جان! اب ٹوفل کا بھی کوئی بندوبست کریں بہت پھر لیا اس نے ادھر ادھر۔“ ادینہ نے اچانک ہی ایک نیا
باب کھول دیا تھا۔

”کیوں.....“ میں یوں آزاد اور خوش و خرم تھیں اچھا نہیں لگ رہا۔“ ٹوفل کا موڈ بہت خوش گوار ہو گیا تھا۔ ادینہ کو
حیرت کے ساتھ ہی اس کے بچنے سے بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس سے پہلے وہ اپنی شادی کے بند کر کے کو بیٹھ کر
مول انداز میں بات کر کے نکال دیتا تھا۔
”میں تو کبھی تھی کبھی کے ساتھ ہی اس کی بھی شادی کر دوں مگر یہ لاکھانے تو نا۔“ صالحہ بیگم نے میرا سے ٹوفل کو
دیکھا تو وہ دھڑکتے ہوئے کپ خالی کرتے ہوئے مسکرا دیا پھر شر شرکے میں بولا۔
”پہلے اس کو درخواست ہو لینے دیں۔ چار دن کھلی سانس لے لیں پھر کسی بولنے والے لٹو لٹو کے میں گے۔“
”ظوطا یطی.....؟“ نگین نے نظر اُپوچھا تھا۔
”چلو جو کم ہوگی لے لیں گے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا تو صالحہ بیگم ہنس دیں۔
”واقعی بھابی اب تو ٹوفل کے لیے بھی کوئی لڑکی ڈھونڈنی چاہئے۔“ زریہ بیگم نے بھی مشورہ دیا تھا۔
”میں تو آج ہی اس کی شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ سنی تو ہو۔“ انہوں نے کہا تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے
ساتھ بولا۔

”میں تو راضی ہی راضی ہوں۔“
”غیریت تو ٹوفل بھائی کیا بچ کدھر ہے؟“ نگین کا پتے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔
”بھئی.....“ وہ بھی تو نہیں کون ہے وہ خوش نصیب؟“
ادینہ کے دل میں دھڑک چڑھنے لگی تھی۔
”سب کی سنتے ہوئے وہ سن دیا تھا۔“
”آپ لوگوں کو تو میں کیا بات ہی چاہئے۔ فوراً اس کو بنایا دیکھو اب اس کا تیار کر لیتی ہیں۔“
”یہ بہت فضول شخص ہے ممانی جان اسے چھوڑیں آپ یہ بتائیں کہ اس کی طرف کب جانا ہے؟“ ادینہ نے
جانے کس بات کے محل جاننے کے خوف سے فوراً موضوع بدل دیا تھا۔
”کل چلے جاتے ہیں پھر ٹوفل جب تم فارغ ہو۔“ صالحہ بیگم نے کہا تو وہ بولا۔
”کل ہی ٹھیک ہے۔“ میں نام آپ بتا دوں۔“
”شام کو چلے جائیں گے۔“
زریہ بیگم نے کہا تو سب متفق ہو گئے۔

Aanchal + Decembe + 2004 112

”اب اتنا بھی سیدھا سادہ نہیں ہوں میں جتنا تم مجھے سمجھتی ہو۔“

اس کلب و لہجے کی ٹھٹھک اور بیز کوڑا بھی نہیں بھاری کی۔
ابھی کبھی پہلے ہی تو اس نے نونل کی نگاہ کو از حد وارفتگی کے ساتھ صبا کے چہرے پر ٹھٹھکا محسوس کیا تھا اور وہ نگاہ کو
پل پل اس کے چہرے پر جمی رہتی تھی جواب میں صبا کی گھبراہٹ اور سر اس کی ذہان جذبات و احساسات سے جا لبد تو نہیں
تھی ک نظر انداز کر دیتی۔

اس کے دل و دماغ میں خطرے کی جھنکی بج رہی تھی تو اس نے نونل احمد کے برابک انداز کا گہری نظر سے جائزہ لینا
شروع کر دیا۔ چائے کے دوران وہ باتیں تو عید اور اس سے کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ جھلک جھلک کر صبا کی طرف جاری
تھی۔ ایک ڈالٹا فریدی کی کیا کم کی جواب صبا میری.....
وہ اندر ہی اندر تھلا کر رہ گئی۔ حیرت تھی کہ نونل احمد بھی اتنا دل پھینک تو نہیں رہا تھا کہ یوں کسی لڑکی کو دیکھے
جاتا تو پھر یہ کیا تھا؟ اس سے گھر ہر سوچ کی ایندین سے خودی شدت کے ساتھ نفی کر رہی تھی۔

”نونل احمد میرا..... صرف میرا؟ اس نے زخمی سے سوچا تھا۔
”میں تو کبھی یوں کر تم کی لڑکی پسند کرنا تو تھاکہ گی کہ ساتھ ہی تمہاری شادی بھی ہو جائے۔ میرا گھر تو سونا نہ
ہو۔“

”مجھے کون سا لڑکی پسند کرنے کے لیے بیلوں دور جانا ہے اور پھر مجھ جانی یا بی بی اینے تو بے گھر ہیں۔ پھر کبھی تنہائی
اور سو پائیں۔“ وہ بڑی ہوشیاری سے بات پلٹ گیا تو حال ہی تک یہ لکھی سی سانس بھر کے کہ میں جب کہ لڑکی سیدھی سوچوں کا
شکار رہوئی ایندین سے دل کی گلی گلی تھی۔

کیا وہ اشارہ دے رہا تھا؟

اس نے دل ہی دل میں بار بار دہرایا تھا کہ اب وہ نونل احمد کے حواس پر اس طرح سے چھا جائے گی کہ اسے کسی اور
طرف دیکھنے یا سمجھنا اور سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملے گی۔



معید جانے کی طلب بے چین ہو کر کچن میں آ یا تو کچی کو پیلے سے وہاں سینڈو چڑھانے میں مصروف دیکھ کر اسی
سے فرمائش کر ڈالی۔ ”کی کہ اندر تک چھینے کر داہٹ بھرنی۔ جب سے اس نے پھنکر مارا تھا تب سے اب تک کی اس
سے اس سامنا ہو رہا تھا۔

”میں خراغ نہیں ہوں۔“ اس نے خود کو تسلیا لے ہوئے سرد میری سے کہا تو اس کے ستنے ہوئے نقوش پر ایک نظر
ڈالتے ہوئے وہ دوستانہ انداز میں بولا۔

”آئی ایم سوری فار دیٹ مگر تمہاری حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔“

”بہت اچھا علاج کیا تھا تم نے۔“ وہ پھر امانت کا شکار ہوئے گی۔ باپاں گال تو اب بھی گنگنا رہتا تھا۔

”تمہارا بی بی بی ایسا تھا کہ.....“ وہ کچھ کہنے لگا تھا کہ وہ اس کی بات کاٹ گئی۔

”مجھے تمہاری اسکینے ڈی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے درمیان ایسا کوئی تعلق ہے۔“ وہ بہت بدترین
خود رسی سے بولی تو ٹھٹھکا پھر جب ہو جانے کے بعد وہ نرمی سے بولا۔

”تمہارے کہہ دینے سے تعلق ختم نہیں ہو جائے گا مگر حال میں تم سے کہہ چکا ہوں ایک سیٹ کرنا یا نہ کرنا تمہارا اپنا
فصل ہے۔“

”ہیہ.....“ وہ بیلے لاشہ آئی ہوئے پر سینڈو جیکر کو لے لی۔ معید اس کی سوچوں کی اسے ہر لگد ہی تھی۔

”تم نے اپنی آئندہ زندگی کے متعلق کیا سوچا ہے؟“ اس کا سوال بہت غیر متوقع تھا۔

”میں کونسا جیسے اس کے دل میں کسی نے بھلا دے مارا ہو۔“

”تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟“ وہ متشکل سی اس کی طرف پلٹی تھی۔

”کیوں کہ اس بات سے صرف میں ہی واقف ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ اس باخبری کے باوجود تمہیں کوئی غلط
فیصلہ کرنے کا اختیار ملے۔“ وہ اطمینان سے بولا تو وہ سچ کر رہ گئی۔

”میں اس کی آواز نہیں ہوں۔“

”بی بیہی۔“ وہ لیخت ہی پھنکا رہا تھا۔

”تو میرا بیچھا چھوڑ کیوں نہیں دے۔ تم نے اس کی آواز اونچی ہوئے گی تھی۔“

”کیوں..... لاوارث نہیں ہو، تم جو تمہیں یوں آواز چھوڑ دیا جائے۔“ وہ اب بھی اسی انداز میں بول رہا تھا۔

”تم اسے کام سے کاہر نہیں دے گی کہوں گی جو میرے لیے بہتر ہوگا۔“

وہ اس کے فیصلے انداز کے عدم بردباری کو غلبہ دینے کی سرد میری بھی بھرتی تھی۔

”مگر میں یہ چھینے کا اختیار رکھتا ہوں کہ تم نے اپنے مستقبل کے لیے کیا فیصلہ کیا ہے؟ کیوں کہ میں تمہاری خاطر
محبت بول کر رابطہ کا دانی کا پر پوزل رہ چکا ہوں۔“ وہ غصے سے پرانہ انداز میں بولا تھا۔

”تو نہ کرتے یا احسان مجھ پر۔“ وہ تنگ کر بولی تھی۔ معید نے پی سے کہا۔

”تمہیں شاید یاد نہیں کہ تنہی نے مجھ سے مدد مانگی تھی مجھے ایسے اگلے کاموں میں ہاتھ ڈالنے کا کوئی شوق
نہیں۔“

”تم نے رگت خجالت کے مارے تھنا بھی تھی۔“

”تو نہ کرتے اتنا احسان اس سے پہلے کون سا تم نے میری کسی معاملے میں مدد کی ہے۔“ غصے کی آڑ میں شرمساری کو
چھپاتا چلا۔

”ایک محبت ہی تو اس کا جرم بن گئی تھی۔“

اور محبت بھی کیا ناکام محبت۔

”مگر جو تم نے اپنے متعلق سوچا ہے وہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ معید اپنے لہجے کی شعلگی پر متشکل کا بو پارہا تھا۔

”مگر کیوں؟“ وہ بے حدنا گوارا سے بولی تو وہ اتوں بردانت جما کر غصے سے بولا۔

”کیوں کہ میری اطلاع کے مطابق تم کا طبی دوسالوں کے لیے جرنی چکا ہے۔ اس لیے تم نے اپنے لیے تو ضرور
کچھ سوچ رکھا ہوگا تو وہ ”کچھ“ اپنی جان کو بھی تباہ دیتا کہ وہ تمہارے لیے کئے والے پروڈکٹر کو مناسب الفاظ میں
رکھیں۔“ وہ کہہ کر وہاں دیکھیں تھا۔

”جہاں کی تہاں کھڑی تھی۔ یہ کیہ دھماکا کر کے گیا تھا وہ۔“

اسے اپنے وجود کے پرچے اڑنے محسوس ہوئے تھے اور یہ خیال اس قدر باور دل تھا کہ بے اختیار وہ اپنے سارے
وجود کو ہاتھ سے چھو کر محسوس کر چکی۔ ناگوں نے وجود کو ہاتھ سے چھو لیا۔ وہ خود کو کھڑا کرنا سول پر پیہہ گئی۔
آگھوں سے بے اختیار سلی رواں ہو گیا۔

”تو تم کو کاگی..... اب بی بی جلد ہی بھی دے گئے ہو۔“

مگر نہیں۔ یہ سانس یہ دھڑکن تو چل رہی ہے۔
ان کا چلنا تو تم سے مشروط تھا عمر..... تو کیا میری محبت ہی میں کچھ کی رہ گئی تھی؟
یہ سانس یہ دھڑکنیں کیوں نہیں رک گئیں؟
ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ بری طرح رو رہی تھی۔



وہ بے یقینی کی کیفیت میں ساکت و جامد بیٹھی تھی۔
ابھی ابھی تو تلین بہت پر جوش ہی اسے بتا کر گئی تھی۔
”نوفل بھائی شادی کے لیے مان گئے ہیں۔ کس قدر گھنے ہیں گھر کی لڑکی کو پسند کرتے ہیں اور کبھی اشارہ تک نہیں دیا۔ آج اتنے آرام سے مجھے کہہ دیا کہ امی سے کہہ دینا کہ مجھے شادی سے کوئی انکار نہیں مگر لڑکی صبا ہونی چاہئے۔“ وہ ج
”گھر کی لڑکی“ جیسے مستند حوالے پر ہواؤں میں اڑنے لگی تھی بے یقینی سے تلین کو دیکھنے لگی۔
”کک..... کون.....؟“ پھر سے پوچھا۔
”صبا..... یا میری نندا اور کون۔ امی تو جی جان سے راضی ہیں۔“ وہ بے فکری سے کھل کھلائی تھی۔

اور اب

ادینہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہہ کر شے تو بس نہیں کر کے رکھ دے۔
”ہم تو بس یہاں نوکر بن کر ان کی سی میں رہ رہے ہیں گھر سنبھال لیں سارے انتظامات دیکھ لیں اور اتنا بڑا فیصلہ کرتے وقت کسی نے بتانا بھی گوارہ نہیں کیا۔“
دل میں ایک تیر سا گڑ کہہ رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ ہی ڈالے پر شک کرتی رہی تھی۔ نوفل نے خود کہا ہے صبا کے لیے
نوفل کی خواہش ہے۔
”اف..... اس نے منہ پھینچنی تھیں۔“

”چلو دفع کرو مٹی والو اب اس قصے پر۔“ زرینہ بیگم سے اس کا تپنا، سلگنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔
”کب سے میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ ممانی جان سے اشارتا میری اور نوفل کی بات کر لیں مگر آپ کو عقل نہیں آئی۔ آج جب سب کچھ ہاتھوں سے نکل گیا ہے تو منی ڈالنے کے مشورے دے رہی ہیں۔“
وہ غصے میں بہت بد لحاظ ہو جاتی تھی اب بھی ان پر الٹ بڑی۔
”ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں گی کی مٹکئی کو۔“ تجھے کیا خبر تھی کہ نوفل بھی اتنی جلدی شادی کے لیے راضی ہو جائے گا۔
”وہ کم زور لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنے لگیں۔
”یہ بیس اندر ہی اندر کب سے چھڑی پک رہی تھی۔ ہمیں تو بس اپنی اپنا جج ماں کی خدمت کے لیے رکھا ہوا ہے۔“
وہ سخت پیش پیش تھی۔

”پہلے تو بھی کسی نے اس بات کا اشارہ تک نہیں دیا اور اب واقعی اتنی اچانک سب کچھ طے کر لیا۔“ زرینہ بیگم کا ذہن
بیٹی کی طرح کام نہیں کرتا تھا اب بھی متاسفانہ انداز میں سادگی سے بولیں تو اس نے دانت پیسے۔
”آپ کو میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ آنکھیں اور کان کھلے رکھا کریں مگر آپ نے ابھی دھیان دیا ہو تب نا۔“
”میں تو اسی آس میں رہی کہ اس بار بھابھی ہی میرا بوجھ ہلکا کریں گی مگر ان لوگوں نے تو اپنی سوچوں کی بھنک تک
نہیں پڑنے دی۔“ وہ متاسفانہ انداز میں بولیں پھر سارا الزام اسی پر دھر دیا۔

باراٹھینا سے بولی۔

”تمہارے لیے چاہے یہ عامی دیکھو جن میں نبو میرے لیے بہت خاص ہے۔“

”اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ لوٹے کے شادیوں کو ہوا دینا یا جانے۔ پڑنے لکھے ہوئے جاہل نہیں کہ خواہ مخواہ لڑائیاں

کرتے بھڑکے۔“

”تم بات کی گہرائی میں نہیں جا رہی۔ شادی شدہ زندگی میں تو بھی مسرالی رشتہ دار ڈراما بازی بات کو بیکڑے

کی فکر میں رہتے ہیں۔ اور یہاں تو کراس میرج کی بات ہو رہی ہے۔ بلکہ لینے کے لیے فریق ہر وقت موجود ہے۔ ایک چل

خوش نہیں تو دوسرا خواہ مخواہ جھج میں رگڑا جاتا ہے۔“

”تمہاری بات سو فیصد درست ہے مگر صابہ رشتہ دار سب رشتوں سے بہت مختلف ہے۔ نیت یہاں ویسے کوئی

مسرالی رشتہ دار ہیں اور یہی دونوں کبڑ جاہل ہیں کہ ہر وقت لڑنے لنگھنے میں مصروف ہیں۔ اس بھائی تو پہلے ہی

گئی کے والد شیدائے ہیں۔ ”مٹی تو تک ملاقاتوں“ نے ان کی انڈر اسٹینڈنگ بگ بگ ہوا رہی ہے اور بے نواں بھائی تو یہ پڑپول

خاندان کی مرضی سے آج سواختی محبت سے لے جا کر تمہیں دنگل میں اتارنے سے گور ہے۔“

”جی نے اسے سمجھانے کی سر قور کو شش کر ڈالی تھی۔“

”میرا دل نہیں ہانتا صوفی۔“ وہ بے نی سے بولی تو جی نے دانت چیس کر کہا۔

”اس نے اس دل کو نہیں باندھ کر ڈال دوسا۔ اتنے اچھے رشتے کو بنا کی جواز کے ٹھکرا رہی ہو۔“

”جے نے بھی تو یہی کیا تھا۔ اظہر کا وہاں کا پڑپول تو بھی تو ہے اچھا تھا۔“ صابہ کو بہت اچھے موقع پر یاد آیا تھا اور اس کی

یہ بات بھی کو جانے کیا کچھ یاد آئی تھی۔ دل سے ابھی میں شہید بنی کر خود کو سنبھال رکھنا اس کی بیکور ہی بن چکی تھی۔

”وہ میں نے نہیں معینہ نے رنجیک کیا تھا۔“ جی نے اس کی طرف دیکھے بغیر عام سے انداز میں کہا پھر اس کے

کچھ بولنے سے پہلے ہی ڈھونڈنے والے انداز میں بولی۔

”اور اب تم اپنا دام بچاؤ مارا ڈرا ٹھیک کر لو کیوں کہ سب کو یہ پڑپول جی جان سے قبول ہے۔“

”سب کو قبول ہے تو میرا اس میں کیا تصور ہے میں اس کی طور میں اس ”جبر بے“ کے حق میں نہیں ہوں۔“ وہ بوسری

تھی۔

”آپ کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ اتنے ٹوٹے لنگڑے جواز کو بھلا کے ماننا ہے۔“ حرد نے پھر سے لب کشائی کی تو وہ

اٹھ انداز میں بولی۔

”جی پڑپول کے علاوہ کہیں بھی ہاں کر دینے کا مجھے تصور ہے مگر پردک میں نہیں لے سکتی۔“

”ہاں جی۔“ یہی مور کے دروازے کے باہر پڑپول لڑائی لڑتی ہوئی ہے۔ جی نے بھر پور طنز کیا تو اس نے ہاتھ

جوڑ دیے۔

”تم سیر اعراض اور انکار کا ایک پہنچاؤ دو وہ خودی جو کرنا ہوگا کر لیں گی۔“

اور جی نے یہی کیا تھا۔ تاہم کراس ساری بات جانی جان کے سامنے رکھ دی۔

”آپ اچھے تو اس رشتے میں کسی قسم کی کوئی خرابی دکھائی نہیں دیتی۔ صابہ تو جی بے خواہ مخواہ کے دوسروں میں پڑی

ہے۔ ویسٹ کی شادی تو آج کل عامی بات ہو گئی ہیں۔ اور نواں بھی اتنی اچھی طبیعت کا بچہ ہے ڈراما تو کوئی بات

ہی نہیں ہے۔“

چچی جان نے اپنی صاف گو یا نہ دیتے ہوئے اس کا دل خوش کر ڈالا تھا۔

”اس بے چارے میں کیا خرابی ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ سے اتنا قابل اتنا خوب صورت اور تیز والا بچہ ہے مگر مجھے تو اس صبا نے بولا کہ کھڑا ہے۔“ وہ جی اس رشتے سے خوش نہیں مگر صبا کا رد عمل بھی نظر انداز کرنے والا نہیں تھا۔ زندگی اسے گزرا تھی اور اس کے لیے اس کی رضا مندی بھی ضروری تھی۔

”اس کا تو مارغ خراب ہو گیا ہے۔ اتنے اچھے پڑپول میں بھی کڑے نکال رہی ہے۔ سگریٹ نہیں پیتا۔“

اس نے چڑ کر کہا تو جی نے انھوں سے بھری ہلٹ اٹھا کر اپنے سامنے بھی اور دروازہ انداز میں بولی۔

”کبھی تو وہ واقعی ٹھیک ہے۔ کراس میرج بعض اوقات بہت ہی پیچیدگیوں کا سبب بھی بن جاتی ہے۔“

اس کا تجربہ کار نہ بیان اس نازک مرحلے پر اس کو زہری لگا تھا۔

”تم نے اس کی کوئی پیچیدگی دیکھ لی ہے؟“

”اب دیکھیں نا آپ سیدھے سڑے ہوئے مزاج کے مالک ہیں۔ لیکن بے چاری کا تو ناظمہ بندے رکھیں گے اور

نواں بھائی کا سامرا نزل بھی پر کر آگے گا۔ اس نے بھید کی کہ پو سے میں اس کو پیچھا کرتا۔“

”غلط بھی ہے تمہاری جی ڈیر اپنی سویت نیچر کی ٹوکی دینا مخر ہے۔“ وہ قدرے اتر کر بولا تو جی نے اس کا

مناقض اڑا تھا۔

”جی یہ یاد دینا صرف ایک ہی قسم ہو جاتی ہے۔“

”جی! ابھی تو بات کو پیچیدگی سے سوچ بھلا کر ڈہر دقت میں تم لوگوں پر روشنی سوار دیتی ہے۔“

چچی جان کافی دنوں سے اس کے بہت بازخو سے دیکھ رہی تھیں مگر اپنی فطرت سے مجبور ہونے کے باعث آج سے

بھی ڈانٹ نہیں کر رہی تھی۔

”امی! آپ تو بس یہی جانتی ہیں کہ تمہیں پر مونس شیشوں کی عینک لگانے کا ہے پڑپول ڈال کر ہر مسئلہ کو حل

کر لیا جائے۔ اس کی منتظر ہی رہاں کو بولی۔“

”تم تو بس چپ سی رہو۔“ چچی جان بد مزہ ہو گئی تھیں۔

”امی! آپ زیادہ سوچیں میں مت پڑیں آپ کا دل مطمئن ہے تو بس ٹھیک ہے۔ صابہ کو کیا معلوم۔“ اس کی بے

تانی سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ لیکن نے اسے بطور خاص اپنا شیلڈ کر لیا تھا۔

”اور یوں بھی وہ کراس میرج کے خلاف ہے۔ نواں فطرت کے نہیں۔“ جی دور کی کوڑی لائی تھی۔ اے بلا جواز میں

نواں کو نہ بکھٹ کر نہ اپنا چھائی لگ رہا تھا اس پر ستر اور وہ اس گھر کی ہونے والی ہو گا بھائی بھی تھا۔

”صابہ تو جی پالے سے معاملہ کیا کہ پچھتے ہیں کون سا لیکن کے لیے بندہ دیش ہے مجھے یہ جو وہاں صبا

پر ظلم و ستم تو ڈھانے جا لیں گے۔ بانی گھر تو لڑکیوں کی قسمت ہے جس میں جن کی ویسٹ کی شادی نہیں ہوئی وہ کلن سا

اپنی خوشیوں کی ضمانت کے کراسرالی جاتی ہیں۔ اور پھر اس کی مسرالی میں ہے ہی کون؟ لیکن بیاہ کر یہاں آ جائے گی

پیچھے ایک بے چاری ساس اور نواں ہی ہیں۔ ماحول تو اسے خود بنانا ہے دہاں کا۔“

چچی جان نے جس قدر مدلل انداز میں سمجھا یا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مکمل طور پر اس رشتے کے حق میں

ہیں۔

اور اعراض تو تانی جان کو بھی نہیں تھا مگر صبا نے انہیں الجھا کے رکھ دیا تھا۔

”میں تو شام سے پہلے ہاں کرنے کو تیار ہوں مگر پہلے کوئی اس لڑکی کو تو سمجھا۔“ انہوں نے پریشانی سے کہا تو

خاموش بیٹھی مگر نے اسان سائل پیش کر دیا۔

”معدی بھائی سے کہیں پھر دیکھیں گے آپ کیسے ہاں کرتی ہیں۔“

”واقعہً وہ خود بھلا لگا ہے۔“ چچی جان کو بھی میل پڑتا یا تھا۔ لب بھینچے ہوئے انکوروں کے گنگھوں میں سے نکلتے انکورتوں کے لئے گئی۔

”جب ایوان جان اور چچا جان کو کوئی اعتراض نہیں تو پھر۔“ انس پھینچا کہ کہنے لگا تھا کہ چچی جان اسے نوک نہیں۔

”آج سچ بتاتی ہیں، جس کی زندگی ہے اس کا فیصلہ اثبات میں ہو ضروری ہے اب زندگی کی شادی تو جس کریں گے ہم۔ اگر صاحبہ راضی ہے تو اسے سمجھایا جاسکتا ہے مگر اس کی مرضی کے بغیر ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔“ وہ جل ساسر کھینے لگا۔ پھر فرار نہی سے بولا۔

”سوری۔۔۔۔۔“

”تمہی لیال اس بارے میں تکن کو کچھ مت کہنا۔ اس کے بھائی کا معاملہ ہے، خواہ مخواہ اس کا دل برا ہوگا۔“ عائلی جان نے اس کو تینوں کی تو اس نے فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلادیا۔

شام کو سارا مسئلہ معدی کے سامنے رکھ دیا گیا۔

”اب۔۔۔۔۔“ کیساں رہا ہوں میں؟“ اس کے کمرے میں جاتے ہی معدی نے سیدھے بھاکو پوچھا تو وہ حیران سی

اسے دیکھنے لگی۔

”آپ کے سامنے کان ہیں مجھے کیا معلوم کیا کچھ سنتے رہتے ہیں۔“ اس کے علمی کے اظہار پر معدی کے ہونٹوں پر

بلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا ہاتھ تھام کر اسے سامنے کھڑا کرتے ہوئے اس نے نرمی سے پوچھا تھا۔

”کیا میری بہن اتنی بے وقوف ہو سکتی ہے کہ ایک بے بنیاد سے شبکی بنا کر غفلت احمد جیسے پریکٹ بندے کا

پروپوزل نہ ٹھیک کر دے؟“

صبا کو اندازہ نہیں تھا کہ معدی اس موضوع پر بات شروع کر دے گا۔ خود کو بہت سنبھالتے ہوئے بھی اس کی رنگت جھٹھا

اٹھی تھی۔

”بے بنیاد کیوں؟ میں نے ایک بہت معقول وجہ بتائی ہے۔“ دھیمے سروں میں کہا۔

”کیا تم گارنٹی دے سکتی ہو کہ کراس میرج کے بغیر شادی ہونے پر ہم ساری عمر بہت اچھی طرح گزار دو گی؟“ وہ اب

بھی دوسرا اندازہ میں پوچھ رہا تھا۔

”پھر مجھے نام عام حالات میں دیئے خود مشاقت نہیں ہوتے جیسے کراس میرج کے بعد ہوتے ہیں۔“ اس نے منمننا کر

کہا تھا۔ پھر سب سے بڑے خدشے کا ذکر بھی کر بیٹھا۔

”انس بھائی کے مزاج کا پتہ ہے نا آپ کو۔ اتنے تو جذباتی ہیں بل میں تو دلدار ہیں بل میں ماشد ہوتے ہیں۔ جانے

تکلیں برداشت کرے یا نہ کرے۔“

”کم آن میں میں تمہیں اتنی بے وقوف نہیں سمجھتا تھا۔“ وہ جیسے بے حد ریزہ ہوا تھا۔ پھر اسے سمجھانے والے انداز

میں بولا۔

”وہ سب ہماری ذمہ داری ہے۔ بڑے خدشے ہوتی ہیں اور پھر کسی اجنبی پر بھروسہ کرنے سے بہتر ہے کہ ہم

ای پروپوزل کو ایکسپٹ کر لیں۔ کم از کم سب ہم نفل کو اچھی طرح جاننے تو ہیں نا۔“

وہ کہنے کی بجائے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا کر بستر کے کنارے پر گئی۔

”بیوی صبا، وہ بہت اچھا شخص ہے۔ اور پھر جو اتنی جاہت مست آپ کے لیے ہاتھ پھیلائے اے نا مرنارونیں کو مانا

چاہئے۔۔۔۔۔“

وہ بلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو وہ یوں پٹٹائی جیسے ”اس جاہت“ میں اس کا بھی برابر کا قصور ہو۔

”پھر میں تمہاری اس خاموشی کا کیا مطلب سمجھوں؟“ وہ بڑے آرام سے پوچھ رہا تھا۔ اور اب تک منہ پھاڑ کر انکار

کرنے والی صامتا کر رہ گئی۔

”اگر آپ لوگ مطمئن ہیں تو۔۔۔۔۔“

”نہ۔۔۔۔۔ نہیں اگر تم بھی مطمئن ہو تو۔۔۔۔۔“ اس نے فوراً بات کاٹتے ہوئے اٹھ کر ہلائی تھی۔

”مگر ان تو آپ لوگ ہی دے رہے ہیں نا۔“ صبا کے ہونٹوں پر بلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی جسے دیکھ کر معدی بلکا

پٹکا پٹکا گیا۔

”چلو ٹھیک ہے میں یہ بار بار اپنے کندھوں پر اٹھالیتا ہوں۔“ معدی نے خوش دلی سے کہا پھر پوچھنے لگا۔

”اب تو کوئی اعتراض باقی نہیں رہا؟“

اثبات میں جواب دیتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تو وہ چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”آپ کا مطلب ہے کہ کسی اجنبی پر اعتبار کرنے سے بہتر ہے کہ جسے ہم اچھی طرح جانتے ہوں اسے آزما

جائے؟“

بے حد سادگی سے ای کی بات دہرا کر صبا نے پوچھا تو وہ دہرا بولا۔

”بالکل اس سے کافی مشکلات آسان ہو جاتی ہیں۔“

”تو پھر میری ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”وہ یہ کہ تمہاری کے سلسلے میں بھی وہی اطمینان چاہتی ہوں جیسا آپ مجھے دلا رہے ہیں۔“ اس نے اطمینان سے کہا تو

وہ مزید اٹھ گیا۔

”اس کا یہ کیا بیاؤ کر؟“

”اس کا ذکر کریں گے کہ کھر والے پ دلوں کے رشتے پر دل و جان سے رضامند ہیں مگر آپ دلوں کے تیوروں

کی وجہ سے یہ کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ رہا۔“

اس کا انکشاف معدی کے لیے اس قدر غیر متوقع تھا کہ وہ چند ثانیوں تک ٹھہر کر رہ گیا۔

”یہ کیا فضول بات ہے؟“ اس نے بے حدنا گوارائی سے کہا تو وہ بخند کی سی بولی۔

”فضول بات کہے ہوگی آپ اس کے لیے باہر کے کسی بھی پروپوزل سے زیادہ پر غصت ہیں۔“

”اس وقت بات پچھو اور ووری ہے صبا۔“ وہ بہت بخند ہوا تھا۔

”مگر دلوں باتوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے معدی بھائی۔ اگر میں نفل احمد کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں تو آپ

میں کے ساتھ خوش کیوں نہیں رہ سکتے؟“ صبا نے اندر سے خوف زدہ ہوتے ہوئے بھی کہہ دی یا تھا۔ اس کی تو یوں بھی

دلی خواہش تھی کہ معدی کی شادی ہو جائے۔

”یہ وقوف ہوتا صبا۔ میں کچھ کہہ رہا ہوں اور تم کسی اور مسئلے میں الجھی ہوئی ہو تو جوتھار اور سرتوباکل بھی نہیں ہے۔“

معدی کے انداز میں خفگی سی جھلک دیا تو گئی۔

”میں بھی آپ کو خوش گزار زندگی کی گارنٹی دے رہی ہوں۔“ صبا نے کہا تو اب کی بار معدی نے اسے ڈانٹ دیا۔

”خاموش رہو تم“ یہ سب تمہارا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی شادی بیاہ ایسے رشتے ہیں کہ جنہیں مشروط انداز میں طے کیا جائے۔ جب یہ مسئلہ میرے سامنے آئے گا تب دیکھا جائے گا۔“ اس کا انداز بے حد طعنی تھا۔ صبا دل مسوس کر رہ گئی۔

”تو پھر میں سب کو اطمینان دلا دوں؟“ وہ قدرے خوش گواریت سے بولا تو اس نے خفگی سے کہا۔

”جوجی میں آئے کہہ دیں۔“

”اوکے“ پھر دوبارہ کوئی شوشت مت چھوڑنا۔ میں تو جا کر تمہاری رضامندی ہی شکر کروں گا۔“ وہ طمانیت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی مسکراہٹ نے صبا کے ہونٹوں کو چھو لیا۔



”ہیلو۔“ تلکین کا انداز بے حد غلٹ آ میز تھا۔ سارا دھیان یکن میں لگا ہوا تھا جہاں وہ ایک کا آمیزہ نوری کے رحم و کرم پر چھوڑ آئی تھی۔

”کتنے رشتے، کتنے سنگی، کتنے لوگ

دل کے شہر کا ایک ہی باسی ہوتا ہے

گھر میں رہنے والے بندھن ہوتے ہیں

دل میں بسنے والا ساکھی ہوتا ہے“

زندگی سے بھرپور لہجہ اس کی تمام تر توجہ سمیٹ کر لے گیا تھا۔

”اوہو..... آپ ہیں۔“ دل کی دھڑکنیں خوب صورت سی لے پر دھڑکنے لگیں۔

”جی جناب آپ کو تو توفیق نہیں ہوئی کہ تین روز سے اگر میں نے کال نہیں کی تو آپ ہی کر لیتیں۔“ انس نے شکایتی انداز میں کہا تو وہ ریلکس ہو کر صوفے میں دھنس گئی۔ پھر ہلکی سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے

زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے“

وہ ہلکی سی آہ بھرتے ہوئے بولا تو وہ پھر سے ہنس دی۔

”اوہو..... یہ تو اچھی علامات نہیں ہیں۔“

”بے فکر رہو ایک دو ماہ میں ایک بہت اچھے تیمار دار کا بندوبست کرنے والا ہوں میں۔“ انس کے لہجے میں شرارت کا عکس محسوس کر کے وہ جھینپ گئی تھی۔

”باقی سب کیسے ہیں.....؟“ اس نے بات بدلتی چاہی تھی۔

”باقی تو سب بالکل خیریت سے ہیں، بس ہم ہی پڑے ہیں راہوں میں۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا تو تلکین سے اپنی مسکراہٹ ضبط کرنا مشکل ہونے لگا۔

”چہ..... چہ۔ یہ تو آپ کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں ہو رہا۔“

”ہاں جی“

ایسے نہ تھے ہم اہل دل اتنے کہاں خراب تھے

ہم کبھی کسی کی آس تھے ہم بھی کسی کا خواب تھے“

وہ اپنے مخصوص زندہ دلانہ انداز میں بولا تو تلکین نے بے ساختہ ہلکا سا تہہ لگایا تھا۔ پھر سامنے نظر اٹھی تو لب بھنج

گئے۔

”دوہا صاحب کا فون ہے؟“ نوری نے بے حد اشتیاق سے پوچھا تو مادہ تھیں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نگین نے دانت کچکا کر کہا۔

”تمہارے دوہا صاحب کا تو بالکل بھی نہیں ہے۔“

”وہ جی..... میں تو پوچھنے کی بھی کس ایک کا کیا کرنا ہے؟“ نوری خاصی بد مزہ ہو گئی۔

”اوون گرم ہو چکا ہوگا سائے کو اس میں رکھ دو اور اب ادھر آئے کی ضرورت نہیں ہے جا کے ان کے پاس بیٹھو۔“ نگین نے اس کی چھٹی کی تو وہ منہ ہٹائی پلٹی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”کون تھا؟“ وہ پوچھ رہا تھا نگین نے بتایا۔

”نوری کی بے وفائی۔“

”خیر بے وقوف تو مت کہو، کافی عقل مند ہیں مگر تمہاری آسانی سے میرے مقام کا ابھی سے تعین کر گئی ہیں۔ وہ شریر لیجئے میں بولا تو نگین کو احساس ہوا کہ وہ بھی نوری کی کل افشانی سے محفوظ ہو رہا ہے۔

”آپ تو بس۔“ وہ چھٹی تھی۔ پھر بے اختیار یاد آئے پر بولی۔ ”اسی نے تو فون کرنے کو کہا تھا اسی انتظار کر رہی ہیں مگر آپ نے کچھ خبری نہیں دی۔“

”اچھا فرض کر دو کہ میں تمہیں کوئی اچھی خبر سناتا ہوں تو میرا انعام کیا ہوگا؟“ اس نے کہا تو وہ بے مبری سے بولی۔

”اس کا مطلب ہے کہ سب رضا مند ہیں۔“

”ارے واہ بولی کیسے تبادلوں۔ پہلے کچھ انعام تو ملے کرو۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”ممت تائیں۔ میں بولی بھی آج آئی کیون کرنے والی تھی۔“ وہ کہتی تھی۔ ”اس نے ہلکی سی سانس بھری تھی۔“

”میں نے تو یہ نہیں کیا کچھ سوچ رکھا تھا مگر میری آنکھ میں بھی کوئی ٹیکس موقع مت آنے دیتا۔“

”اب تائیں ناں پھر ہم لوگ کب آئیں؟“ وہ بہتاب ہو گئی۔ ”اس نے کہا۔“

”یہ تو تم لوگوں پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔ ویسے ای تو خودوں کو رکا چاہ رہی تھیں مگر میں نے کہا کہ میں خوب بات کر لوں گا۔ اب تم اگر جاہو تو ان سے بات کر کے سب ملے کرلو۔“

”بالکل ٹھیک ہے میں اس بھی جا کر خوش خبری امی کو سناتی ہوں۔“ وہ جو شہناز میں بولی تو اس نے فوراً کہا۔

”اسی لیے میں ابھی نہیں جاتا رہا تھا۔ فوراً مجھے کو تیار ہو گئی۔ اتنا بھی خیال نہیں کیا مجھ سے اچھی طرح بات ہی کرلو۔“

”سورہ اس ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ خندہ ہی ہو گئی۔

”تم سے اچھی تو وہ نوری ہے۔ نئی دل کو خوش کرنے والی کر کے کئی ہے۔“ وہ شہناز سے بولا تھا۔

”کیا خیال ہے پھر آج نوری سے ہی بات نہ کرو دوں؟“ نگین نے بہت جلد سے طنز کیا تو وہ ہنس دیا۔

”میں ختم زیادہ اچھی ہوں۔“

”شکر ہے۔“ وہ مستم ہوئی تھی۔

”اور میرے متعلق جناب کا کیا خیال ہے؟“

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ جواب کی زد میں آ گئی۔

”اس ناٹنیر..... میں نے ابھی تمہاری تعریف کی ہے۔“ اس نے احتجاج ٹوٹ کر لیا تھا۔

”تو کیا ضروری ہے کہ میں بھی آپ کی تعریف ہی کروں۔“ نگین نے تنک کرنے والا انداز اپنایا تھا۔

”کیا مطلب؟ یعنی میں اتنا اچھا نہیں ہوں؟“ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ اسے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ وہ دل باکرٹھی پھر دھتے لکھنے میں بولی۔

”آپ پوچھتے ہیں کہ۔“

”کہ..... وہ بے قرار ہوا تھا۔

”وہ ہمسفر ہو اور سفر ہو زندگی بھر کا یہی دعا آئی ہے زندگی کے لمبوں پر۔“

وہ عجیب آواز انداز میں بولی تو میسرور پر چند تانیوں کے لیے خاموشی چھائی۔

”یہ وہ کون ہے؟“

قدرے توقف کے بعد اس نے پوچھا تو چلائی اٹھی۔

”بہت فضول ہیں آپ بے شر میں نے آپ کے لیے پوچھا ہے۔“

”اب آئی ہو ناں؟ پر۔“ وہ قہر لگا کر بولا تو اس کی ہوشیاری نگین کا چہرہ تپ اٹھا۔ یوں لگا جیسے وہ مقابل موجود ہو۔

”اس کی دوستانہ فطرت ہی کا کمال تھا کہ ان دونوں کے مابین کافی بے تکلفا اندر وادب پیدا ہو چکے تھے۔ اوپر سے نگین کی عادات بھی اسی جیسی تھیں سو میٹرا رائیڈنگ گھر پر بھی تھی۔

”جنا بہت خراب ہیں آپ۔“ زریب مسکراتے ہوئے وہ دم مہم سروں میں بولی تو اس نے جیسے اس کے احسانات سے خوب غماز کیا۔

”ای بھی یہی نہیں ہیں اسی لیے تو انہوں نے تمہیں دھڑلے سے تارکے مجھے ٹھیک کر سکو۔“

”کیوں..... آپ کے نزدیک کوئی سروں اسٹیشن نہیں ہے کیا؟“ نگین نے طنز کیا تھا۔

”جیسے ہو گئی۔“ وہ پوچھنے لگا تو دوسری قسم کی سروں کی ضرورت ہے جس میں پیار محبت کی چاشنی ہو۔“ وہ آرام سے بولا تو وہ

”آپ کو تو بس موقع ملتا جا ہے بات کرنے کا۔“

”ارے تم یہ تو نہیں کس کس موقع کی تلاش میں ہیں۔“ وہ لپک کر کہنے لگا تو نگین نے فوراً ”خدا حافظ“ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے ہونٹوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ چمکی ہوئی تھی۔

اس کی باتوں کو ذہن میں دہراتے ہوئے وہ صالو بیگم کے کمرے میں چلی آئی۔

”میراؤ اس سے اجابت میں جواب ہا کر دے گی بہت خوش ہوئی تھی۔“

”شکر ہے خدا کا میرے بیٹے نے بولی ہا کر دیا فرمائیں کی گئی وہ بھی پوری ہو گئی۔“

”بھائی کیون کر دے؟“ نگین نے جلدی سے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

”کر دو۔ وہ تو اس دن سے بے چین پھر رہا ہے۔“

”مطلب یہ تو تمہیں کہ ادھر سے ہاں ہونے کے بعد آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”پروگرام کیا ہوتا ہے تم دونوں کی ایک ساتھ ہی شادی کر دیں گے۔ تمہارے جانے کے بعد میں اکیلے تو نہیں اڑاں گی نا۔“

تکلیں نے تجزیہ کیا تھا۔ اوہ نے مشکل ہونٹ پھیرا کر مسکراہٹ کا تاثر دیا تھا۔
 ”چلو شکر ہے مجھے کوئی لڑکی پھندا لی۔ چاہے جو نکلیں ہے۔“
 ”واقعی کی پریشانی تو ختم ہوئی۔ میرے بعد تو دو دوا لکھ لکھ کر ہو جائے گی۔“
 ”اب یوں تو موت کہو کہ ان کو ان کا احساس نہیں ہے؟“ معاویہ ہی ایسا تھا کہ ہر بات سیدھی اوہ کے دل میں چھوہری کی رونہ عام حالات میں وہ ایسی باتوں کو جھٹکوں میں لڑاؤ دیتی تھی۔
 ”نہیں اب ساری عمر ہم یہیں چھوڑی بٹھاے رکھیں گے۔ ایک بہت اچھا سلاک ڈھونڈ کر.....“ لیکن کہنے لگی تھی کہ وہ تیز لکھے میں اس کی بات کاٹ گئی۔

”میں نہیں نہیں جارہی۔ ایک دفعہ جو تجربہ ہو چکا میرے لیے وہی کافی ہے۔“ اس کا انداز اس قدر تندی سے بھر پور تھا کہ لیکن اپنی بات پر شرمندہ ہی ہو کر رہ گئی۔ پھر بھی اس نے اوہ کو ایک بار بٹھانے کی کوشش ضرور کی تھی۔
 ”زور کی صرف ایک ہی بار تجربہ کر کے بار جانے کا نام تو نہیں ہے اوہ نے اس راہ میں درویش ہر نا کا انسان کے جذبات کو بھڑکنے کی بے در نہ تو ہر انسان ہمت بارے کی قسمت پر توکل کر بیٹھا رہے۔“
 ”میں صرف قسمت پر توکل کر نہیں بیٹھی ہوں۔ مجھے جو کہنا ہے وہ میں نے اچھی طرح سوچ رکھا ہے۔ میری دادی کہا کرتی تھیں ”بادشت کے تحت نہیں ملتا“ اور مجھ میں ہر مصیبت پہنچ کر حوصلہ موجود ہے۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ مجھے کس لیے بلایا تھا۔“

بہت سگلتے ہوئے انداز میں کہتے کہتے اس نے یکذات بلکی ہی سانس بھر کر تکلیں سے پوچھا تو وہ اس کے اس قدر پرچہ انداز پر اندر ہی اندر ہلکا ہلکا ہنسا کر بولی۔
 ”میں چاہرہ ہی کی کہ ہم جا کر کیا کوئی پھندا آئیں۔“

”ممائی جان تو کہہ رہی تھیں کہ تم دونوں کی شادی ایک ہی روز ہو رہی ہے۔“ اوہ نے دل پر پتھر رکھ کر کہا تھا۔
 ”ان کا تو یہی ارادہ ہے کہ میں ہر گز جا رہی تھی کہ ایک چھوٹا سا نکلیں ہو جائے۔ ان کی کال بھی خوش ہو جائے گا ہمارے گھر کی پہلی خوشیاں ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ انہی میں زندگی تمام ہو جائے۔“

اس کے بچنے پر اوہ نے کثرت سے انداز میں ہنسون کو جس روز کی پھر اوہی دل سے بولی۔
 ”اتنا کھڑا آگے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر بھی اگر ایسا کچھ کہنا ہے تو کیا ان نکلیں کو لکھو اس میں اس درجہ منف کر کے ایک ہی دان فکری کی رسم اور کوئی نہ دونوں کو ایک ہی روز شادیا جائے۔“
 ”دیر کی گڈائیڈیا۔“ لیکن خوش ہوئی تھی۔ ”یوں سب سانی سے نکلیں میں شریک بھی ہو سکیں گے۔“
 ”ہاں تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے گی اور نفل کی صبا سے۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔
 ”خیر اے اب کوئی مطلب نہیں تھا۔“ وہ چھٹی لگی۔
 ”نفل کب رہا ہے آفس سے؟“ اوہ نے اپنے اندر کے اضطراب کو چھپاتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا

تھا۔
 ”ان کے انداز سے تو لگ رہا تھا کہ ابھی اڑتے ہوئے آج نہیں گئے۔“ لیکن خوش کواد سے احساس میں گھری ہوئی تھی۔
 اتنے عرصے تک اس موضوع تک سے بچتے رہنے کے بعد نفل نے اس قدر غیر متوقع طور پر شادی کے لیے صبا کا نام تجویز کر دیا تھا کہ لیکن اور صبا لگے تھیں انہوں کو ایک خوش کواد کا راسخا ہلکا ہلکا تھا۔

”ویسے نفل یوں تو نہیں راضی ہونے والا۔ لگے ہے صبا نے کوئی چکر وغیرہ چلایا ہوگا۔“ اوہ نے ناگہم پر ناگہم جرات سے بوائے انخائل ظاہر کیا لیکن نے انفیوراس کی بات نفی کر دی۔

”وہ اس ناگہم کی لڑکی نہیں ہے اور پھر اس کی نفل بھائی سے باہر ہو سکتی نہیں ہوئی۔ چکر تو بہت دور کی بات ہے۔“
 ”تمہیں کیا معلوم؟“ تم بھی بچی ہو۔ ایسے معاملے یوں شادی تک نہیں پہنچ جاتے۔“ وہ اپنی بات پر اڑتی تھی۔
 ”کم از کم اوہ! ہم بھائی کی بچہ سے اچھی طرح واقف ہوئے، وہ ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے کہ لڑکی خود اپنی پسند کا لڑکا تلاش کر کے دوستی کا منتھی پھرے۔“ لیکن بے ساختہ بولی اوہ نے رنگت پھیلی پڑ گئی۔
 لیکن نے زبان دانتوں تلے بالی کر منہ سے نکلی بات تو دانتوں میں آسکتی تھی۔ اوہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔
 ”میں جلتی ہوں۔“

”بھینسا.....“ وہ ابھی تو بہت سی دسکن کرتی ہے۔“ لیکن بھی گڑبڑا کر کھڑی ہوئی تھی۔
 ”پھر کبھی یوں بھی اپنی فریڈ کی طرف جارہی تھی۔“ وہ تنجید کے کہتی چلی گئی۔
 لیکن کاٹنی پھل پر ماتم کرنے کو بھی چاہا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ بہت غلط موقع پر اس کے منہ سے بہت غلط بات نکل گئی تھی۔ یقیناً اوہ نے ہانڈ بھی کیا تھا۔



وہ خوش خبری نہ کر صبا کو بتانے کی غرض سے بھاگی تھی اور اس اندھا حد نہ دوڑ کر وجہ سے وہ اپنے کمرے سے نکلنے سے عید سے تصادم کے بعد زمین بوس ہونے ہی لگی تھی کہ وہ اسے بازوؤں سے تھام کر سنبھال گیا۔ لیکن وہ دلفریب سی خوشبو کے حصار میں کھڑی تھی۔

”بے خوف! یوں اندھوں کی طرح کیوں بھاگ رہی ہو؟“ اس کی جھلاہٹ بھری آواز نے ایک سیکنڈ میں شٹی کے تمام حواس بحال کر دئے تھے۔ وہ بے اختیار پیچھے ہٹ گئی۔

”یادنا کھائے تم نے؟“
 ”ظاہر ہے تمہیں اب دیواروں سے تو باتیں کرنے سے رہا۔“ وہ دھلا دھلا کیا کہیں جانے کو تیار تھا اطمینان سے بولا تو وہ سگلتی۔

”تمہاری آنکھیں تو روش ہیں ان سے ہی کام لے لیا کرو۔“
 ”جوہر جارہی تھیں اور چاہو می سے منہ مت لگو۔“ وہ بھی حسب عادت اس کی بے وجہی تجرپ سے چڑھ گیا تھا۔
 ”ہنس۔“ وہ ہنسنے کی طرف بڑھ گئی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے خوش خبری کا سارا جام ہی ختم ہو گیا ہو۔ دلی دل میں معید کو کوس کر اس نے تاب گھما کر اواز دہا کر دیا تھا۔

”وہ عشق جو ہم سے روکھ گیا
 اب اس کا حال بتا سکیں
 کوئی مہربان کوئی تہ نہیں
 پھر سچا شاعر نہیں کیا
 وہ عشق جو ہم سے.....“
 مغنیہ کی دلکش آواز کے زیر و بم میں کھوئی وہ آنکھیں موندے نہم راز تھی۔

”اوہو.....“ وہ معنی خیز انداز میں کہتی اندر داخل ہوئی تو صبا چونک گئی۔
 ”یہاں تو عشق و عاشقی سے بھر پور گانے سنئے جا رہے ہیں اور وہاں تمہارے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔“
 ”کیا مطلب؟“ صبا نے اٹھ کر دائیں کمرے کے ہونے پر چھان اپنی داستان میں اس نے دھما کر دیا۔
 ”مطلب یہ کہ اصراف نفل احمد کا پروپوزل منظور کر لیا گیا ہے۔“
 ”تو پھر.....؟“ وہ استغیاب آمیز انداز میں کئی کو دیکھتی تو وہ حیران ہوئی۔
 ”تمہیں حیرانی نہیں ہونی؟“

”کس بات کی حیرانی۔ معید بھائی مجھ سے اثبات میں جواب لے کر ہی گئے تھے۔“ صبا نے مطمئنانہ سے کہا تو
 گہری سانس لینے کے بعد اس نے دانت چٹپٹا کر صبا کو دیکھا تھا۔
 ”ہمارا سمجھنا تو کسی کتنی میں نہیں آتا اس نے ایک بار کہا ہوگا اور تمہارا سرسود فہم ہاں میں ہلا ہوگا۔“
 ”یقیناً کر وضو! میں اب بھی کس میرج کے کتنی میں نہیں ہوں تم سب لوگ اس پروپوزل سے اتنے خوش اور
 مطمئن ہو کر میں اپنے تمام جذبات کو کس پشت ڈال رہی ہوں۔“ اس نے بے حد تنبیہ سے کہا تو معنی بھی سمجھ
 ہو گئی۔

”صباح تم خواہ چاہو کی ٹینشن لے رہی ہو۔ آج کل وہ ٹیچر کل ساس بہوؤں کا زمانہ تو ہے نہیں کہ جنگ و جدل کا سماں
 بندھا رہے۔ تمہارا لیے دہاں کوئی مسئلہ ہے اور نہ ہی ٹکین کے لیے یہاں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ صرف
 اُس بھائی ٹکین کو بہت محبت سے اس گھر میں لائیں گے بلکہ نفل بھائی نے بھی تمہارے لیے بہت چاہت سے اس کن
 پچھلایا ہے۔“
 ”آج خرابی میں نہ بھی یہی ہوتا تھا۔“ وہ ٹرگن سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو چند سیکنڈ تک اسے گھور تے رہے
 کے بعد معنی نے ٹکیا اٹھا کر اسے دیا۔

”مفعول لڑکی! اور وہ جگہ نکھول سے اسو کی نہیں سہا کر بیچھ دکھاری تھیں اس کا کیا مطلب تھا؟“
 ”اعتراض کا حق تو ہر لڑکی کو ہوتا ہے۔“ وہ دھڑائی سے بولی تو وہ دھپ سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔
 ”تو پھر صاب یہ اس گانے شننا بند کر اور کوئی نئی کیسٹ خریدو۔“
 ”شلّا کون سی؟“

”شلّا“ ”یوں آپ کا ہوا“ وہ فحش و فحش سے متعلق سوچ کر بولی تو صبا کو کھنٹی آ گئی۔
 ”ویری چیپ.....“

”گورنمنٹ..... اور سیدھی طرح سے جاتا کر نفل احمد سے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟“ معنی نے اسے ڈانٹتے
 ہوئے پوچھا تو وہ ہرک ہرک۔
 ”میری ان کے کوئی ایسی بے تکلفی نہیں ہے جو میں ان سے متعلق رائے دیتی ہوں۔“
 ”اوہو.....“ ”ان سے“ یعنی کہ وہ ابھی سے ”ان“ کے ہمہ گیر پرفاز ہو گئے ہیں۔“ معنی نے ساری بات میں سے
 اپنے کا کام کا لفظ ہی پکڑا تو وہ جھینپ گئی۔

”بہت بدترین ہوتی۔“
 ”یہ ساری شرارتیں اب چھوڑ دو کیوں کہ ابھی دھماکا خیز خبر تو میں سے تمہیں سنائی ہی نہیں۔“ معنی نے اسے ڈرایا تھا۔
 ”اور کیا بانی رہ گیا ہے؟“

”اور یہ رہ گیا ہے کہ معنی کا فنکشن کہاں تھا اور ہاں ہے وہ بھی ہوئی میں۔“ سمجھ اسو تیرے لیے اسے ٹوک دیا۔
 ”دانت تو ٹھیک ہے تمہارا؟“ صبا کو ٹھک ہوا تھا۔

”یہاں سیدھا“ ”اُھر“ کا سے لڑکی دونوں معنی میں ٹرک ہو جائیں گے اور میں
 ایک مرتبہ پھر سے سوچ لے۔ خواہ وہ امارا جا رہا ہے۔“ وہ ہنوز شرات کے موذ میں تھی۔ ایک ایک فیصد بھی انٹرنیٹ
 ”وضو! جھوٹ مت بولو۔ میرا دل ابھی سے ڈوبا جا رہا ہے۔“ اس نے اپنے دل پر ہاتھ جیکو۔ ”وہ اٹھ کھڑی
 کوئی بات نہیں سنا ہے موصوف ماہر تیرا کبھی بھی میں۔“ سنبھال لیں گے تمہارے دل کو بھی۔“
 ”معنی! بکواس مت کر اور یہ سب گھروالے اتنے براڈ بانڈ ڈک سے ہو گئے ہیں؟“ وہ رو رہا تھا۔
 انگوٹھی پہننے کے تو اب تک معنی گرو نفل احمد کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔

”مجھے تو یہ سب اس بھائی کا کیا دل لگ رہا ہے۔ سراسر اپنے سالے کو پیوڑ کر رہے ہیں بلکہ خود بھی ٹکین سے
 ملنا کات کا انداز دل لے رہے ہیں۔“ معنی نے زور کی کوئی لائی تھی۔

”بائے غی! اب کیا ہوگا؟ کیا وہ انگوٹھی بھی خود ہی پہنا میں گئے؟“ صبا کو بڑی تھی۔

”صعدہ نے جاگن کیا کیا اریان بل رہے ہیں کئی کے دل میں۔“ معنی نے طنز کیا تو وہ بری طرح جھینپ گئی۔
 ”ڈیل میں تو یونی پوچھ رہی تھی۔“

”یہ تو اب ان کے دل کو ڈھونڈ کر رہا ہے۔“ ہو سکتا ہے کہ تمہارا نوپ سہا نہ کچھ کر نکاح اور وضو پر ہی آؤ جائیں۔“
 معنی نے اسے ڈرایا تو صبا نے ایک کئی بخش سا جھانپوڑ معنی کے شانے پر دے مارا۔
 ”بہت محسوس ہاتھ کرتی ہو۔“

”تمہارے جانبداری کے تمام دھبے پھر یہاں صرف اور صرف میری اور حیر کی حکومت ہوگی۔ جہاں چاہے ہم گند
 ڈالیں ناٹنا نہ بننا۔ نہ تائیں گناہنا یا میں گناہنگ کر۔“ ہمیں کوئی بھی نصیحت کرنے والے ناٹنا۔“
 ”اور یہ کہ پھر تھن جلی کے سہارے اٹھ سٹوٹ جائیں۔“ اس کے خواب ناگ ارادوں کو صبا نے جی میں شس
 کر دیا تو وہ گھوٹنے لگی پھر اُن انداز میں بولی۔

”ٹوک لیں ناٹنا نفل احمد کا دل تم پر ہمیشہ بری طرح آیا ہے۔“

”دیکھنی جائے گی۔“ اس نے بھی چڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

”بلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے“

”جی آہ بھر کے رہ گئی۔“

”معنی! ایک بات پوچھو؟“ صبا نے اسے غور دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ بے پروائی سے بولی۔

”اگر تم پوچھنا چاہتی ہو کہ میرا نفل احمد میں کوئی انٹرنسٹ ہے یا نہیں تو بے فکر ہو میں ہمیشہ انہیں ایک بہن کی
 نظر میں سے دیکھ رہی ہوں۔“

”میں وضو! میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہیں معید بھائی کیسے لگتے ہیں؟“ وہ بالکل سنجیدہ تھی معنی کو جھکا سا مانگا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ تیر پھر لگا تھا ہوں سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔

”میری کہ تمہارا معید بھائی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”میں فکری رہو کوئی خاص اچھے خیالات نہیں میرے بارے میں متعلق۔“ معید کا تو ذکر ہی اسے سلاگ دیتا تھا۔

”ابھی گزرے دنوں میں اس کے سامنے وہ معنی تبدیل اور بات کا شکار ہوئی تھی تو دل کے دشمنوں کو ہرا کیے ہوئے

”اوہو.....“ وہ معنی خیز انداز میں کہتی تھی،

”یہاں تو عشق و عاشقی سے بھر...“ صابر ان کی تھی۔

”کیا مطلب؟“ صابانہ نے اپنے برائیں لگتا... معنی سے طنز کیا تھا۔

”مطلب یہ کہ اگر وہ نفل ہوتا تو وہ دانت چیس کر بولی۔

”تو پھر...؟“ سن رستم سے وہ میرا۔

”تو نہیں سمجھ رہی؟“ سن رستم سے وہ میرا۔

”کس بات کی نہیں ہے۔ ہر وقت دفعہ تین سو دو لگانے کو تیار۔ اگر اسے کسی کو پھانسی دینے کا اختیار ہوتا تو وہ سب

گہری سانس لے کر اتنا چوڑا کرتا۔

”کس قدر غیبت ہوئی تھی...“ وہ تو ہم سب کا اتنا خیال کرتے ہیں حتیٰ ہر وقت ان سے....“ صبا اس کی بات پر

ترپ پی اٹھی مگر اس کی بات مٹل ہونے سے پہلے یہ وہ چلا گیا۔

”کیا... تمہارا مطلب ہے کہ میں ہی ہر وقت اس سے ملنے کو تیار رہتی ہوں؟“

”نہیں...“ وہ خود ہی ہر وقت بھڑوں کے چھتے میں اچھڑا لے کر بے تاب پھر رہی تھیں۔“ صابانہ بہت جلد سے طنز

کیا تو وہ دانت چیس کر بولی۔

”مجھے تو اس کا انداز دیکھو، کبھی اس کی حمایت نہ کرو۔ ابھی آتے دفعہ تمہارے ڈار سے بھائی سے لگے ہوئی ہے

ایک تو بمشکل کرنے سے پہنچی اور اسے ڈانٹ بھی بھی گور تھا۔“

”معاف کرنا تھی مگر تم دوڑی بالکل اندھوں کی طرح ہو۔“ صابانہ معذرت تو یوں ہی مردانہ تھی ورنہ لفظوں میں

اس نے صاف کوئی سے کام لیا تھا۔

”وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔“

”وہ سب تو کل تم معید بھائی سے کچھ زیادہ ہی نہیں لگتا؟“ صابانہ مسکراتے ہوئے کوئی محتاط سا انداز ہلکا لگا

چاہا تو وہ کچا چا جانے والے انداز میں مگھرتے ہوئے بولی۔

”نتیوں اندھی ہوں اور نہ ہی میرے سامنے کوئی ٹھنک پیدا ہوا ہے کہ میں اس بے رحمے تل سے کمرانی بھجروں۔“

”تو پھر اسے دیکھو اگر کوئی زلزلہ کمال لو۔“ صابانہ نے شور دیا تو وہ مسلک لگی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”معید بھائی بہت اچھے ہیں جن سے ان سے دوستی تو کر کے دیکھو۔“

”وہ سب کا اچھا دوست ہو سکتا ہے مگر میرا نہیں۔ میں اسے ہر طرح سے زکارد کچھ چکی ہوں۔“ اس کے لب و لہجے

میں خود بخود گڑواہٹ اتر آئی تھی۔

”اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو پوری زندگی پر اپلائی کرنا کہاں کی عقل مندی ہے معنی۔ اور پھر کزن شپ میں چھوٹے

موتے لڑائی جھگڑے سے چلتے ہی رستے ہیں۔“ صابانہ نے کونسل کرنا چاہا۔

”اس ساری بحث کا مقصد کیا ہے صبا؟“ اس نے سردہری سے پوچھا تو وہ لفظ بھر کو چپ سی ہو گئی پھر گویا اپنی بہت

باندھ کر کہا۔

”سب کی خواہش ہے جن کی کمر اور معید بھائی...“

”نہیں صبا۔“ وہ اس کے ادھر سے لفظوں ہی سے پوری بات کا مفہوم پائی تھی سو تیز لہجے میں اسے ٹوک دیا۔

”یہ سب کی خواہش ہوگی مگر میری خواہش نہیں ہے۔“

صابانہ نے کچھ کہنے کے لیے لب داکے تھے کہ وہ بول نہ گئی۔

”اور میں نے صابانہ بات کو پسین ختم کر دیا۔ نہ آج نہ آئندہ میں کسی معید حسن کے پروپوزل میں ایک فیصد بھی انٹرسٹ

لے لی ہوں۔ اس شخص سے محبت کرنا تو ڈور کی بات ہے میں اس سے متعلق ایسا کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔“ وہ اٹھ کھڑی

اٹھ گئی۔

اور چنانچہ اس کا کام کی غرض سے صبا کے کمرے میں داخل ہوا معید وہیں دروازے کے باہر بیٹھ گیا تھا۔

”اگر تم اپنی شدت پسندی اور خواہ تو اس کی ضد چھوڑ دو تو شاید یہ پروپوزل تمہیں اتنا برا نہ لگے۔“ صبا میں ضبط و

داشت کا مادہ حد سے زیادہ تھا۔“ صبا نے اپنی ہی ضد بانی کی تھی کچھ کر رہی تھی۔

”معید حسن اگر دنیا کا آخری شخص بھی ہوا تو میں بھی اسے پسند نہیں کروں گی اور نہ ہی کوئی ذہر دیتی اس سے متعلق

میرے خیالات کو بدل سکتا ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”کیا جانتی ہو تم...؟“ صبا کو بھی غصہ آیا تھا۔ تب لہجوں میں اپنا سو بدل کر وہ خوشی سے بولی۔

”یہی کہ اس کے لاکر میں ایک ڈائری ہے اور اس ڈائری میں کی بہت خوب صورت سی لڑکی کی تصویر ہے جسے معید

حسن عقیقہ خانے والا ہے۔“

اس کے لگتے بدلے انداز پر صبا اسے دیکھ کر رہ گئی تھی جب کہ اس کی بات سن کر معید خود میں عجیب سا محسوس

کرتے ہوئے بھکی سانس لیتا رہا دوسرے پلٹ آیا تھا۔

”فصل باتیں مت کر دو وہ داکے نہیں ہیں۔“ صابانہ اسے ٹوک دیا تو وہ عجیدگی سے بولی۔

”وہ جیسا بھی ہے صبا آج مجھ سے اس موضوع پر بات مت کرنا۔ نہ تو میں معید حسن کے لیے بنی ہوں اور نہ ہی

اپنے لیے ہے۔ جتنا اچھا وہ تمہیں لگتا ہے میں اس کے لیے اتنی اچھی نہیں بن سکتی۔“ اس نے بات ہی ختم کر دی

گی۔ صبا اس کے اندر داخل انداز پر اسے ڈھکی کر دی۔



اس لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا

جیسے کٹھن کا روپ، جسے رڈ کی دھوپ

پیسے بھندری یوں چسپے بن میں ہر

چسپے خوشبو لینے سے بھندری ہو

اس لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا

جیسے چٹا سمور جیسے ریشم کی ڈور

جیسے پر یوں کا رنگ جیسے مندل کی آگ

گائیں موندے وہ پوری طرح گانے کے بولوں میں گم آریز کوشلک گیا تھا۔ اس سے برداشت نہیں ہوا تو آگے

گھر ڈیک آف کر دیا۔ وہ چونک اٹھا تھا اگر دیکھو سامنے پا کر کسکرا دیا۔

”تم...؟“ وہ اٹھ بھاٹھا۔

”کیوں... تم کسی کی توقع کر رہے تھے؟“ وہ طنز پر انداز میں کہتی اس کے مقابل جا بٹھی۔ وہ ہنس پڑا۔

”تو قہ نہیں کر رہا تھا ابھی خواب میں دیکھ رہا تھا۔“ اس نے شرارت سے کہا تو ادینہ کو لگا کسی نے اس کا دل ٹھس جبر لیا ہو۔

”بہت خوش ہو؟“ چوتھی نظر سے اسے دیکھا تو وہ اٹلا اس سے پوچھنے لگا۔
 ”کیا نہیں ہوتا چاہئے؟“

”جہیں اس قدر چاہکے جاکے پسند آگئی تو فل؟“ اس کے سکتے لہجے کی آج تو فل تک نہیں پہنچی تھی اسی لیے مسکرا کر بولا۔

”نہیں یاد۔ بس دل نے کہا کہ یہی ہے وہ جس کی تجھے تلاش ہے۔ پھر میں نے بھی دل کے ساتھ زیادہ اُونے کو شش ٹھس کی کیوں کر دماغ کی بھی یہی بات ہے مونیہ تمہارے سامنے ہے۔“

”کرو فل؟“ ایسا کیا پسند گیا اس میں تمہیں؟“ اس سے ہار برداشت نہیں ہو پارہی تھی۔ تو فل نے حیرت سے اسے دیکھا پھر سامان بھرے بجے میں بولا۔

”اس میں کئی بھی کچھ نہیں ہے ادینہ۔“ وہ یکنکتہ پیٹ پڑی تو تو فل کو لگا جیسے سمجھتے اس کے سر پر آگرم ہو۔

”میں تو اپنے بچکانہ پن میں غلیل الرحمن کو اپنا بیٹھی تھی مگر اس کی قبولیت میں جا کر مجھ پر کھلا کہ میں میرا دل تو جا کب سے صرف اور صرف تمہیں اپنا مانا چلا آ رہا ہے۔ تم سامنے نہیں تھے جانے کیسے میں اپنی زندگی کی سب بڑی غلطی کر بیٹھی مگر تم نے بھی مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ تم ایک بار بھی مجھے اذادیتے تو میں لوٹ آتی۔“ وہ کیا رہی تھی تو فل کو سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ ذہن کے جیسے پر پڑنے آگئے تھے۔

ادینہ کا رد و پو تو بھی نہیں دیکھا تھا۔
 ”یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں ادینہ..... بھولش میں تو ہو تم؟“ وہ بمشکل اپنے ذہن کو سمیٹ پایا تھا۔ حتیٰ کہ کہا تو وہ آتکھیں پھر لائی۔

”اپنی غلطی کا احساس ہو جئے ہی اس شخص سے نا تا تو ذکر واپس چلی آئی تھی تو فل صرف اور صرف تمہارا لیے اور اب تمہی مجھے یوں غمگین کر کے خواب دیکھ رہے ہو۔“

”شفا ادینہ! ایک لفظ بھی مزید مت کہنا۔“ وہ صبر سے کاٹ رہا تھا۔ اونچی آواز میں اسے ٹوک گیا۔
 ”کیوں نہ بولوں! اپنی ساری زندگی کا حاصل اپنی خاموشی سے کیسے کروا دوں؟“ وہ ٹوپ لٹکی تھی۔ وہ جڑے بختی

گیاسی اس قدر غیر متوقع صورت حال نے اسے اندر تک ہلا ڈالا تھا۔
 ”میرے خیال میں تمہاری طبیعت خشک نہیں ہے ادینہ جا آ کر اکر دو۔“ وہ بہت نرم لہجے میں بولا تھا۔

”مجھ پر رحم کرو فل! میں بہت اکیلے ہوں۔ اب تمہارا بغیر تو میری جاؤں گی۔“ وہ اپنی عزت نفس کو کپس ڈالے ہرگز رزا ڈالنے کے موڈ میں تھی۔

تو فل کو اپنی کینیاں ملنے محسوس ہونے لگیں۔
 ”نی بولو یاد نہ پڑے۔ تمہیں کرم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ دانتوں پر دانت جمائے بولا۔ دل و دماغ تو ابھی بھی

لے پھرتی کے حصار میں تھے۔
 ”جانتی ہو تو فل! ابھی طرح جا جاتی ہوں۔ مگر مجھے معاملہ زندگی اور موت کا وہو عزت نفس کی پروا نہیں کی جا

وہ رو دیتی تھی۔
 تو فل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا رد و عمل اختیار کرے۔

اس سے پہلے بھی ادینہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے اسے اندازہ ہو سکتا کہ وہ اس میں انوالو ہے اور اب یوں جا چک وہ ہل گئی تھی۔

”آئی ایم سوری ادینہ۔“ بہت قتل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اپنا لہجہ نرم کیا تھا۔ ”میں تمہاری نیلگو سے بالکل ناراض تھا اور اگر ناراض ہوتا مگر میرا فیصلہ وہی تھا جو اب ہے۔ تمہارے لیے میں نے بھی ایسا نہیں سوچا۔“

”تو اب سوچ تو فل! ابھی کبھی وقت ہے۔“ اس نے ملجھنا انداز میں کہا تو فل کو لگا اس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔
 ”تم ابھی اپنے خواص میں نہیں بول رہے۔ اسی لیے یوں فضول باتیں کر رہی ہو۔“ اشتعال کی خفیفی ابھر اس کے

اُٹن کو لگا گئی تھی۔
 ”فضول باتیں نہیں ہیں تو فل۔ میری پوری زندگی کا معاملہ ہے۔“

”مگر میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ وہ بے حد سرد مہری سے بولا تو ادینہ کے خواص ٹھٹھرنے لگے۔ ”ایڈز باؤلس تو لی ادینہ! آج کے بعد اس موضوع پر کئی بات مت کرنا کیوں کہ میرے دل میں تم سے متعلق نہ تو ایسی کوئی فیملنگو ہیں اور نہ ہی ایسی کوئی جگہ ہے۔ ہم بہت اچھے زن اور بہترین دوست ہو سکتے ہیں مگر اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔“

”وہ بہت سرد اور بد اشتعالی سے مہربور ہے جس نے کہا اچھا کھڑا ہوا تھا۔“
 ”تو فل! میں نے صرف تمہیں چاہا ہے۔“
 وہ ٹوپ لٹکی مگر وہ مشتعل ہوا تھا۔

”شفا ادینہ..... اس ٹاپک کو سبیل کو بند کر دو۔ نہ تو اس سے کچھ حاصل ہے نہ وصول۔ میری زندگی میں تمہارا ایسی حصہ ہے جتنا پہلے تھا تو دیش آگئی۔“

”تم ایک بار پھر مجھے اکیلا کر رہے ہو فل۔“ وہ ہلکے لگی۔
 ”اگر کرم نے غلیل الرحمن کو پسند کیا تھا تو وہ چہارہ اپنی اپنی مرضی تھی اور اب جو کچھ تم کر رہی ہو اس کی ذمہ داری بھی صرف

میرے سر پر ہے عائد ہوتی ہے۔ اور ویسے بھی تم بیوی کے طور پر بھی میری آئینہ نہیں ہو سکتیں۔ وہ صاحبانے بالکل اس بات پر سوچنا میں اپنے جذبات و احساسات میں۔“ وہ بہت صاف گوئی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ادینہ کے دل پر چوٹ لگی تھی۔
 ”میرے جذبات میں بھی کوئی کھوٹ نہیں ہے تو فل۔“

”تم بھولو ادینہ! کرم نے غلیل الرحمن سے محبت کی تھی اور ایک سال تک تم اس کی بیوی رہی ہو۔“ وہ غصے سے بولا

”میری محبت کا تو خیال کرو فل۔“ وہ کزور لہجے میں بولی۔
 ”گیت آؤٹ ادینہ..... تم صرف اور صرف میرا دماغ خراب کر رہی ہو۔ جب تمہارا دماغ ٹھیک ہو جائے تب

سامنے بات کرنا۔“ تو فل کا ذہن واقعی کام نہیں کر رہا تھا۔
 وہ بارے ہوئے انداز میں اچھڑک رہی ہوئی۔

”آئی ایم سوری تو فل..... مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم میرے متعلق اتنی بُری سوچ رکھتے ہو۔“
 اس نے مہربانی سے لیتے ہوئے اندر کی ناراضگی کو کم کرنے کی کوشش کی تھی مگر پڑی سے بولا۔

گلابے تہہ ہارم

فرید قادیان

کچھ لوگ یاد آتے ہیں تہا، کبھی کبھی
ویران ہو بھی سکتے ہیں دریا، کبھی کبھی
مخاطرہ کے دل کے سمندر میں آجئے
طوفان ہو بھی سکتے ہیں برپا، کبھی کبھی

میں دُش رحمان اپنی فتح پرے انتہا خوش تھی۔ بے
پایاں خوشی کا اظہار کرتا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس
میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب اٹھتا چلا آ رہا
تھا۔ مجھے خوشی منانی چاہیے گی لیکن میں رو رہی تھی۔ چتا
نہیں یہ آنسو کیوں ہر جگہ پہلے چلے آتے ہیں۔ میرا دل
میری آنکھوں سے کئی گنا زیادہ درد ہا تھا اور میری گولیکز
میرے دل میرے جذبات سے بے خبر میری آنکھوں
سے نکلنے والے آنسوؤں کو خوشی کے آنسو تصور کر کے
مجھے چھین رہی تھیں۔ میرے سائے چہرے پر اس فتح کی
خوشی کے تاثرات کھوجنے کی کوشش میں وہ کئی بار مجھے
مخاطب کر چکی تھیں مگر بہت کوشش کے باوجود بھی میں
ایک دم کی مصنوعی مسکراہٹ بھی اپنے ہونٹوں پر نہ لا
سکی۔ جب دل بھی مردہ ہو جائے تو پھر بھلا کیا خوشی کیا
نہم۔ جو خوشیاں میرے نزدیک اہمیت کی حامل تھیں وہ تو

کب کی میری زندگی سے منہ موڑ چکی تھیں۔ پھر اب کی
خوشی اور کیا اس کا احساس۔
”دیکھو دُش کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ ہمیں ایک
زبردستی کی ٹریٹ چاہیے اور وہ بھی کسی اچھے۔
رہنہ ٹورنٹ میں۔“ مہرین بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی۔
”ہاں ابھی دُش ٹریٹ تو ضرور ہونی چاہیے بلکہ
تمہیں تو ہمارے مانگے بغیر ہی میں ٹریٹ دے دوں
چاہیے۔“ کھانزہ نے بھی مہرین کے خیال کی تائید کی۔
”جیسے ٹریٹ مل جائے گی میں نے کب انکار
ہے۔ جہاں جب تمہارا جی چاہے تم جلی جانا لیکن مجھے
اپنے ساتھ جانے کے لیے مجبور مت کرنا کیوں کہ مجھے
بہت ضروری کام ہے۔ یہ لو پیسے تم اپنی مرضی سے تپ
چاہے استعمال کرو۔“ میں نے پرس کی زپ بھول کر اس
میں سے ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال کر ان کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا تو ان کے چہرے لنگ گئے۔
 ”حکمرانی ہوڈرش تم بھی یہیوں سا طریقہ ہے نہ ریت
 دینے کا کہ فریٹ دینے والا غائب اور لینے والے
 حاضر۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ ہم ایسے بالکل نہیں
 جاہلیں گے تم ساتھ چلتی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں ایسی
 فریٹ نہیں چاہیے۔“ مہرین کو میرے ساتھ نہ جانے پر
 دکھ ہوا اور اس نے کسی ایکے جانے سے انکار کر دیا۔
 ”دیکھو ہر دم یہی طرح ہے جانتے ہو کہ میں مانی
 نہیں جاتی۔ مجھے یہ چیزیں مانتیں کتنی۔ میں نہیں
 جانتی کہیں بھی۔ جائز تم مجھے کی کوشش کرو۔“ میں نے
 بے زار اور حسیلے میں کہا تو وہ ہل کر گئیں۔
 ”تم نے اپنے اوپر یہ جو تہا پنا اور بے زاری کا لہا وہ
 اوڈھ رکھا ہے نا۔ اس کی اتار کر باہر نکل کر دنیا کی خوب
 صورتی دیکھو۔ بہت کشش ہے دنیا میں کتنے دلخیز
 نظارے۔ رنگ برساتے موسم یہ کشش۔۔۔۔۔۔
 ”بلں مہرہ مجھے نہیں سمجھتی اس دنیا کی یہ بھیا ک
 کشش کیاں روک دینے والی کشش کہاں ہے خوب
 صورتی؟ کہاں ہیں نظارے؟ مجھے تو کچھ دکھائی
 نہیں دیتا۔“ میں نے یہ دینا یہ موسم اس لیے اچھے گلے ہیں
 تا کہ تمہارے دل کا موسم اچھا ہے۔ بہاری بہار دکھائی
 دیتی ہے تمہیں ہر طرف لیکن میرے دل کا موسم تو ایک
 ہی جگہ ٹھہر گیا ہے۔ جہاں خزاں ہی خزاں ہے۔ خزاں
 رسیدہ ہے۔ پھولوں سے خالی کانٹوں بھری تھانیاں
 کڑی دھوپ کا سایہ اور ٹنگے پیروں کے پیچھے دھتے
 ہوئے انکار ہے۔ میں۔ میری بہاریں تو مدت ہوئی
 میرے دل کے جن سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہیں۔
 بھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے۔“ میں نے دونوں
 ہاتھوں سے اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے سوچا تو مہرہ کو
 تشویش ہوئی۔ ”کیا بات ہے؟ دُش بہار کے ساتھ کوئی
 برا بلے ہے کیا؟“ شازہ بھی پریشان ہوئی۔ ”آر یو او
 ہے؟“
 ”ہوں بس ذرا سر میں درد ہے۔ گھر جا کر تھوڑا سو

جاؤں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ دونوں یہ جانتی ہی
 نہیں تھیں کہ دنیا کی خوب صورتی جو کہ میرے نزدیک
 بد صورتی تھی اسے دیکھنے کے بعد ہی میں نے یہ تہا پنا
 خول اوپر پہنا ہے۔ میں کیا معلوم یہ دینا شاید پلٹا
 وہ نہ رہے جس کا فطرہ فطرہ فطوں میں موت کی
 تار کیوں تک لے جاتا ہے۔ موت کا تاریک اندیزہ ا
 دشتوں کے سامنے اٹھانے راتوں کا خوف۔ دا
 میرے نزدیک کچھ بھی نہیں تھی اس کی حقیقت میرے
 نزدیک ایک ٹھنڈے نہری کا منڈھی اور بس۔ ہنسنے مکرانے
 لوگ کتنے اچھے لگتے ہیں۔ میں بھی کبھی ہنسا کرتی تھی۔
 بے تحاشا ہنسا کرتی تھی۔ دنیا کے یہ معنوی رنگ مجھے
 بہت متاثر کرتے تھے۔ مجھے چاہی نہیں تھا کہ یہ رنگ
 کتنے کتنے اور پیکے ہیں خوشی۔۔۔۔۔۔ آسنو۔۔۔۔۔۔
 معمولی سے لفظ ہیں یہ لیکن ایک دوسرے سے کتنی
 مضبوطی سے جڑے ہیں۔ ہمارے جسم سے روح اس
 روح سے سانسیں جڑی ہیں اور ہمارے ہر سانس
 جڑے ہیں یہ تہا پنا لفظ۔
 میں اپنی خوشیاں اپنے غم صرف اپنی ذات سے ہی
 شیر کیا کرتی تھی۔ اپنے دکھ کی اور کے ساتھ شیر
 مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ بہت عجیب سا لگتا ہے۔
 مقابل کے سامنے اپنے دکھ سے رو رو کر دُش کی
 سے ہمدردی وصول کی جائے۔ چاہے اس کو ہماری
 بات سے دُش کی ہو یا نہ ہو اور پھر بھلا اپنے دکھوں کو
 دوسرے کے ساتھ شیر کیا بھی کیسے جاسکتا ہے۔
 اندر سے پھوٹنے والی خوشی جو جس طرح ہمعصر کو
 ہیں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ہمارے اندر
 اٹھنے والی لام یا دکھ کا لاوا صرف ہماری ذات تک ہی
 رہتا ہے۔
 میں دُش رحمان اسٹوڈنٹ کے سامنے بڑی بڑی
 تقریریں کرنے والی ہر بات میں دلائل دے کر اُن
 قائل کرنے والی ہر سوال کے جواب میں اُنہیں لا جا
 کر دیتے والی خود اندر سے کس قدر شک و ڈنڈہ حال تھی

کوئی نہیں جانتا تھا۔
 سبھی اکیس سنبھال کر کبھی میرے دیکھو یہ سوچ لینا
 وہیں پر میری شکست ہوگی جہاں میں میرا بیان
 ٹوٹے
 اور میں نے شکست کھا لی تھی میرا بیان نہیں ٹوٹا تھا
 مگر میری طرح شکست کھا لی تھی میں نے۔ صرف ایک
 عورت ہونا مجھے شکست دے گیا تھا۔ حالانکہ کتنے مضبوط
 کردار کی مالک تھی میں۔
 جو دے کہ وہ کراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر
 گئے
 ایسی ہی تھی میں بالکل۔ میں نے لاء کیا تھا۔ بہت
 شوق تھا مجھے دیکھ لینے۔ میری ماں نہیں جانتی تھی کہ
 میں اس فیملی میں آؤں۔ وہ نہ زانا نہیں گیس۔ نہ جگر بہ کار
 تھی۔ حادثات میں پل کر بڑھی تھیں۔ وہ مجھے ہمیشہ
 کہتی تھیں۔ دُش جان تم دیکھ لینے کا خواب میری
 دیکھو۔ بعض پنہوں کی تعمیریں بہت بھیا ک ہوا کرتی
 ہیں اور یہ دینا تو ہے ہی مردوں کی۔ انہی کی حکومت ہے
 انہی کا راج ہے یہاں۔ ہم عورتیں مردوں کے شانہ
 بٹانہ تو کسلی ہیں۔ ہر فیملی میں ان کا ساتھ تو دے سکتی
 ہیں لیکن ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ مردوں کے مقابلے
 میں عورت ہمیشہ کمزور ہی رہتی ہے۔ وہ چاہے کتنی بھی
 مضبوط ہو لیکن ایک مرد کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات
 نہیں۔
 لیکن میں دینا سے ٹکر لینے چلی تھی مردوں سے ٹکر
 لینے چلی۔
 مجھے نہیں پنے کہ جنوں کی حد تک شوق تھا اور میں
 اپنے اس شوق کے تحت اس شے میں چلی آئی۔ میں
 اپنے اس پنے کی بنیاد ایمانداری پر رکھنا چاہتی تھی۔ میں
 گورہ نہیں اور غریب لوگوں کی مدد کرنا چاہتی تھی اور
 میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ میں ایک مذہبہاد اور کامیاب
 اہل مائی۔ میں بھول ہی گئی تھی کہ جس سمندر میں میں تیر
 تھی۔ اس کی تہہ میں بہت سے خوفناک مگر پچھتی

ہیں۔ میں تو سمندر کی ہر کون سٹل دیکھ کر اس میں اتر گئی
 تھی۔ لیکن ایک حادثے نے مجھے اس فیملی سے ہمیشہ
 کے لیے دور کر دیا تھا اور میں اپنے رجان سے برکس
 تدریسی شے میں چلی آئی تھی۔ میں کتنی شکست و مذہوال
 تھی۔ یہ شاید صرف میں ہی جانتی تھی۔ کوئی خوشی تھی۔
 کامیابی اب میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔
 دکھوں کے برے میں کتنی خوشیاں ہوتی ہیں اور خوشیوں
 کے پیچھے کتنے دکھ پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں
 جانتا۔
 میری زندگی کی میرے حصے کی خوشیاں میری زندگی
 کے خوشگوار لمبے مسکراہٹوں اور خوشیوں کے وہ یادگار دنوں
 میں گزار چکی ہیں اور اب تو میری زندگی کے باقی دنوں
 میں میرے حصے کے دکھ ہی دکھ تھے۔ وہ دکھ جو بیچنے کی
 برسوں سے میری ذات کے ساتھ جڑے ہوئے تھے اور
 جنہیں اب ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہنا تھا اور میرے
 ساتھ ہی قبر میں دفن ہونا تھا۔ جو میری تہا پناؤں کے
 ساتھی تھے۔ لیکن چند ایسی مہتیاں تھیں جن کے ساتھ
 میں اپنی ہر خوشی ہر غم شیر کرتی تھی۔ میری ماں جو آج
 سے کی برس پہلے مجھے میری کیانو کے پردہ کر کے ہمیشہ
 کے لیے یہ دنیا اور مجھے چھوڑ گئی تھیں اور میری مانی جنہوں
 نے بہت سخت کر کے اپنے بڑھاپے کی پرواہ نہ کرتے
 ہوئے بھی مجھے بڑھاپا لگایا اور وہ کل بنایا انہوں نے
 مجھے اس قابل بنادیا کہ اس اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکوں
 اور پھر وہ خوشی مجھے چھوڑ کر میری ماں کے پاس چلی
 گئیں۔ اپنی دانت میں انہوں نے مجھے اس سنگدل دنیا
 کا مقابلہ کرنے کے قابل بنایا تھا۔ لیکن وہ بھی شاید
 میرے ذہن سے سوچ رہی تھیں یا پھر شاید انہیں یہ امید
 تھی یا آس تھی کہ میں مردوں کا مقابلہ کر سکیں لیکن
 کچھ نہیں ہوا ہی ہوا جو ازل سے ہوتا آیا ہے۔ میں بھی
 معاشرے کی لایوں یا سیکڑوں کہانیوں کی طرح ایک
 کہانی بن چکی تھی۔ ایک کمزوری عورت جو اپنے نا تو اس
 کتھوں پر اپنی مردہ روح کی لاش اٹھانے دنیا

والوں کے درمیان شہ مردہ زندگی گزار رہی تھی۔ کون میرے ساتھ میرے ہم بانٹ سکتا تھا۔ کون میری خفیوں میں شریک ہو سکتا تھا۔ کوئی نہیں میں نے اپنے خوشگوار دنوں میں بہت سے لوگ ایسے دیکھے تھے جو اپنی کھنٹی پر خندا سے شکوہ کرتے تھے اور میں بھی کہہ بیٹھا اسے کیوں شکوہ کرتے ہیں اگر اس نے ہمارے نصیب میں کچھ دکھ لکھے ہیں تو یقیناً اس نے ہمارے حصے کی خوشیاں بھی ہمارے نصیب میں لکھی ہوں گی لیکن تب مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان ہیس ہو جاتا ہے۔

بالکل سبکی ہوا تھا میرے ساتھ۔ کتنا کھن کا کام ہے کوئی گناہ نہ کرتے ہوئے بھی اس کا الزام اپنے اوپر لے کر زندگی گزارنا۔ نہ جانے دھڑکنے زدہ دل میں تڑپا رہی اور دکھ کے تیر ہیوسٹ کے زندہ رہنے کا حکم کیوں ہے۔ دکھ درد برداشت کرتے ہوئے کانٹوں اور انگاروں میں بھرے راستے پر زندگی کا سفر طے کرنا شاید اس زندگی کی مصراع ہے۔ جنت کی بشارت ہے اور جہاں صبر کا دامن چھوٹا قدم ڈال گئے تو دوزخ کے گہرے کوئیں کی خوراک بن گئے۔ لیکن یہ کیسی زندگی ہوئی بھلا رشتوں کے بغیر بچوں سے چودھرب کچھ ہوتے ہوئے بھی دامن دس دس دس دس۔

کوئی اگر مجھ سے پوچھتا کہ دنیا بھر کی دولت اور رشتوں میں سے تمہارا انتخاب کیا ہے تو میرا جواب اب ایک کڑوا بارشکیبی ہوتا "کوئی نہیں"

تمہاری کا عذاب خود افتی کی زندگی ایک ایسی چیز ہے جو زندہ رہنے دیتی ہے اور نہ مرنے دیتی ہے۔ یہ یقینی دیتی ہے زندگی اور موت کے درمیان کی کوئی جگہ ہوئی ہے شاید جہاں آپ کو نہ زندگی کا احساس ہوتا ہے اور نہ موت کا۔ آپ کی سمجھ میں ہی نہیں آئے کہ آپ زندہ ہیں یا مردہ۔ میں سمجھتی تھی کہ شاید دنیا میں آ رہے سے زیادہ لوگوں میں انسانیت موجود ہے۔ لیکن پتا نہیں وہ لوگ کہاں

ہیں۔ زیر زمین یاں دنیا کے پاس۔

لیکن پھر دنیا کی اس سیڑھی میں ایک ایسا شخص ملا جس میں انسانیت موجود اور میری بقیہ حالیہ زندگی کا باعث بنا۔ ورنہ میرے اپنے خون رشتے دار کچھ مرنے کے بعد ساتھ چھوڑ کے اور بچے جیتے جیسے ماریا۔ جب حالات سازگار تھے تو بھی رشتوں نے نوٹ

کر پیار کیا۔ سب نے بہت خوش السلوئی سے اپنا اپنا فرض نبھایا۔ مجھے اپنے تمام رشتوں سے بہت پیار ملا تھا لیکن پھر جانک حالات نے پلٹا کیا۔ تقدیر نے کوئی ایسا پلکار چلایا کہ مجھے اپنے بگائے ہوئے۔ ایک دم ہی سب طوطا چمچ ہو گئے اور میں تقدیر کی قسم لے کر پھر ان روئی کہ رشتے اپنی جی بدلتے ہیں۔ اپنے یوں بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ مجھے انھوں کے بچے جڑنے کا بہت دکھ تھا اور یہ دکھ میری رگ رگ میں اتر گیا تھا۔

میرا باپ جس نے میری پیدائش کے ڈیڑھ سال بعد ہی میری ماں کو صرف اس لیے طلاق دے کر دوسری شادی کر لی کہ بیان کی پسند کی شادی نہیں تھی۔ میری ماں چاقی تو وہ کسی شادی پر کتنی کتنی نہیں مردوات سے ہی نفرت ہو چکی تھی۔ اپنی بقیہ زندگی انہوں نے میرے لیے وقف کر دی لیکن شاید اندر ہی اندر اس دکھ کی جڑیں مضبوط ہوئی کتنی اور ایک دن وہ دنیا کے ہر گھر پر رشتے پر چھینچ رہی تھی اور میری پرورش کی ذمہ داری میری مانی کے سپرد ہو گئی۔ میری مانی اپنے بچے یعنی کہ میرے ماموں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ سب مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ ماموں ممانی میرے کزنز

سبھی مجھ پر جان چڑھتے تھے۔ مانی کے اس دنیا۔ چلے جانے کے بعد میں سب نے مجھے کاتھکا چھالنا بنا رکھا ہوا تھا کتنی پھر وہ حادثہ ہو گیا۔ اپنے مہرجا میں تو دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ لیکن اللہ صبر دے دیتا ہے۔ لیکن جب جیتے جی میں اپنے نانا تو ڈیر تو ان کی جدائی کا کہ صرف دل میں ہی نہیں روح تک اتر جاتا ہے۔ بل بل جینا اور بل بل مرنے کا بہت عذاب دیتا ہے۔ پہلے میں

میں جیتی تھی کہ دکھ برائے ہوتے ہیں اور خوشیاں اپنی ملکیت ہوتی ہیں لیکن سب رشتے چھوٹ جانے کے بعد پتا چلا کہ یہ دکھ درد تو صرف اپنی ہی ملکیت ہوتے ہیں کوئی دوسرا کسی کے درد کو محسوس نہیں کر سکتا صرف ایک ماں ایسی ہستی ہوتی ہے جو اپنی اولاد کے دکھ درد کو اپنے دکھ درد کی طرح محسوس کر سکتی ہے۔

میں اپنی ماں اور نانی کی قبروں پر چڑھ کر آج بھی گھنٹوں ان کے ساتھ اپنے دکھ سکھ شکر کرتی ہوں۔ کیوں مجھے معلوم ہے کہ صرف وہی دنیا میں دہشتاں ہیں جو میری خفیوں اور میرے غم کو اپنی طرح محسوس کر سکتے ہیں جسے میں کرتی ہوں۔ غم دکھ درد وراثت میں نہیں ملتے لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے غم وراثت میں ملے ہیں۔ ایک امریکی سوجس اس کے برعکس ہے لیکن میں سوچنے دیکھا کہ اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم کچھ

سوچتے ہیں کچھ کرتے ہیں اور امید اور توقع کچھ اور دیکھتے ہیں لیکن تقدیر کوئی اور تماشا دکھا دیتی ہے۔ مجھے بھٹائے طوفان اور زلزلے کیسے آتے ہیں۔ پسکوں پانی کی سطح پر چلتی ہوئی کشتیاں کیلٹ الٹ جاتی ہیں۔ عروج کو زوال کیسے آتے؟ میں یہ سب کھیل تماشا دیکھ چکی تھی میں کئی بھی تھی تو اپنی سچائی کے باتوں۔

میں کتنی خوش تھی اپنا کیس جیت کر۔ یہ فتح یہ خوش میرے لیے صرف چند روزہ ثابت ہوئی۔ اس عروج کے لیے کتنے بڑا زلزلہ اپنا تھا۔ یہ تو مجھے پتا ہی نہ تھا۔ اس روز کے رات ہوئے راستے میں میری گاڑی روک کر مجھے افوا کیا گیا۔ ایک بہت بڑی حویلی پر دیواروں پر لگا ہوا اسلٹو شیر "بازو گڑا ڈسکارڈ" کتے ہرن کی جان مورتیاں کتنے پر بالکل اصل کا گمان ہو رہا تھا۔ دروازے کی سائڈوں پر پھرہ دیتے ہوئے بڑی بڑی پیاموچھوں والے مٹی ٹائپ پھرہ داروں ان کی نظروں سے گزرتی ہوئی جوانیت اور غلاظت وہ شیطانت کا روپ روح فرسا کر دینے کے لیے کیا تھا۔ میری جگہ کوئی اور

ہوتا تو اس دہشت ناک جگہ سے خوف کھا کر رہے ہوتا تو ضرور ہو جاتا۔ مجھے کیوں افوا کیا گیا تھا میرا قصور کیا تھا۔ یہ اپنی سبب کی طرح جاتی تھی۔

اپنا کیس ہار جاتا ہے بعد کا جیہ دار بنے ہوئے واضح انداز میں ہار جاتے ہیں کئی دی گئی کہ میں جیتتا میرے لیے بہت مہنگا ثابت ہو گا۔ انہوں نے مجھے رشوت میں بھاری رقم دینے کی بھی آفر کی مگر میں مجھے جاگیر داروں اور امیروں کا نہیں کروڑوں اور غریبوں کا ساتھ دینا تھا۔ ان کا بازو بٹھا تھا۔ میرے انکار پر اس کی آنکھوں میں اترنے خون کو دیکھ کر ایک بار میں کئی مگر یہ تو وہم گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جرأت بھی کر سکتا ہے۔ میں نے اس کے لوفر کے کو سرا دلوائی تھی۔ اس کی سرا تو صرف چھوٹا سی لیکن اس نے جو سرا مجھے دی گئی وہ پوری زندگی کی تھی۔

میں روز نہیں کئی تھیں حالات و واقعات نے میرے دل کچھ ایسا جال بنا کر میں ضرور ہو گئی۔ میری ساری بھاری خاک میں مل گئی تھی۔ جاگیر دار کی شطہ بارخون اٹھتی ہوئی بدلے کی ہوس میں جلتی ہوئی لگا تھیں میرے حواسوں کو درد برم کر رہی تھیں۔ میرے رونے بلکے یا گڑ گڑانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں جتنا زیادہ روتی اس کے تقبیہ استغنیہ بلند ہوتے۔ میری آنکھوں سے گرنے والے آنسو اس کے دل میں لگی آگ کو بجھانے کا کام نہ کر رہے تھے۔

"بڑی لمبی تقریریں کر رہی تھی۔ اس دن عدالت میں۔" بڑی اکر رہی تھی۔ اب پتا چلے گا مجھے۔ آج کے بعد تو ساری عمر ہمارے آگے ہاتھ جوڑی نظر آئے گی۔ تو بے چارے کی اہالے۔ تو مجھے میرے بچے کو کچھ ماہ کی سرا دلوائی ہے۔ نا۔ مجھے ساری عمر سزا دلوائی۔ عمر قید ہو گئی تیری سزا تمہاری اس جیل سے زیادہ بھیا تک ہے اس حویلی کی قید۔ میں قید رہی تو تم ایک بکھر پڑی میں۔ چھ ماہ بعد میرا جنا جیل سے واپس آئے گا تو اسی دن تم اس کی دہن ہو گئی۔ یہی تمہاری سزا ہے۔ وہ سفاکی

سے کہتے ہوئے مجھے ایک ٹھوکر لگا کر ہٹا تو میرے جسم سے پیچھے سر کی نکل گئی۔
 ”مت کرو ایسے دیکھو تمہارے بیٹے نے اپنے لیے کی سزا پائی ہے اس نے جرم کیا تھا۔ پھر مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہوں۔“ میں گڑگڑاتے ہوئے بولی تو اس نے بے رحمی سے میرے بال اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر ایک زوردار جھٹیر میرے گال پر مارا۔
 ”جکواس بند کرو۔ تو دو گئے کی عورت میرے..... زک خان کے بیٹے کو زورداروں نے والی۔ میں تیرا وہ مشر کروں گا کہ تو آئینہ بھی دیکھے گی تو خود کو بچان نہ پائے گی۔ تیری ساری آنکڑاں جوٹی کی مٹی میں ملا کر نہ رکھ دوں تو میرا دم زک خان نہیں۔ تو نے جاگیر دار زک خان سے ٹکر لے کر اپنی چاتی کو آواز دی ہے۔ میں نہ تو تجھے مرے دل کا گورنر ہی زندہ رہے کے قابل چھوڑوں گا تو ترے کی اپنی موت کو۔“ اس نے پھر ایک جھٹکا دے کر مجھے پیچھے کی طرف دھکا دیا جس کے نتیجے میں میں دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی۔ خوف سے میں تھڑھک کر اب رہی گئی۔
 اتنی کڑی سزا میں سن کر ہی میرے روکھنے کھڑے ہو گئے۔ میری حالت ابتر ہونے لگی۔
 ”سائیں! آپ کے دوست شمرین خان آئے ہیں۔“ انہی شاید وہ اور اسے دل کی بجز اس نکالنا کر ایک آدمی نے آکر کسی کے آنے کی اطلاع دی۔
 اچھا چلو آئیے! بھٹا اور لوٹی جا چنے والی کا بندہ دست کر دوں گا تاہوں۔“ تجھے تو یہ نہ کیوں لگا؟“
 وہ دھڑکی نظر سے مجھے گھور رہا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے اطلاع دینے والا آدمی بھی باہر نکل گیا اور دروازے کو بند کر کے باہر سے لاک کر دیا۔
 میں کسی بھی ہوئی کی طرح سڑکڑی مٹی ایک کونے میں بیٹھی رہی۔ میرے معلوم تھا کہ میرے دروازہ پر پینے یا چھینے چلانے کا ان غلاموں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میرے آکسو میرے گالوں سے پھٹتے ہوئے میرے کپڑے

ہلکے تھے۔ جتنی قرآنی آیات اور سورتیں یاد میں وہ پڑھ ڈالیں۔ اپنی عزت اور رہائی کی دعا میں کانپتے ہنڈوں اور دل سے مانتی رہی۔ پوری رات بیٹھی۔
 دوسرا دن بھی گزر گیا رات آئی۔ سوائے ایک بوڑھے کمزور آدمی کے دو بارہ اس کمرے میں کوئی نہ آیا۔ بس وہی بوڑھا مجھے ایک ٹھیرے میں کھانا لاکر دے جاتا اور میں خاموشی سے اسے دھاتی رہتی۔
 کھانا کھانے کا ہوش ہی کب تھا۔ بھوک تو کہیں غائب ہو گئی تھی۔ صرف پانی پیتا تھا اور کسی چیز کو تو میں نے چھو کر نہیں دیکھا تھا۔
 ابھی کچھ آدھا کھنڈ پہلے وہ بوڑھا آدمی مجھے کھانا دے کر واپس گیا تھا اور اب اسے برتن واپس لینے آیا تھا اور وہی وہ ایک دم دروازہ کھلا۔ دیوار پر لگے والے کلاک نے دو بجے کا اعلان کر دیا۔ وہ بوڑھا آدمی اندر آیا اور اندر سے دروازے کو کھینچ کر لگادی۔ اس کی اس حرکت پر میں ایک دم خوفزدہ رہی۔
 ”دیکھو بیٹی میرے آگے پیچھے روکنے والی کوئی نہیں۔ میرے تمام کمرے والے بھی اس جاگیردار کے ظلم کا شکار ہو چکے ہیں۔ میری جان اتنی قیمتی نہیں تھی کہ تمہارا عزت قیمتی ہے۔ جاگیردار شمرین خان کے ساتھ کسی جرم کے فیصلے کے لیے دوسرے گالوں کیا ہوا ہے۔ مجھے تو خیر جاگیردار فوراً مار دے گا لیکن تمہارا یہاں سے نکلتا نہیں ضروری ہے۔ یہ تمہیں چھوڑیں گے نہیں بہت ظالم لوگ ہیں۔ بہت دردناک ہے پیش آئیں گے۔ تمہارے ساتھ۔ میں انتظام کر آتا ہوں تمہارے نکلنے کا۔ ساتھ والے کمرے میں سے ایک چور دروازہ نکلتا ہے۔ تھوڑی مشکل ہو گی لیکن تمہیں اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے ہمت کرنی پڑے گی۔ آگے تمہارا قسمت۔“ اور پھر اس نے مجھے تمام راستہ اور طریقہ کار سمجھا دیا۔ کمرے کے اوپر ایک روشندان تھا۔ جہاں سے مجھے دوسرے کمرے میں جانا تھا۔ اس بوڑھے نے اپنی قمیص کے نیچے پیٹ پر کھینچی ہوئی سی رکھی کہ

مجھے دی اور خود میرے سر پر ہاتھ رکھ کر برتن اٹھا کر باہر چلا گیا۔
 ”پچھیں جاگیردار کے واپس آنے سے پہلے اس علاقے کی حد کراس کرنی ہے ورنہ یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بوڑھے آدمی کی آواز میری سامعوں سے ٹکرائی تو میں نے فوراً تیزی سے اٹھ کر ری کو روشندان کے اوپر پہنچا۔ ایک جگہ وہ الگ ہی اور پھر میں وہاں سے کسی طرح نکل گیا۔ کیسے اس بوڑھے آدمی نے مجھے اس جاگیردار کے جنگل سے آواز کرایا۔ کچھ نہیں۔ اسدی کرن نظر آئی تو میں اس بوڑھے آدمی کے بیروں میں گر گئی۔ مٹی سے پس گئی کورتی میں ان کھول میں مجھے اپنی موت سے نہیں اپنی عزت سے خوف آ رہا تھا۔ میں گھر پہنچی گئی۔ یہ حفاظت اپنی عزت اپنی جان بچا کر میری حالت خراب ہو رہا تھا۔ پیاس سے کانٹے سے بھر گئے تھے جتنی میں۔
 میری ماں اور نانی زندہ ہوئیں تو مجھے اس حال میں دیکھ کر اسنے گلے سے لگتیں۔ پیار کرکشمیں میرے آنسو پونچھیں۔ پھر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ میرے واپس گھر آنے پر کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ ماموں کو میری صورت بھی دیکھا تو بارہ نہیں کیا تھا۔ سمانی کے سخت تیر جیسے الفاظ میرے دل کو کھینچ کر رہے تھے۔
 ”ارے اب کس لیے آئی ہے نہ کلا کر کے۔ راستے ہی میں کسی گاڑی کے نیچے آکر سر جانی۔ دو جوان بیٹیاں ہیں اس گھر میں تجھے گراس گھر میں رکھ لیا تو ان دونوں کو کون بیاہ کرے لے جائے گا یہاں سے۔ ساری عمر کوناری ہی رہ جائیں گی۔ یہ سمانی ہیں جن کی زبان مجھے بنی بنی کہتے نہ کھینچتی تھی۔ پھول جھڑتے تھے منہ سے اور آج انکار سے برس رہے تھے۔ شان میرا اتنا ہمدرد تھا۔ میرا دوست وہ کیسے مجھ سے لگا بیٹا چرا رہا تھا۔ زمین اور کلاہ کی نفرت سے مجھے دیکھ کر نہیں۔ سب کتنے انہی سے لگ رہے تھے۔ بدلے بدلے سے تیز میں دکھ سے انہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔ ہر طرح سے انہیں

یقین دلانے کی کوشش کی قسمیں اٹھائیں۔ لیکن ان سب سے تو مجھے کان ہی بند کر لیے تھے۔ انہوں کی یہ برائی میں نہیں بھراشت کرتی۔
 یہاں انہوں کی نفرت نے جیتے جی ہی مار دیا تھا۔ دنیا بھر میں صرف ایک یہی تو آشا تھ قہیں تو ٹھکانہ تھا۔ اب کہاں جانی؟ کسی نے پانی کو بھی نہیں پوچھا یہ بھی نہیں پوچھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا میں شگ خلق کے ساتھ یہ وہاں سے نکل آئی۔ کسی نے ایک بار بھی رکے کو نہیں کہا۔ سارا بھی نہیں اخلا تا بھی نہیں۔ کہاں جانا تھا؟ کیسے جانا تھا؟ کچھ ہوش نہیں تھا۔ بس اپنے کانڈھوں پر اپنی لاش اٹھاے چلی جا رہی تھی۔
 ”ارے گھر کیوں واپس چلی آئی۔ راستے ہی میں کسی گاڑی کے نیچے آکر سر جانی ہوئی۔“ سمانی کی سخاوت بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور پھر میری سی آوازوں کے پھوٹے میرے دل و دماغ پر برے چلے گئے۔ میں چلی جا رہی تھی۔ کس راستے پر کس طرح کچھ پتا نہیں تھا اور شاید میں مر ہی ہوئی اگر وہ گاڑی والا اچانک بریک نہ لگاتا تو شاید جسمانی طور پر بھی مر ہی جاتی لیکن گاڑی کو بریک نہ لگاتے لگتے بھی گاڑی جھ سے ٹکرانی گئی۔ مجھے شاید چوٹ لگی تھی۔ میرے سر سے خون بھی بہ رہا تھا لیکن مجھے کچھ نہیں آ رہی تھی۔ تو یہ جسمانی چوٹ تھی مجھے تو اس سے گہری بہت گہری چوٹ پہنچانی تھی میرے انہوں نے میں سے اسے ٹکر کر دو کھائی تھی لیکن میرا ذہن تو کھینا اور تھا۔ وہ شاید مجھ سے کچھ پوچھ رہا تھا کہ میں کیسے ہونے بچے ہوئے ہوئے دیکھا دے۔ یہ لیکن آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ کانوں میں بس سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ بہت سی ملی آوازوں کی بازگشت تالی دے رہی تھی۔ بہت سے چروں کا ہجوم آکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اچانک آکھوں کے سامنے اندر آ پھانے لگا اور پھر مجھے کوئی ہوش نہیں۔ ہاں اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ پتا نہیں۔

وہ گاڑی والا مجھے اپنی گاڑی میں ڈال کر کسی قریبی اسپتال لے گیا۔ جہاں میں دو دنوں بے ہوش رہی۔ مجھے بے ہوش میں آنے کے بعد جانک مجھے آواز آئی۔ ”مٹکس گا۔“ شکر ہے کہ آپ کو ہوش آگیا۔ ڈاکٹر دیکھیں نہیں بے ہوش آگیا ہے۔“ کسی کی آواز مجھے بہت قریب سے سنائی دی اور پھر چند ہی لمحوں بعد بہت سے چہرے دکھائی دیے لیکن وہ سب چہرے اچھی سے تھے کوئی بھی شمس چہرہ نہ تھا۔ میں نے ان سب کو باری باری غور سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن ان سب کے چہرے مجھے پانی کی لہروں پر لہراتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور میں ایک بار پھر غصہ کی کسی کیفیت محسوس کرنے لگی۔

شاید میں جلد اسپتال میں ایڈمٹ دی تھی۔ کچھ ڈاکٹر بھی میرا ہاتھ مارا کہ نہ جانے اس نے کیا نام لیا تھا۔ کسی شخص نے دن رات میری خاطر مجھے اپنا سکون اور نیند حرام کی ہے۔ میری خاطر میں تو اتنی اہم نہیں کہ کوئی میری خاطر اپنی نیند اپنا سکون پر باد کرے میرے دل میں ایک سوچ ابھری شاید گاڑی والا تھا۔ جو مجھے نہ جانے کتنی نظم و ضبط سمجھ کر میرا علاج کروا رہا تھا۔ بے وقوف شخص اور پھر مجھے دیکھنا سچ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نے کہنے کے مطابق اب میں ٹھیک تھی اور اپنے گھر جا سکتی تھی۔

اسے گھر؟ کون سا اپنا گھر؟ میرا گھر تو ایک طوفان میں ملیامیت ہو گیا۔ اب تو میں بے گھر تھی۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق میں ٹھیک تھی لیکن میں کہاں ٹھیک تھی۔ انہوں نے میرا دل چیر کر دیکھا کہ اب کچھ تھا اور کچھ لینے تو شاید ہیٹ کے لیے اسپتال میں ایڈمٹ کر لینے۔ مجھے پھر ایک نامعلوم راستے پر سونہا کر دیا۔ مجھے اب کیا کرنا تھا؟ کہاں جانا تھا؟ کہیں اور کو نہ جانا تھا؟ میرا ذہن و دل ان تمام سوالوں اور فکروں سے خالی تھا۔ مجھے تو اپنے وجود تک کا احساس نہیں ہو رہا تھا اور اگر ان سوالوں کے جواب کے لیے ایک مدت سوچنی بھی رہتی

تو بھی شاید جواب نہ ملتا۔ ”کیوں رو رہی ہو؟ کیا کسی عزیز کی ہے۔“ ڈھب ہو گئی یا کوئی بیمار ہے؟ میں اسپتال کی رپاداری عبور کر کے باہر لان کی طرف شکستہ و ذرا حال قدموں سے جارہی تھی کہ ایک غیر مانوس سی آواز میری سامنے سے گزرائی۔ ”میں رو رہی ہوں؟ کسی کے اس طرح پرچنے پر میرے ہاتھ فوراً اپنے چہرے کی طرف اٹھ گئے۔ واقعی میں تو رو رہی ہوں۔ میں منہ ہی منہ میں بہت جلدی آواز سے بڑبڑاتی۔

”کیا بات ہے جی بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔“ اس کا ہندو داند میرے پیچھے ہالے آنسوؤں کی رفتار میں مزید روانی کا باعث بنا تھا۔ ”ہاں بھی مگر گئے ہیں۔ کوئی بھی تو نہیں بچا کہ جس کے کندھے پر رکھ کر دو آنسو بہا سکوں اور میں بھی تو مر گئی ہوں شاید۔“ مگر پتا نہیں ابھی تک حرکت کیوں کر خالی نظروں سے اس عورت کو دیکھ کر بولی تو وہ میری بہن اور ابھی ابھی عجیب سی باتوں پر مزید اٹھ گئی۔ ”شاید پاگل ہے بے چارہ کی لینا دل کیسے ہے۔“ اس عورت نے اپنے ساتھ کھڑے شخص سے اچھلی تے کہا اور اپنی راہ لی۔

جی وہ گاڑی والا شخص چلا آیا۔ ”میں اندر گیا تو جی چلا کہ آپ کو دیکھا جا رہا ہے۔ سوچا کہ شاید چلی گئی ہوں گی۔ آئیے جہاں آپ کو جانا ہے آپ کو چھوڑے دیتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نہ جانے کیوں رد ہوں کی طرح اس کے ساتھ چلتی چلی گئی۔ میرے قدم اس کے ساتھ اٹھتے ہی چلے گئے اور میری میری زندگی کی ایک نئی شروعات تھی۔ اس موڑ پر آ کر میرے تمام رشتے بدل گئے۔ وہ جو ابھی تھے جنہیں میں جانتی تھی وہ میرے اپنے بن گئے اور جو میرے اپنے تھے وہ درہم کہیں رہ گئے۔

”اب آپ کیسے نقل کر رہی ہیں۔ آئی تھم تک کہ ابھی

آپ کو کافی ریسٹ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر کا بھی یہی خیال ہے۔ کم از کم پندرہ بیس روز تو آپ کو بیدار سے بچنے نہیں اترنا چاہیے۔

اس نے مجھے ہدایت دیتے ہوئے گاڑی کا لاک کھول کر میرے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔ تو میں خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی۔

”آپ بولتی ہی کم ہیں یا میری گاڑی سے نکلنے کا رد عمل ابھی تک بفرار ہے۔“ وہ بلی کی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ تو میں غیر ارادی طور پر ہی اس کی صورت دیکھنے لگی۔ لوگ مسکراتے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں لیکن کتنی مختصر خوشیاں ہوتی ہیں۔ میں اس کی مسکراہٹ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”آئی انکم سواری! مجھے احساس ہے کہ آپ کو کافی تکلیف پہنچ کر ملی تو دونوں باتوں سے بچتی ہے نا۔ میں نے بہت بار ان دیتے تھے مگر پتا نہیں آپ کیوں روڈ کے تپوں چل چل رہی تھیں اور اس پرستم کہ اسنے ہمارے دینے کے باوجود بھی آپ سائیز پر نہیں ہو رہی تھیں۔ آپ کی اس حرکت پر تو مجھے بھی لگ رہا تھا کہ شاید آپ وائس طور پر ایسا کر رہی ہیں اور میرے بریک لگاتے لگاتے بھی گاڑی آپ سے گمراہی گئی۔ خیر جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے اور اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصالحت پوشیدہ ہوتی ہے اور آپ تو شاید راستے سے ہٹنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ ورنہ تو بیت یہاں تک نہ پہنچتے۔“

کہاں اتار دوں؟ ”اسے اچانک یاد آیا تو بچنے لگا۔ آپ کو ہدایت دیتا ہوں میں خیال ہی نہیں رہا۔ آپ کو ”قبرستان“۔ میرے اچانک کہنے پر اس نے ہلک کر میری طرف دیکھا اور میرے کہے کے لفظ کو زیر لب دہرایا۔ ”قبرستان۔“ لیکن قبرستان کے دروازے پر تو وہ در تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ اس نے بہت حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”قبرستان تو خود ایک آبادی ہے۔ پھر کسی اور آبادی کی کیا ضرورت۔“ میرے صرف اتنا ہی کہنے پر وہ خاموش ہو گیا۔ پتا نہیں وہ خاموش کیوں ہو گیا تھا۔ لیکن چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولنا ہوا۔

”آپ قبرستان کیوں جانا چاہتی ہیں؟“ سوال انوکھا نہیں تھا۔

”مجھے وہیں جانا چاہیے شاید وہاں سے مجھے کوئی نہ نکالے اور کوئی کھانا نہ کھائی تو کھانا نہ کھائی۔“ میری آواز مجھے خود کو ہی جیسے کسی گہری کھائی سے آئی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ پتا نہیں اس راستے پر کتنے موڑز کر سکتے تھے مگر میں ہم نے سفر طے کیا۔

کچھ احسان نہ ہو سکا اور میں بھی خاموشی سے بیٹھی تیزی سے پیچھے رہ جانے والی روڈ کو فالس جماے دیکھتی رہی۔ ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے اس نے گاڑی روک کر بارن دیا تو ایک فل پر نظام میں ملیوں گیٹ۔ کہہ نہ گیٹ کو کھول کر اسے سلیوٹ کیا اور گیٹ کی سائیز پر اپنے کندھے سے کن لٹکانے لوپ سے کھڑا ہو گیا۔ گاڑی کیٹ کو کس کرتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ایک بہت بڑا گریج تھا۔ جس میں اس نے گاڑی کھڑی کر کے اتر کر میری سائیز کا دروازہ کھولا۔ میں ٹوٹی حالات کے رحم و کرم پر چلی۔ اس نے بہت احترام سے مجھے راستہ دیتے ہوئے اندر چلے کو کہا تو میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

”آپ کو پریشان ہونے یا ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ آپ تعریف لائے، میں بہت بے ضرر سا انسان ہوں۔ اس نے اپنے بے ضرر ہونے کا یقین دلانے کی کوشش کی یا پھر اس نے میری خاموشی کو خوف اور ڈر سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا۔ کتنی میں بھی تارک اندھ میرے سے ڈرتی تھی لیکن اب میں روشنی سے ڈرتی تھی۔ انجان لوگوں سے نہیں اپنوں سے ڈرتی تھی۔ جن راستوں پر چل کر آئی تھی ان سے خوف

زود تھی۔ ڈر کی خوف کی ایک دم سے کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ عجیب سی کیفیت سے دوچار تھی میں۔ ابھی ایک دم ہر چیز سے خوف آنے لگتا اور ابھی کسی چیز سے بھی میں خوفزدہ نہیں ہوتی تھی۔ میں اس سے کچھ کہے بغیر اس کی تقلید میں چلے ہوئے اندر پہنچ گئی تھی۔

کتنا بڑا گھر تھا کل جیسا اور اسی کے مطابق فرنیچر اور دوسری چیزیں تھیں۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز دیکھ کر بھی اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کی کیا قیمت ہوگی۔ بہت وسیع لان جس میں امپورٹڈ گھاس اور پھول پودے لگائے گئے تھے۔

شاید یہ کوئی بہت بڑا اسمگلر ہے یا پھر کوئی بزنس مین۔ لیکن مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کس شعبے یا کسی فیلڈ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اچھا ہے یا برا۔ مجھے فرق نہیں پڑتا، مجھے اس کی کیٹلیگری سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ میں تو مہمان کی حیثیت سے آئی تھی۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے جانے کی بجائے بی بی وی لاؤنج میں لے گیا تھا۔ بہت بڑا سالونج، کسی ڈرائنگ روم سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اتنے بڑے گھر میں اس کے علاوہ مجھے کوئی دوسرا فرد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مکمل سناٹا تھا بالکل ایسے ہی جیسے اس وقت میرے اندر تھا۔ میں بغیر کسی جذبے کسی ذریعہ خوف کے اس شخص کے ساتھ اکیلی اتنے بڑے گھر میں موجود تھی۔ مجھے جاگیردار کی وہ بھیا نک حوصلی یاد آگئی۔ ایک سنسنی سی میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔

میں نے ایک بار بھی اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اس کے بانی گھر والے کہاں ہیں۔ یادہ مجھے اپنے ساتھ کیوں لے آیا تھا۔

اس نے بہت احترام سے مجھے قریب پڑے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں کسی ردیوٹ کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کرتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس کا احترام میرے لیے حیرت کا باعث نہیں تھا۔ کیونکہ وہ میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ ورنہ شاید میرے خونی رشتوں

کی طرح ادب و احترام اور مہمان نوازی کا سارا سبق بھول جاتا۔

چند ہی لمحوں کے توقف کے بعد اس کے لب بلیٹ تھے۔ میرا نام سید حسن آفریدی ہے اور میں ایک بزنس مین ہوں اور آپ کے ذہن میں یقیناً یہ بھی سوال گردش کر رہا ہوگا کہ گھر میں میرے علاوہ آپ کو اور کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس گھر میں صرف میں ایک گیٹ کیپر ایک میری ہی طرح بے سہارا میرے گل خان بابا رہتے ہیں اور ایک میرا بیٹا شاہ زیب جو کہ ہوسٹل میں رہتا ہے۔ مجھے آفس سے آنے میں اکثر

دیر سویر ہو جاتی ہے اور اس لیے گل بابا کو میں نے کہہ رکھا ہے کہ میرا انتظار کیے بغیر 10 بجے تک سو جا پا کریں۔ ویسے بھی وہ بوڑھے ہیں انہیں اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے تکلیف دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ کل ایک اینڈ ہے شاہ زیب کو لے کر آؤں گا تو وہ آپ مل کر بہت خوش ہوگا۔ وہ بہت اچھا بچہ ہے ٹکس بوائے آئی لوہم وہ شاید تصور میں اسے اپنے سامنے رکھتے ہوئے محسوس کرتے ہوئے بولا تھا۔ یہ ہے میرا اور میری مختصر سی فیملی کا مختصر سا تعارف۔ اور یہ ساتھ میں واش روم ہے۔ جب تک آپ فریش ہوئیں میں کھانا ٹیبل پر لگاتا ہوں۔ اس نے مجھے واش روم کا راستہ دکھاتے ہوئے خود کوچن کا رخ کیا۔ تو میں بھی خاموشی سے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ بہت بڑا سا باتھ روم تھا۔ میں کتنی دیر پانی کے نیچے کھڑی اپنے دل میں لگی آگ کو ٹھنڈ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن یہ پانی تو جیسے آگ پر پیرول کا کام دے رہا تھا۔ میں اپنی کوشش میں ناکام ہو کر باہر نکل آئی۔ اس نے ایک بار بھی مجھ سے میرے بارے میں نہیں پوچھا تھا کہ میں کون ہوں کہاں آئی ہوں؟ کس حادثے سے دوچار ہوئی ہوں۔ بس اپنا تعارف کروا کے اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

میں جب واپس آئی تو وہ کھانا ٹیبل پر لگا چکا تھا۔

وہ نہ جانے کیسے میرے دل میں اٹھنے والے سوالوں کے جواب دے چلے جا رہا تھا۔

”آج بہت عرصے بعد اپنے گھر میں کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کا موقع ملا ہے اور بیوی مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے“ وہ بہت بے تکلفانہ انداز میں میرے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ میں جب سے اس کی گاڑی سے ٹکرائی تھی اس وقت سے اب تک میری اور اس کی کوئی خاص گفتگو نہ ہوئی تھی۔ وہ خود ہی سوال کرتا اور خود ہی جواب دیتا تھا۔ شاید اسے یہ کیلئے وہ رہ خود ہی سے نفی ہوئی کہ عادت ہو گئی کہ اور پھر اس نے مجھ سے کوئی جواب طلب بات باسوال بھی نہیں کیا تھا۔

”آپ کھانے کے بعد جانے تو ضرور پتی ہوں گی۔“ اس نے اپنا چاک بات کرتے کرتے رک کر میری جانب دیکھ کر پوچھا تھا۔

اس تمام عرصے میں بس یہی ایک جواب طلب بات کہتی تھی اس نے اور مجھے بھی شاید جانے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ جیسی تو چند لمحے کی خاموشی کے بعد میرا سر اقرار کی صورت میں ہلاتا اور پھر میرے سر ہلاتے ہی اس کے کھانا کھانے کے لئے ہوتے ہاتھ اور تیزی سے بائیں کرتی ہوئی زبان جسے حیرت سے رک دی گئے تھے اور پھر ایک لمحہ کی خاموشی اور حیرانی سے اس نے غور سے میری جانب دیکھا تھا اور پھر اپنا سر جھٹک کر دو بار کھانا

مجھے کچھ بھی کھانے کو نمی نہیں جا رہا تھا کیا میں میری
جو کچھ بھی میری پیٹ میں ڈال کر دے رہا تھا میں
کھانی چلی جا رہی تھی۔ کھانے کے ڈائنے کو تو میں محسوس
نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے کھارہی
تھی یا پھر شاید یہ خالی پیٹ کو بھرنے کے لیے اپنے
معدہ خوراک کا انڈیل رہی تھی۔ یہ نہیں میں نے کیا کیا
کھایا کتنا کھایا ہاں وہ جب تک بٹھا کھانا کھا رہا
تھی زہر مار کر رہی۔ جب اس نے کھانے سے ہاتھ
دکھاتو میں نے بھی ہاتھ کھینچ لیے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ چائے کے ساتھ پھر کمرے میں موجود تھا۔ ایک کپ میرے ہاتھ میں تھا کہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

ضرورت ہے۔ ایک یا دو ٹینٹس آپ کو اس وقت سکون اور اچھی نیند کے لیے ضروری ہیں۔

اس نے چائے کا کپ سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اٹھ کر ایک دروازے میں سے ٹینٹس تلاش کیں اور دو ٹینٹس میرے ہاتھ میں لا کر کھڑا ہوں۔ جنٹیلین میں نے بغیر چونچوں کے لہلہا ڈانٹ ٹیبل پر رکھ کر جگہ میں سے پانی گلاس میں انڈل کر اس نے میرے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ میں نے فوراً وہ ٹینٹس کھلیں۔

”آپ چائے کے فارغ ہو کر ریٹ کر بیٹھیں گا۔“

مجھ کو ملاقات ہو گئی۔ وہ چائے کے ڈانٹے سے لطف لیتا ہوا ہوا۔

دوسرے دن میری آنکھ کھلی تو اپنے ارد گرد کے
اجول رہے نظر دوڑانے لگی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔
کانٹے سے چپہ رہے تھے۔ شاید مجھے پیاس لگ رہی
تھی میں نے ارد گرد نظر دوڑائی شاید کہیں پانی رکھا ہو
لیکن کمرے میں موجود ہماری بھگم کر دوڑوں کی وجہ سے
کمرے میں دن کے وقت جتنی تقریباً اندھیرا آ جا تھا ہوا
تھوڑی سی تھیں نہ چاہا کہ اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کر دوں یا
نہ۔ پانی پالے آؤں۔ لاش آن کرنے کے لیے
سوچ سوچ کر پوئلہجی کی کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک بچہ
اندرا دل ہوا۔

”السلام علیکم آخنی“ اس بچے نے بڑے مہذب طریقے سے سلام کیا۔ لیکن میں پتا نہیں کیوں اس بچہ کو بدقسمتی سے یاد رہ گئی اس کے سلام کا جواب بھی نہ دے سکی۔ میں بھر سے بیڑ پر بیٹھ چلی تھی۔ اس بچے نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے گھڑ کیوں کے پردے پیچھے ہٹائے۔ تو سورج کی چمن چمن کرتی ہوئی روشن کرنوں سے کمرہ روشن ہو گیا۔ پھر وہ میرے پاس بیڑ پر بیٹھ گیا۔

”چتا رہے تھے کہ اب آپ ہمیں رہا دیں گے۔
 ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں۔ میرا ماشا ذہب ہے۔
 میں ہاٹل میں رہتا ہوں۔ آج ہی جاکے ساتھ گھر
 آیا ہوں۔ راستے میں انہوں نے مجھے آپ کے
 بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں آپ کو بالکل بھی
 شک نہیں کروں گا۔ پایا آفس چلے جاتے ہیں۔ گل بابا
 بیمار رہتے ہیں۔ میرے پاس بہت ہی اسٹوری بکس ہیں
 لیکن اگر آپ کو کھانا یا آبی تو میں آپ سے کچھ لینا
 کروں۔ مجھے اسٹوری سننا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں گل بابا
 کو کوئی اسٹوری آتی ہی نہیں اور پایا کو صرف دو ہی
 اسٹوری برآتی ہیں۔ شہزادے والی اور دہلی والی۔ پایا بہت
 کام کرتے ہیں۔ بس کام ہی کرتے رہتے ہیں۔ وہ
 بہت سارے گلوں کی مدد کرتے رہتے ہیں لیکن گھر کی
 کوئیں لاتے۔ صرف ایک گل بابا کو کھرا لیتے تھے اور
 ایک آپ کو لاتے ہیں۔ وہ مجھے بھی کہتے ہیں کہ اگر
 میرے ساتھ کسی بھی بچے کو میری مدد کی ضرورت
 پڑے تو ضرور مدد کروں۔ دوسروں کی مدد کرنے سے اللہ
 خوش ہوتا ہے اور پھر دنیا میں سب انسانوں کو اللہ نے
 ایک دوسرے کے لیے ہی تو بھیجا ہے۔ ہم ایک دوسرے
 کی مدد کریں گے۔ ایک دوسرے سے تعاون کریں گے
 یہی تو خوش رہ سکیں گے۔ میرے پایا مجھ سے بہت
 زیادہ پیار کرتے ہیں اور میں بھی اپنے پایا سے ڈھیر سارا
 پیار کرتا ہوں۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے
 اپنے باپ سے اپنے پیار کی حد سمجھانے کی کوشش کرتے
 ہوئے کہا۔ وہ پیاری پیاری باتیں کرتا رہا میں سنی چلی
 گئی۔
 ”پتہ ہے پایا میرے لیے برائی بنا رہے ہیں۔ وہ
 بہت مزے دار برائی بناتے ہیں۔ میں جب بھی گھر آتا
 ہوں دیکھ اندر تو وہ اپنے ہاتھوں سے میرے لیے کھانا
 بناتے ہیں۔ پایا میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ وہ
 میرے ساتھ شہزادہ اور کرم بھی کھیلے ہیں۔ گل بابا کو تو
 کمر کھانا آتا ہی نہیں۔ ہمیشہ مجھ سے ہار جاتے ہیں۔
 آپ کو کمر کھانا آتا ہے؟“ وہ بات کرتے کرتے مجھ
 سے پوچھنے لگا۔ ”آپ کو شہزادہ کھانا چھ لگتا ہے؟“
 اس کی بات پر میرے ذہن میں پھر پانی پاؤں اور
 آئیں۔ شہزادہ کی تو بازی جتنی بھی میں نے۔ ایک
 چال میں نے چلی تھی اور ایک چال اس جاگیر دار نے
 بھی چلی تھی اور ایسی چال چلی تھی کہ جس جیت کرم بھی ہار
 گئی تھی۔ لیکن جیت اس کی بھی کدو بارہ اس کی
 تنہا ہی بھول بیٹھی تھی کتنی بڑی چوٹ لگی تھی اس دل پر۔
 آج ایک بار پھر میرے گل بھونکے اتر آئے تھے۔
 ”سوری آئی آئی! اہم رٹیل ویئر سوری اگر آپ
 اسٹوری نہیں آئیں کرم اور شہزادہ کی آبی تو کوئی بات
 نہیں میں پایا کے ساتھ ہی کھیل لیا کروں گا۔ آپ مت
 روٹیں۔ میں نے آپ کو ہرٹ کروایا۔ اب کتنی نہیں
 کہوں گا۔ ویری سوری۔“ وہ اپنے خیمے خیمے ہاتھوں میں
 میرے ہاتھ تھام کر بریشان کچھ بیٹھا۔ ”آپ
 روٹ میں آئی ورنہ مجھے بھی روٹنا آجائے گا۔ مجھے وہ
 بھی آتا ہے۔“ اس نے کچھ اس معصومیت سے کہا کہ
 روٹے روٹے مجھے ہنسی آگئی۔ اس کو بھی اپنے باپ کی
 طرح بہت بولنے کی عادت تھی۔ وہ کل دوسرے دن تو
 نہیں لیکن باتوں اور عادات میں بالکل اپنے باپ کی فو
 کھا تھا۔
 ”دیکھنا آئی آئی آپ ہنسی ہوئی کتنی کیوت لگتی ہیں۔
 میں دیکھتا ہوں جی سے دعا کروں گا کہ وہ آپ کو یونہی منسا
 رکھے۔“
 کتنی پیاری کتنی معصوم کتنی سیدی باتیں تھیں اس
 کی۔ دل موہ لینے والی ہر بات کو دل سے سیدھا زبان
 تک لے آتا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اسے اپنے ساتھ لے
 ڈھیر سارا پیار کروں لیکن میں چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ
 سکی۔ شاید میں اپنی بدبیگنی کا سایہ اس پر نہیں پڑنے د
 جاتی تھی۔ میرا خلق مزید خشک ہونے لگا تھا۔ میں
 پھر کمرے کی طرف غور و خرواہی۔

”آپ کو کچھ چاہیے آئی؟“ اس نے میری نظروں
 کے تعاقب میں آگے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا سر
 اثبات میں ہلکا کر دیا۔ جو کوشش کے بھی پانی نہ مانگ
 سکی۔ وہ بوجھ بیٹھا کھانا چاہتا تھا۔ فوراً اپنے باپ کی طرح
 میرے دل کی بات سمجھ گیا۔
 ”آپ کو پیاس لگی ہے آئی۔ میں ابھی پانی لے کر
 آتا ہوں۔“ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا کمرے سے باہر نکل
 گیا اور میں حیران نظروں سے کمرے کے دروازے پر
 لگے آہ پار نظر آنے والے پردے کی لڑیوں کو دیکھ
 رہی تھی۔ کمرے سے نکلائے ہوئے جھکار پیدا کرتے ہوئے
 یہ دونوں باپ بیٹا ملٹی میٹھی کافن جانے تھے کیا جو۔
 میرے دل و دماغ میں گردش کرنے والی ہر بات کا
 سراخ منوں میں گنا لیتے تھے۔
 ”یہ نیچے آئی پانی۔“ ایک بار پھر اس بچے کے اندر
 داخل ہونے سے پردے کی لڑیوں میں ایک دوسرے
 سے ٹکرانے کے باعث ارتعاش ساریدہا ہوا تھا۔
 ”کوئلہ ڈرک بھی کتنی لیکن میں خضرا پانی لے کر آیا
 ہوں۔“ کیونکہ آپ کو پیاس لگی تھی اور جب پیاس لگی ہو تو
 کوئی دوسرا شرب پانی سے بہتر پیاس نہیں بجھا سکتا۔
 پانی ایک کمرے ہے۔ اس نے جگہ سے جگہ سے ہونے سے
 پانی اٹھ کر میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ بڑے بڑے
 بڑھوں کے انداز میں کہا تو میں اس کی بات پر قائل ہو
 گئی۔ ٹھیک ہی تو کھیر رہا تھا وہ خضرا سادہ پانی دھوئی کی
 فوت سے کم نہیں تھا۔ کتنا ذہین تھا وہ بچہ۔ اپنی جھپٹی سی
 عمر میں اس کی اتنی دانش مندانہ باتیں مجھے بہت اچھی لگ
 رہی تھیں کوئی اور موقع ہوتا تو میں دل کھول کر اس کی
 تعریف کرتی مگر اس وقت تو میری زبان میرے دل و
 دماغ کا ساتھ ہی نہیں دے رہی تھی۔
 ”میں آپ کا سرد پاؤں آئی۔“ اس کی معصوم آواز
 کی بازگشت نے میری سوچ کو بھگا کر اپنی طرف متوجہ
 کیا۔

”تمہیں بیٹا میرے سر میں تو درد نہیں ہے۔ میں نے
 اسے دھیرے سے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ مجھے خود
 اپنی آواز نہ سنی لگی۔
 ”اسلام علیکم! آٹھ گھنٹیں چلیں اچھا ہے تو دوسرا
 ریسٹ ہو گیا۔ کیا کھانا کھائی ہیں آپ؟“ وہ شخص
 اندر داخل ہوتے ہی اپنا سر ہٹا دیا۔ جو کہ شاید اس
 کا فرض بنتا بھی تھا کہ نہیں۔
 ”اب تو کافی بہتر ہوں۔“ میں نے بولنے کے
 ساتھ ساتھ مسکراتے ہوئے کمر پور کوشش کی لیکن نا کام رہی۔
 میں کی ٹھونک رہی تھی نہ کمر لگی۔
 ”شہزادہ یہ تو آپ کی بیٹی کی چکی ہوں گی۔ یہ ہے
 میری زندگی کا کل اثاثہ۔“ وہ اپنے بچے کی طرف محبت
 پاش نکا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولا تو وہ اپنے باپ کی
 ہانپوں میں جھول گیا۔
 ”پاپا! آپ جیسے دھیرے دھیرے گھر لے آئیں۔ آپ
 کے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ پڑھنا لکھنا۔“ کھینکا
 کودنا اور نہ ہی کھانا پینا چھ لگتا ہے۔ میں آپ کو بہت
 بہت مس کرتا ہوں۔“ وہ پیار سے اپنے باپ کے گلے
 اپنا گال لگا دیا۔ وہ بولتا تو اس نے بھی اس محبت سے
 اسے اپنے ساتھ لے لیا۔
 ”او کے بیٹا میں آپ کو جلد ہی گھر لے آؤں گا۔
 وہ دن ڈیڑھ ایڈلٹی پٹی۔“ اچھا چلو اب آئی کو باہر لاؤ ج
 میں لے آؤ۔ اسے کھانے کی خوشی میں انہیں سمجھ تو
 شامل کر دیا۔ ”وہ مسکراتے ہوئے بیٹے سے بولا۔
 ”پاپا آئی بہت اچھی ہیں۔ اب میں ان کو کمری نہیں
 جانے دوں گا۔ یہ اب ہمیں دین کی ہمارے گھر
 ہمارے ساتھ۔ کتنا اچھا لگے گا نا۔“ میں آئی کو کنگ
 نہیں کروں گا۔ اس کی معصومیت مجھے اسے پیار کرنے
 پر مجبور کر رہی تھی۔
 ”آئی آپ ہمیں رہیں گی نا؟“ اس بچے نے
 جواب طلب نظروں سے مجھ سے دیکھتے ہوئے بڑے

اشتیاق اور تجسس سے پوچھا۔

”مجھے اور کہاں جانا تھا۔ کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا لیکن ایک دم سے اسے بھی کیسے کہہ دیتی کہ میں یہیں رہوں گی۔ میرا بھیکار اس بات کا ثبوت تھا کہ میں اب انہی کے گھر وگم رہی تھی۔

”ہاں بیٹا آئی اب یہیں رہیں گی۔ اگلی مہر میں ہمارے ساتھ بلکہ ایک راتہاں کوکل ہی جا کر تمہارے اسکول کے پریسل سے بھی بات کر لیتا ہوں اسے ہوش کی بجائے گھر ہی رہنا۔ آپ کی اتنی بھی اکیس ہوں گی کیا خیال ہے؟“ اس نے کہا تو شاہ زیب نے خوشی سے مجھ کو اٹھا۔

”تو اگر بت پایا آئی لو۔ اب میں یہیں رہوں گا۔ اپنے بابا کے ساتھ اپنے گھر میں یا ہو۔“ وہ تو جیسے خوشی سے باطل ہو رہا تھا۔

کل بابا بھی بہت پیارا اور شفقت سے ملے۔ ”بیٹی کبھی یہ مت سمجھنا کہ میرا بابا ہے۔ اسے ہمیشہ پشیمان تھا سمجھنا۔ زندگی تو اچھے برے تجربات کے ساتھ گزری جاتی ہے۔ اور ہیشہ مالک اپنے بندوں کو آزمائش اور امتحان میں ضرور ڈالتا ہے لیکن صبر بھی وہی دیتا ہے۔ جیسے کا انداز دیکھو وہی سکھاتا ہے۔ تم دیکھتا ہے لیکن خوشیاں بھی وہی دیتا ہے۔ تم پریشان ہو جانا۔ یہ دنیا رشتوں کا گھر ہے۔ ایک رشتہ تو فنا ہے اور کسی رشتے اور بن جاتے ہیں۔ لغز اوقات خوشی رشتوں سے زیادہ ہے دنیاوی رشتے عزیز ہو جاتے ہیں۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ ہمیں تم ہے تو کہیں خوشی۔ ہمیں اپنے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تو بیگانے اپنے بن کر کٹھنہ تمام لیتے ہیں۔ بس زندگی گزری جاتی ہے۔ انہی چاروں میں۔ بس ہر حال میں رب کا شکر ادا کرنا ہے۔“ گل بابا نے بیٹی اور شگفتہ زبان میں میرے دکھ کو بانگ کرنے کو کہا۔

واقعی جو دکھ میری تقدیر سے جڑے ہیں میں انہیں کیسے خود سے جدا کر سکتی تھی۔ مجھے جب تک اللہ کی رضا ہے ان دکھوں کے ساتھ سہہ کرنا ہے۔ پھر یہ تو امتحان کی

گھڑی تھی۔ آزمائش تھی اور مجھے اس آزمائش میں پورا اترنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ اور اس دن میں خوب روٹی تھی بہت روٹی تھی اور سب نے مجھے رونے دیا تھا۔

”روٹی اپنے دل کا غبار ان آنسوؤں میں نکال چیکو۔ اس کے بعد مت رونا۔ یہ دنیا صرف بہادریوں کی ہے کمزوریوں کی نہیں۔ حاکم کی ہے حکومت کی نہیں۔ ہٹنے والوں کی ہے رونے والوں کی نہیں۔ بھول جاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ بھول جاؤ کہ تمہارے کوئی پرانے رشتے صرف یہ یاد رکھو کہ ہمیں باقی زندگی بڑھتے ہوئے نہیں ہوتے گزرائی ہے۔ کمزور بن کر نہیں بہادری بن کر گزرائی ہے۔ ہمیں کسی سے اپنی زیادتیوں کا بدلہ لینا۔ کسی سے اپنی جیتوں کا سلسلہ نہیں ٹانگنا۔ بس بلا خوف و خطر یہ زندگی اپنا حق سمجھ کر گزرائی ہے۔ کچھ تقدیر میں دکھ اور والا لکھتا ہے اور کچھ ہم پریشان ہو کر خود ہی بڑھا لیتے ہیں۔ حالانکہ ہم اپنے دکھوں کو کم کر سکتے ہیں۔ لیکن نہیں کرتے۔ دکھ اگر ایک قدم ہمارے طرف بڑھتے ہیں تو ہم دو قدم اس کی طرف بڑھا کر اپنی زندگی کو خودی غدا بنادے ہیں۔ زندگی ایک جاس ہے جو صرف ایک بار ملتا ہے اور یہ جاس اگر ہم کھو گویا تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ ہم ہیں تو زندگی ہے۔ تو نہیں تو نہیں۔“

کئی بار شاہ زیب میں گل بابا کی۔ میرے آنسوؤں پر خودی خشک ہوتے چلے گئے۔ میرے دل پر منوں بوجھ کی تہہ پٹی چلی گئی۔ اس گھر کے سب مکین بھی براثر اور غموں میں گرے گئے تھے۔ سیدی دل پر اثر کرنے والی باتیں۔

”میں ایک ان پڑھ جاہل شخص ہوں بیٹی۔ یہ ساری باتیں میں نے تم سے ہی سیکھیں ہیں۔ آج سے گیارہ برس پہلے مجھے یہ آفریدی بیٹے نے ہی سکھائی۔ تب میری حالات بھی بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ اس وقت تمہاری ہے۔ میرے دل پر ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ میری

شخصیت ہی بدل گئی۔ میرے دکھ میرے عزیز پس منظر میں چلے گئے۔ مجھے نئی زندگی دینے والا میرے اندر ایک نئی روح پیدا کرنے والا شخص ہے جو میرے لیے کسی ناخدا سے تم نہیں۔ یہ بہت عظیم شخص ہے۔ خدا اسے ہمیشہ سکھی رکھے۔ گل بابا آفریدی صاحب کو دعاؤں سے نوازتے گئے۔

”ارے گل بابا آپ تو مجھے زمین سے عرش پر بٹھانے گئے ہیں۔ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔ سب کچھ کرنے والی ذات اور بیٹھی ہے۔ میری ایک اوقات ہے۔“ وہ سوخا خواہی شرمندہ ہوئے لگا۔

”نہیں بیٹا اور ہیشہ مالک تو فقیر بلکہ گھریلو دنیا میں بیٹھ دیتا ہے۔ لیکن ہماری تقدیر بھی کبھی کسی کی شخص کے توسط سے سنو جانی ہے بدل جانی ہے۔ تم مجھے نہ ملے تو شاید میں کب کا مر گیا ہوتا۔“ گل بابا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا رنگ اتر نہ گیا۔ اپنے باقی کو یاد کر کے۔

”مات ایسا کہیں گل بابا مجھ گناہ گار کو اتنی اہمیت نہ دیں۔ یہ سب تو تقدیر میں لکھا تھا۔ میرے مالک نے جو تم مجھے دیا ہے شاید آپ کی ہی بدولت میں آج تقدیر نے آپ کو کیسے بڑھا دیا۔ میری وجہ سے آپ کی تقدیر بدلی گئی اس لیے تو اس مالک نے آپ کو مناسب مجھ سے دیا۔ اگر میرے پاس یہ سب کچھ نہ ہوتا تو بھلا میں کیسے آپ کی تقدیر بدل سکتا تھا۔ وہی دکھ کہہ کا مالک ہے۔ وہی سب کچھ کرتا ہے۔ ہم لوگ تو اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔“ وہ کہنے پر سکون اور نرم لہجے میں دھیرے بول رہا تھا۔

”ہر انسان کو خدا نے کسی نہ کسی مقصد کے تحت اس زمین پر اتارنا ہے اور شاید یہی مقصد ہے کہ میں آپ کی بدولت ملنے والی دولت میں سے آپ کا کھانا پر خرچ کروں۔ اس میں میری کوئی پروا ہی مجھے کوئی کرڈٹ نہیں جاتا۔ اس کا سارا کرڈٹ اسی کو جاتا ہے جس نے یہ حالت پیدا کی ہیں۔ میں اپنے جیسے میں

سے آپ لوگوں کو کچھ نہیں دے رہا۔ یہ تو میرے پاس آپ لوگوں کی امانت ہے جو آپ کو میں دے رہا ہوں۔ واپس کر رہا ہوں اور کس اور کچھ بھی نہیں۔ کیوں شاہ زیب میں شاید ٹھک کر رہا ہوں نا؟“ اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے تقدیر کر دالی۔

”میں بابا بالکل ٹھک کہہ رہے ہیں آپ۔“ شاہ زیب نے اپنے اپنے باپ کی سائیڈ لی۔ کتنا اچھا! کتنا صاف! کتنا فرخندہ صفت انسان تھا وہ۔ انسانوں کی صف میں فرشتے۔ میں لاشعوری طور پر اسے دیکھتی چلی گئی۔ ایک وہ جاگیر تھا خوشخوار وحشی درندہ اور ایک یہ ہے اس کے بالکل برعکس۔ ایک نے مجھ سے میری چھت میرے رشتے میری شہرت چھین لی اور ایک یہ ہے جس نے مجھ سے بیروں پر بھر کھڑا کر کے مجھے دنیا میں جینا سکھایا۔ درندہ میں تو کسی قابل نہ تھی۔ جو مقصد کے کمزور کی جانب چلی گئی وہ مقصد تو راستے میں ہی دم توڑ گیا تھا۔

”آپ صبر اور تحمل سے کام لیں۔ اپنی زندگی کو اپنا حق سمجھ کر اور اس زندگی کی قدر کر کے اس خدا کی امانت سمجھ کر رکھیں۔ ان دکھوں کو چھٹک کر دور چھٹک دیں۔ اپنے دل کا رگ مت ناس۔“ آپ دیکھے گا کچھ عرصہ بعد آپ اپنے اندر ایک نئی روح چھوٹ کر گریں گی۔ پرانی خوشیوں کو اپنی خوشیوں سے جدا کر کے نئی زندگی کی خوشیوں سے خوش ہو جائیں۔ خدا نے نئی زندگی آپ کے حصے میں بھی ہے۔ جیسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ رونا بھول جائیں ہنسنا سکیں۔ خوشیاں اور کامیابیاں آپ کے قدم چومیں گی۔

حسن آفریدی نے نہایت دھمکے لہجے اور بڑے وثوق کے ساتھ مجھے کسی دی کی میری چھتیں ہوں تمام خوشیاں مجھے واپس مل جائیں گی اور نہ جانے اس کے عام سے لہجے میں بھی ایسی ایسی شے کہ میں اس کی ہر بات کا یقین کر لی چلی گئی۔ حالانکہ میں ان حالات کا ٹکڑا ہو کر کہیں میں اب تک پہنچی کی اس کے بعد مجھے کسی سے

تسم کی توقع اور امید نہ رہی تھی میں تو خود کو ختم ہی کر چکی تھی۔

”مکھیں سس مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں یوں تو دخل نہیں دینا چاہیے۔ لیکن اگر آپ اسنے ان حالات جن کا آپ شکار ہو یہاں تک پہنچی ہیں مجھے بتا دیں تو آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور پھر آپ کے حالات سے کچھ آگاہی ہو جانے کے بعد ہم آپ کوئی مدد کر سکیں لیکن اگر آپ بتانا نہیں چاہتیں تو وہ ایک الگ بات ہے۔“ حسن آفریدی نے ملتے سے کہا۔

میں ایک بار پھر ہانسی کے بخنور میں ڈوب گئی۔ میری آنکھیں پھر ہندولانے لگیں۔ میرے تمام کزشتہ رشتے اپنی تمام تر چیزوں اور پیرفلز کو سمیٹتے تھے یاد آنے لگے۔ میں نے ایک ایک کر کے تمام باتیں گل بابا اور حسن آفریدی کو بتا دیں۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے ساتھ واقعی بہت برا ہوا لیکن آپ ایک بہادر لڑکی ہیں۔ میرا اتفاقاً تجربہ ہو چکا ہے کہ آپ کے رشتے دار اب آپ کو واپس قبول نہیں کریں گے۔ باقی بے گھر حاضر ہے۔ آپ اس گھر کو ہمارا گھر نہیں بلکہ اپنا گھر سمجھ کر یہاں رہیں گی لیکن میں ایک کوشش ضرور کروں گا آپ کے ماموں اور ممانی سے بات کرنے کی۔ ہوسکتا ہے کہ انجی اسی کے اندر انسانیت باقی ہو لیکن یہ تو ان سے ملنے کے بعد ہی پتا چلے گا اور سب سے اہم اور ضروری بات۔ آپ ایک وکیل ہیں اور آپ نے ایک نیک کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ نیکی کے کاموں کے راستے میں یہ چھوٹی موٹی رکاوٹیں تو آتی ہی ہیں لیکن آپ پہلی ہی رکاوٹ بڑھ کر نہیں۔ دینا تو یوپی رکاوٹ بنتی ہے۔ براہیے کام میں آپ اس میدان میں صرف اس لیے شکست کھا سکیں کہ آپ ایک عورت ہیں اور اس معاشرے میں عورت ہونا ہی ایک شکست ہے اور اس تصور کو اس معاشرے سے آپ ہی نے ختم کرنا ہے۔ آپ نے ہی ایک عورت نے ہی اس انجک کو ٹوڑنا ہے کہ عورت مرد سے کمزور ہے یا عورت مرد

کے مساوی ہے۔ آپ نے عورت کی بہادری کی ایک مثال قائم کرنی ہے اس معاشرے میں۔ آپ کو دنیا کو بتا دینا ہے یہ بات کرنا ہے کہ عورت بھی مرد پر غالب آسکتی ہے۔ عورت بھی فتح حاصل کر سکتی ہے۔ مرد کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ عورت کا بھی دل ہے دماغ ہے۔ وہ بھی کوئی مقام رکھتی ہے اس کی بھی کوئی حیثیت ہے، کوئی مرتبہ ہے عزت ہے عورت صرف ظلم سنے اور خود کشی کرنے کو دنیا میں نہیں بھیجی گئی۔ آپ کو اپنا مسئلہ منوانا ہے اور میں آپ کا ساتھ دوں گا اس میدان میں اس جنگ میں۔ آپ ہاریں گی نہیں جیتیں گی خالوں کے کہ کفر و درندہ پنچائیں گی۔ آپ اپنے مقصد کو یوں راستے میں نہیں چھوڑیں گی۔“

وہ نہ جانے کیوں اتنا جذباتی ہو گیا تھا۔ عورت کے معاملے میں۔ میں حیران نظر دل سے اسے دیکھتی رہی۔ کچھ تھا۔ اس کے حال کے ساتھ بھی کوئی درندہ گامی جڑا لگتا تھا۔ وہ مجھے جسم سے روح تک دکھ سے چھلنی نظر آیا تھا اس لئے۔ کیا دکھ تھا اسے جو وہ سب سے چھپا کر دہروں کی عذر کر رہا تھا۔ مرد ہو کر بھی وہ مردوں کے خلاف اپنے اندر اتنا زہر رکھتا تھا۔ ایسا کیا تھا اس کے ساتھ۔ میں اسے غور سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

شاہ زیب اس کی کوشش سر نہ رکھتے ہوئے سو گیا تھا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہوتے ہوئے میں دیکھ چکی تھی۔ اس نے فوراً نظریں جھکا لی تھیں اور بڑے آرام سے شاہ زیب کو اٹھا کر اس کے ہیڈروم میں سے لیا گیا تھا۔

اسے بھی کوئی دکھ تھا شاید رشتوں کا دکھ تھا۔ یا شاید کوئی اور دکھ لیکن اس دنیا میں کوئی بھی دکھ ہو۔ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ہر دکھ رشتوں سے جڑا ہوتا ہے۔ میں اس کے جانے کے بعد سوچنے لگی اور پھر میں اسی گھر کی ایک فرد بن گئی۔ میں نے بھی اس شخص سے اس کے دکھ کے بارے میں نہیں پوچھا۔ مجھے اچھا ہی نہیں لگتا تھا کہ میں اس کے ذاتی معاملات میں مداخلت کروں۔ وہ چاہتا تھا

کہ میں دوبارہ اپنی چھوڑی ہوئی فلیڈ میں جاؤں۔ لیکن میں ابھی اس فلیڈ میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ ابھی تو میرے تمام زخموں تھے۔ پھر کیسا یکدم میں اسی راستے پر چل پڑی جہاں سے اپنی بڑی چوٹ کھائی تھی۔ کیسے اس راستے پر قدم رکھی مس پر میں نے اپنے عزیزوں کو کھویا تھا۔

”اگر آپ زیادہ اصرار نہ کریں تو میں واپس ابھی اس فلیڈ میں نہیں جانا جاتی۔“ میں نے نہایت سے انکار کر دیا۔ وہ شاید میرے رد کی کیفیت کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اسی لئے خاموشی سے کہنے لگا۔

”آپ اگر میرے لیے کوئی اور جاہ آئی ہیں۔“

گھر میں مجھے دشت ہوتی ہے اپنے ہاں سے کیا کر کے اور یہ اختیار میں بھی نہیں کہ میں ماسی کو فراموش کر سکوں۔ میں نے اسے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

”نیک ہے بلکہ بہت اچھا ہے آپ کے لیے جاہ کرنا۔ آپ پیچنگ کر لیں گی؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں کر لوں گی۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔

”بہت اچھا تو پھر تمہیں کہ آپ کی جاہ کی۔ ابھی برسوں پہلے ایک اسکول کی پرنسپل نے مجھ سے کہا تھی بچہ تلاش کریں گے کہ کیا تھا اور میرا خیال ہے کہ آپ سے زیادہ اچھی نیچر تو انہیں مل ہی نہیں سکتی۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

اور پھر میں نے پیچنگ کر لی۔ میں اسکول کی اسٹوڈنٹس میں کافی پر رلرز رہی۔ پرنسپل بھی مجھے بہت پسند کرتی تھیں۔ تمام بچے سے بھی میری اچھی سلام دعا تھی۔ اس کے باوجود میں اپنے ماسی سے بہت ڈرتی تھی۔ اگر میرے ماسی کا کوئی کردار اچانک میرے سامنے آجائے تو میں کیا کروں گی۔

حسن آفریدی میرے ماموں ممانی کے پاس بھی گیا تھا۔ انہیں اوجھل سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن

انہوں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بالآخر انہوں نے حسن آفریدی سے کہا کہ ہمیں اس سے اپنی ہی بہداری ہے تو اپنے گھر ہی رکھ لو۔ مگر آئندہ ہم اس کی صورت دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔

میں نے اس سے سب سے بڑی عذری عموں کر رہی تھی حسن آفریدی کے سامنے اور پھر میں نے انہیں اپنی یادوں سے نکال کر پیچنگ دیا۔ یہ کیسے رشتے تھے جنہیں میرے دکھ و درد کا احساس ہی نہ تھا۔ میرے رونے کی پرواہ ہی نہ تھی۔ کیا میں رشتے کہلاتے ہیں۔ جو صرف خواہش حالی میں ساتھ دیں اور مشکل میں ساتھ چھوڑ دیں۔ نہیں رشتے تو وہ ہوتے ہیں جو مشکل میں بھی ہمارا ساتھ دیں۔ جیسے کہ حسن آفریدی نے دیا۔ اصل رشتہ تو اس سے تھا میرا۔ انسانیت کا رشتہ۔ بہداری کا رشتہ! احساس کا رشتہ! باقی رشتے تو بہت کچے تھے۔ جھوٹے تھے۔

اور پھر میں نے ان رشتوں کو بھول کر نئی زندگی کی شروعات کی۔ جس میں میرے نئے رشتے تھے نئی زندگی تھی۔ میں نے اور شاہ زیب میری کئی اچھی دوست تھیں۔ اس گھر میں رہ کر پتا چلا کہ حسن آفریدی کی کتنی اچھی شخصیت میں کتنے دکھ تھے۔ کیا عام سا نظر آتا تھا۔ بالکل حقیقت میں کتنے بلندر کہہ سکتا تھا کہ آپ کا تھا۔ یہ کوئی نیک ہو چھٹا ہاں اس کے اندر دکھ تھا۔ یہ میں نے آج تک جانے یا کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایک دن میں اسکول سے واپس گھر آئی تو غیر متوقع طور پر وہ گھر پر موجود تھا۔

”آپ۔۔۔ گھر میں۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟“ میں نے اسے بے موقع گھر پر موجود پا کر سوال کیا اور سوال کرنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا اور پریشان سا لگتا تھا۔

”کک۔۔۔ کیا ہوا؟ گل بابا۔۔۔ شاہ زیب تو ٹھیک ہیں نا؟“ اسے پریشان دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔

”ہاں سب ٹھیک ہیں۔“ اس کی لڑکھاتی ہوئی آواز نکلی۔

”تو پھر کیا ہوا ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ ڈاکٹر کو بلاؤں۔“ میری پریشانی اور تشویش بڑھتی گئی۔

”نہیں..... میں تو..... ذرش آج میں میرے پاس جو ایک بچا کھچا رشتہ تھا میں اس سے بھی محروم ہو گیا۔“

”کون سا رشتہ؟ کیا رشتہ؟ صاف صاف بتائیں۔“ میں اس کی ابھی ابھی باتوں پر چیخنے کے سے انداز میں بولی۔

”میری بہن مرگئی ہے ذرش آج میں بالکل اکیلا ہو گیا ہوں۔“

”بہن مر گئی ہے۔“ میرے کڑے ہوئے اعصاب جیسے ڈھیلے پڑ گئے۔ یہ تو کبھی اس نے بتایا ہی نہیں کہ اس کی کوئی بہن بھی ہے لیکن میں نے بھی تو کبھی نہیں پوچھا۔

”کیا ہوا تھا آپ کی بہن کو کہاں رہتی تھی وہ؟“ میں نے ایک دم اس سے سب کچھ جاننا چاہا۔

”وہ اسپتال میں تھی۔ تھرو ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی جب وہ کسی کو پسند کرنے لگی تھی۔ اس کی سبلی ثناء کا بھائی بھی اسے پسند کرتا تھا۔ کئی بار ثناء نے اسے کہا کہ میرا بھائی تمہیں پسند کرتا ہے لیکن حور یہ نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ اور ثوبان ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ثوبان ثناء کا کزن تھا۔ ثناء اور اس کا بھائی ضد میں آ گئے اور حور یہ کو تنگ کرنے لگے۔ ثوبان اور حور یہ کی منگنی ہو گئی۔ یہ بات ثناء کے بھائی کو برداشت نہ ہوئی اور اس نے حور یہ سے انتقام لینے کی خاطر اس کی زندگی برباد کر دی اور ثوبان کے گھر والوں نے حور یہ اور ثوبان کی منگنی توڑ دی۔ بے در پے صدموں سے حور یہ کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور اسے مینٹل اسپتال ایڈمٹ کروانا پڑا۔ میری ماں یہ صدمے برداشت نہ کر سکی اور ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چل بسی۔ ثناء اس کا بھائی اور گھر

والے فرار ہو گئے۔ ان کا آج تک نشان نہ مل سکا۔ میرے والد میری ماں سے بہت پیار کرتے تھے۔ بیٹی کا صدمہ اور پھر بیوی کی جدائی نے ان کی کمری توڑ دی۔ وہ بالکل چپ ہو گئے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ ایک برس گزر گیا۔ میری بہن نے مینٹل اسپتال میں ہی ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس بچے کا کیا قصور تھا۔ وہ اپنی مرضی سے تو اس دنیا میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے میں اسے گھر لے آیا۔ والد صاحب نے اس بچے کو دیکھا اور وہ بھی مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چل دیئے۔ اب میرے پاس کیا بچا تھا۔ ایک پاگل بہن اور اس کا بیٹا۔ میں اپنی بہن سے بہت پیار کرتا تھا۔ جان چھڑکتا تھا اس پر وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ کتنا خوش حال گھرانہ تھا ہمارا۔ کتنے خوش تھے ہم۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ایک ہی رشتہ بچا تھا۔ اسی کو نبھار رہا تھا۔ مجھے وہ پاگل بھی قبول تھی۔ زندگی میں ایک رشتہ تو تھا ناں۔ ایک آس تو تھی ناں کہ وہ کبھی نہ کبھی ٹھیک ہو جائے گی۔ میں اسے خوشیاں دوں گا۔ اسے گھر لاؤں گا۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھے گا تو سب کچھ بھول جائے گی۔ لیکن کچھ ایسا نہیں ہوا۔ میں اکیلا رہ گیا اور میری بے بسی دیکھو کہ میں اسے گھر بھی نہیں لاسکتا۔ اس کی میت کو گھر لا کر کس حیثیت سے اسے گھر سے رخصت کروں گا۔ شاہ زیب کو تو کچھ نہیں پتا وہ کیا کہے گا۔“ وہ کتنا بے بس نظر آ رہا تھا۔ اس لمحے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کے لیے کیا کروں۔ اسے کیسے تسلی دوں۔ وہ تو غموں اور دکھوں میں گردن تک ڈوبا ہوا تھا۔ میرے الفاظ اسے کیا تسلی دیتے۔

”آپ جائیں ہمت اور حوصلے سے اپنی بہن کی میت کو اپنے گھر لے کر آئیں اور یہیں سے اسے اگلے گھر کی طرف رخصت کریں۔ ورنہ آپ کے دل میں ساری عمر کے لیے یہ حسرت رہ جائے گی اور آپ کبھی خود کو معاف نہیں کر سکیں گے۔“

”مگر وہ شاہ زیب؟“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”شاہ زیب کے لیے وہ آپ کی بہن ہوگی۔ اس کی

اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھیں انہیں بھی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس دلانے کی زندگی کی طرف لوٹنے پر آمادہ کروں۔ آپ اس جنگ میں میرا ساتھ دیں گے نا؟“ میں نے یقین کے ساتھ کہا تو وہ میرے اور قریب چلا آیا۔

”ہمارا راستہ ایک ہی ہے۔ ذرا اور انتہا اللہ منزل بھی ایک ہی ہوگی۔ میں اس راستے پر آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

اس کے الفاظ نے نہ جانے مجھے کیوں گنگ سا کر دیا۔ میں مزید کچھ بولنے بغیر ہی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی، وہ چند ثانیے بعد ہاں اٹھاتا رہا پھر سر جھک کر چلا گیا۔

میرے دلچسپہ گفتگوئی بننے لگی تھیں۔ کمرے کی پھونکنے لگی تھیں۔

اس کے الفاظ میرے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔

”ہمارا راستہ ایک ہی ہے ذرا اور انتہا اللہ منزل بھی ایک ہی ہوگی۔ میں اس راستے پر آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

میں اب ہی آپ مسکرانے لگی تھی۔ حسن آفریدی مجھے اچھا لگتا تھا شاید۔ میں اس سے پیار کرنے لگی تھی۔ اس کی بات کرتے ہوئے اس سے نظریں جدا کرنے کی سیرمیری ضرورت نہیں تھی۔ پھر میں اپنی دلیس دے کر مقابل کو خاموش کروانے والی ذرا دھماکا حسن آفریدی کے سامنے مجھے بیٹا ہی بھول جاتی۔ سارے الفاظ جیسے کہیں کھوسے جاتے۔

شاہ زیب مجھ سے اور میں شاہ زیب سے بے حد مانوس ہو چکے تھے۔

”آپ جتنی اچھی ہیں نا آجی۔ جب سے آپ اس گھر میں آئی ہیں گھر کتنا اچھا لگنے لگا ہے۔ کاش میں آپ کو بھی کہہ سکتا۔“ ذرے کے دران اچانک شاہ زیب نے زنیٰ مصومی خواں کا اظہار کیا تو میں گڑ بڑاں لگی۔

مجھے اس کی بے بسی پر رون آ گیا۔ ”آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں ایسا بھی کر سکتی ہوں۔ شاہ زیب تو بہت پیارا بچہ ہے۔ آپ کو تو خبر ہونا چاہیے کہ آپ کو اس کا آپ ہونے کا درد ملا ہے۔ اگر آپ اسے گھر لانے کی بجائے کسی سیم خانے میں ڈال دیتے تو کیا زندگی ہوتی اس کی۔ آپ نے تو اتنا بڑا کام کیا ہے کہ شاید آپ کی ہر کوئی اور ہوتا تو سچی نہ کہ پاتا۔ مجھے خبر ہے آپ برادر اور بھی کہ آپ جیسے انسان کے گھر بھرنے کی جگہ لیں۔ آپ جیسے انسان کا ساتھ ملا اور جینے کا ڈھنگ بھی آج مجھ میں ایک نئی روح بیدار ہوئی ہے۔ میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کر رہی ہوں۔“

”اور سے ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ میں جاتے ہوئے راستے میں آپ کو آپ کے اسکول ڈراپ کر دیتا۔“ حسن آفریدی اپنے اس جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

”نہیں میں نے سوچا ہے کہ میں بچکچ نہیں کروں گی۔“ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر آپ نے تو اپنی پسند سے یہ جواب کی کسی۔“ وہ ران ہوا۔

”ہاں کی تو تھی لیکن اب سوچتی ہوں کہ ہمارے حاشے میں نیچر تو کافی تعداد میں موجود ہیں۔ میں کوادو آؤں گی ضرورت مندی جگہ پر پہنچتی ہوں۔ لیکن جی ایسے ہیں جنہیں میری ضرورت نہیں۔ پھر میں اپنی ملازمتوں کو ترک کیوں لگاؤں اور پھر اب تو آپ کا گھر بھی ہے نا کوئی جاگہ اور غواہ کر بھی لگے تو آپ جانے تو آئیں گے نا۔“ میں ذرا سی خوش ہوئی تو وہ گھرانے لگا۔

”اوس کا مطلب ہے کہ آپ زندگی کی طرف لوٹ لگی ہیں۔“ وہ خوش سے بولا۔

”ہاں میں تو زندگی کی قدر و قیمت سمجھتی ہوں اور اب کی طرف لوٹ آئی ہوں۔ لیکن اب یہ بھی فیصلہ لیا ہے کہ میری طرح کی اور لڑکیاں جو ظلم کا شکار ہو کر

تمہارے پاس پام سے اتنی بڑی بات کیسے چھپا سکتے تھے۔“ حسن آفریدی نے اس کے منہ کے کا جواب دیا۔

”لیکن پایا آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ میں بہت بڑا ہوں۔ میں مر ہوں پایا اور مرد تو برداشت کرنا جانتے ہیں نا مجھے کہ آپ پھر میں بھی تو برداشت کر لیتا ناں۔ اب بھی تو ان کی موت کو برداشت کیا ہے ناں۔“ شاہ زیب نے کہا تو حسن آفریدی کی آنکھیں کم ہوئیں۔

اس نے شاہ زیب کو اپنے ساتھ لگایا۔ میری آنکھیں بھی ہینکے گئیں۔

اس معصوم کو کیا پتا تھا کہ وہ مرنے والی اس کی پھوپھو نہیں بلکہ ان کی بھی اور جیسا ایک سی حقیقت تھی کہ جسے شاہ زیب کے سامنے ظاہر بھی نہیں کیا گیا تھا۔

”پلیز ذرا آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔“ دوسرے دن صبح میں ناشتہ بنانے یکن میں گئی تو حسن آفریدی میرے پیچھے چلا آیا۔

”کیسا وعدہ؟“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”دیکھیں حوریہ کے اور شاہ زیب کے رشتے کے بارے میں میں نے سوچا ہے کہ جوتنا ہے۔ آپ بھی کسی سے نہیں کہیں گی۔ سب کی نظر میں شاہ زیب میرا بیٹا ہے اور میرا بیٹا ہی رہے گا۔ بلا کو بھی اس بارے میں ظن نہیں میں شاید آپ کو بھی نہ بتانا لیکن اس دن زنیٰ بھی کچھ اتھرا لگتا تھا کہ جذبات چل گئے اور میں بہن کی محبت میں سے سب کچھ کہہ گیا۔

”میں شاہ زیب کو کھانا نہیں چاہتا اب یہی میری زندگی کا کل اثاثہ ہے۔ آپ سمجھتی ہیں نا میری بات۔“

اس کو اپنے ہاتھی کے راز کے کھل جانے کا ذرہ تھا۔ شاہ زیب سے محبت تھی اسے اپنی بہن کی ناجائز اولاد ہونے کا نہیں بلکہ اپنی بہن کا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ اسے اپنے سینے سے لگاتے باقی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔

شاہ زیب اس میں اپنے بڑھاپے کا سہارا بنانے کی خواہش لیے ہوئے تھا۔

مان نہیں اور پھر اگر کبھی زندگی کے کسی موڑ پر ایسے حقیقت کا پتا چل بھی جاتا تو آپ کو بھی اس زیادتی کے لیے معاف نہیں کرے گا۔“ میں شاید غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

شاہ زیب اور میں بابا حیران ضرور ہوئے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ حسن آفریدی کا دور کہ انسان ہے۔ اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔

اب مجھے پتا چلا تھا کہ اپنے اندر مردوں کے خلاف اتنا زہریلوں رکھتا تھا اس کے گھر اور بہن کی زندگی تباہ کرنے والا بھی ایک مرد ہی تھا۔ اسے رشتوں سے محروم کرنے والا بھی ایک مرد ہی تھا اور مرد دنیا کے جس کو نے میں بھی ہوگا بھی خوش نہیں رہ سکے گا وہ سن

آفریدی اور اس کے گھر والوں سے فرار ہو کر چھپ گیا تھا۔ لیکن اللہ کی پہنچنے کے کئی دور جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے اس کی سزا بھی چکی ہو لیکن اللہ کی انسانوں کے ساتھ کی نئی زیادتی کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا اور اس کا انتقام ہم سب سے بہتر ہوتا ہے۔

نہ جانے کیوں میں حسن آفریدی کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ مجھے وہ خود سے بھی زیادہ دھی لگنے لگا تھا۔

”پاپا آپ مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں کرتے۔“ ایک دن شاہ زیب نے حسن آفریدی سے کہا۔

”جھپٹیں یہ کیوں لگا کہ تم میں سے پیار نہیں کرتا؟“ اس نے حیران کی طرح کہا۔

”اس لیے کہ آپ نے میری پھوپھو کے ہونے کے باوجود مجھے اتنے پیار سے رشتے سے محروم رکھا۔ بہت زیادتی کی آپ نے میرے ساتھ۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ اس نے دھجی لہجے کے ساتھ ٹھوکر دیا۔

”آئی اہم سوری میری جان میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن مجھے تم سے بہت پیار ہے۔ خود سے بھی زیادہ۔ میری بہن کی حالت ایسی کی کہ میں اگر کہیں اس سے ملو اتنا تو تم زیادہ دھی ہو جاتے۔ تمہارا اس سے نہ ماننا ہی بہتر تھا۔ خدا کو یہی منظور تھا۔“ میں مجبور تھا۔ بیٹے ورنہ

اچانک حسن آفریدی کی طرف دیکھا تو وہ بھی پہلو بدلے لگے۔

”آئی بتائیں نا کیا میں آپ کو می کہہ کر بلا سکتا ہوں۔ میرا بہت دل کرتا ہے کہ میں کسی کو می کہہ کر بلاؤں۔ میرے سب دوست اپنی اپنی می کی باتیں کرتے ہیں اور جب میں آپ کی باتیں کرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ وہ تمہاری می تو نہیں ہیں نا آئی ہیں مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ پاپا کیا میں بھی کسی کو می کہہ سکتا؟“ اس کی باتوں نے میرا دل دھلا دیا تھا۔ ”میں بیٹا ایسا نہیں کہتے تم مجھے می کہہ کر بلا لیا کرو۔“ میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ میری می تو نہیں ہیں نا۔ میرا دوست اسد کہتا ہے کہ اگر تمہارے پاپا تمہاری آئی سے شادی کر لیں تو پھر میں کو می بلا سکتا ہوں۔“

”بیٹا آپ مجھے ویسے بھی می بلا سکتے ہیں۔ ماں کا پیار دینے کے لیے کسی سے شادی کر کے می کہلوانا ضروری نہیں ہوتا۔ جو کام تمہارے فرینڈز کی میں اپنے بچوں کے لیے کرتی ہیں۔ وہ سب کام میں تمہارے پاپا سے شادی کیے بغیر بھی کر سکتی ہوں۔ تمہارے کپڑے استری کر سکتی ہوں۔ جو تے پالش کر سکتی ہوں۔ تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا سکتی ہوں اسکو چھوڑنے اور لانے آ جا سکتی ہوں۔ تمہیں کہانیاں سناسکتی ہوں۔ تمہاری پسند کی مڑے مڑے کی شہزاد سناسکتی ہوں۔ تمہیں اپنے پاپا سناسکتی ہوں اور جتنا ایک ماں اپنے بچے سے پیار کرتی ہے۔ وہ بھی کر سکتی ہوں۔ کا پھر بھی تم مجھے می نہیں کہو گے؟“ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ اٹھ کر میرے منگے سے لگ گیا۔

”وہی! آپ! میں چھوڑ کر بھی کہیں نہ جانا۔ میںیں

رہنا ہی گھر میں درندہ میں بہت رڈوں کا اور ویسے بھی تمی کو اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاتی نا۔ میں سچ اسنے سب دوستوں کو جا کر بتاؤں گا کہ آپ میری می ہیں نا کی ہیں اور مجھ سے ان کا سب کی می سے بھی کیا پیار کر رہی ہیں۔ بلکہ میں کل سب دوستوں کو اپنے گھر انویٹ کر دوں گا۔ اپنی می سے سب دوستوں کو ملوں گا۔ آئی ہوگی۔“

وہ کتنا خوش ہو گیا تھا۔ کتنا ایک سیٹھ ہو رہا تھا۔ کتنا ترسا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ ماں کی مٹا کے لیے۔ اس سے پہلے تو جی حسن آفریدی کو احساس بھی نہ ہوا تھا کہ وہ معصوم بچہ اس کی اتنی توجہ اور محبت کے باوجود نا خیال رکھنے کے باوجود مجھ اپنے دل میں ماں کے لیے اتنا غم گھوس رہا تھا۔

اب کہ میں ایک عورت کی موجودگی دیکھ کر اس کا یہ احساس اس کی پیاس زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ ماں کی مٹا کے لیے اپنے اندر اتنی تڑپ رکھتا تھا۔ حسن آفریدی اور میں یہ دیکھ کر حیران ہی رہ گئے۔

وہ اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اور حسن آفریدی کو احساس ہوا کہ ہم دوستوں کی رو رہے تھے۔

شاہ زیب نے ہمیں بھی رادیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگے اور پھر ہاتھ کی پٹ سے آنسو صاف کرتے ہوئے ہماری ہنسی نکل گئی اور خودخواہی ہی ہم دونوں بہتے چلے گئے۔

”تو چھڑا پ کے بننے کے دوست کل اس کی می ملے آ رہے ہیں۔ ماں کی مٹا میں کوئی کی نہیں دیتی چاہیے۔“ حسن آفریدی نے شروع جملہ میری طرف پھینکا تو میں نے ہنسی ہو کر سر جھکا لیا۔

”میں تو اس کی می ہوں۔ آپ خواہ خواہ کیوں نہیں ہو رہے ہیں۔“ میں نے بھی اپنی خفتی منانے کی غم سے خودخواہی ہی برتن بیٹھے ہوئے کہا۔

”دیکھیں کیوں نہ ہو تمی ہمارے بیٹے پر آپ نے

بقیہ جمالی ہے۔“

”جی جتنا وہ آپ کا بیٹا ہے اس سے زیادہ میرا بیٹا ہے اب کیونکہ بیٹے باپ سے زیادہ ماں کے قریب ہوتے ہیں۔“ میں نے بڑبڑاتی سے کہا۔

”ٹھیک کہتی ہیں جی دیکل جو بھڑھری کا کافی جاندار نکلتا کھلا ہے۔“ حسن آفریدی نے چوٹی کی۔

”ارے واہ یہ ہم ماں بیٹے کے سچ میں وکالت کہاں سے آگئی۔“ میں نے اسے کھور کر دیکھا۔

”میں وکالت دیکھ کر شرات ہی سمجھ لیں۔“

”شرارتیں بچے کرتے ہیں اور آپ بچے اپنے نہیں بڑے ہو گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے اگر آپ یہی سمجھتی ہیں کہ ہم بڑے ہو گئے ہیں تو ایک بات ہوں۔“ وہ ہم سے لہجے میں بولا۔

”میرے ایک کھتا جا چاہتے ہیں؟“

”ہاں ایک کھتا جا چاہتے ہیں۔“ میں نے ماں کی دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ جیت میری ہی ہونی چاہیے۔“ وہ میرے پیری طرف دیکھ کر بولا۔ تو میں اس کی آنکھوں میں شرات دیکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”میں کی نوعیت کیا ہے؟“ میں نے خواہ خواہ ہی اس سے نظریں ملانے بغیر پوچھا۔

”دیکھیں میں زیادہ اچھا ہوا نہیں ہے۔ آپ جا ہیو تو ہم جیت سکتے ہیں۔“ ویسے بھی اب جیتنے کی باری ہماری ہی ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ تقدیر بھی ہمارا ہی ساتھ دے گی۔“ وہ دھوکے سے بولا۔

”تقدیر کا کیا پھر ہم سے کھال اٹی چل دے تو بے

آپ اپنا دعا عیاں کریں۔“ مجھے بھی اب اس کی ہنسی چھلک

آگ بھونک میں لطف آئے لگا تھا۔

”بات صرف اتنی ہی ہے درش صاحبہ کہ اگر آپ

الار نہ کریں میرا مطلب ہے کہ شاہ زیب کو تو اس کی

ہاں کی می مل گئی لیکن مجھے بھی تنگ ایک عدو بھی نہیں مل

گا کہ میں چاہوں آپ چاہیں تو کیا میں آپ کو نیکم کہہ

سکتا ہوں؟“ حسن آفریدی نے چھوڑ دی پہلے رادیا شاہ

زیب کا لہجہ اپنا۔

”کیا..... نیگم؟“ آپ مجھے شادی کے بعد نیگم کہہ کر بلا میں گئے۔ مجھے یہ رانا دقتا نوی لفظ ذرا بھی اچھا نہیں لگا، آپ مجھے ذری کہہ کر بلا لیا کریں۔ نیگم تو اتنا..... بے اختیار بولتے بولتے اچانک میری زبان کو بریک لگ گئے۔ یہ میں کیوں بول رہی ہوں۔ او مائی گا.....

میں نے حسن آفریدی کے چہرے پر گہری شورش مسکراہٹ دیکھی تو شرم سے میرا چہرہ لال ہو گیا اور میں تیزی سے وہاں سے اٹھ گئی۔ بھی شاہ زیب نے اپنے کمرے سے نکل کر اوپنی آواز میں کہا۔

”مئی پاپا میں اپنے دوستوں کو نہیں بلکہ قاضی کو بلا کر لاؤں گا تا کہ وہ آپ دونوں کی شادی کرادے۔“

حسن آفریدی کے بلند قبضے نے بندہ دم تک میرا پیچھا کیا۔ ایسا جیسے ایک کبھی خزاں کے بعد ہمارا موسم آ گیا تھا۔

کتنا رونی تھی میں رشتوں کے ٹوٹنے پر لیکن آج کتنے معذورا رشتوں کے بندھن میں بندھ گئی تھی۔ کتنے سچے اور بغلوس رشتے لکھے تھے خدا نے میرے نصیب میں اور اتنی اچھی ہی پائی ایک بات یاد آئی کہ اگر خدا

اپنے بندوں کو کچھ دکھ دیتا ہے تو ہمیں نہ نہیں اس نے ہمارے لیے بھی خوشیاں بھی ہمارے نصیب میں بھی

ہوتی ہیں اور آج مجھے میرے بھائی کی خوشیاں مل گئی ہیں اور صرف مجھے ہی نہیں بلکہ شاہ زیب اور حسن آفریدی کو

بھی ان کے بھائی کی خوشیاں مل گئی ہیں اور یہ خوشیاں یہ رشتے اب ہمارے لیے سدا بہار تھے۔

میرے اندر کا موسم باہر کے موسم سے کئی گنا خوشگوار تھا اور خزاں کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا اور اب میں اپنی بہادری کے سنگ اپنی تمام بقیت زندگی گزار رہی تھی۔

.....

Aanchal + Decembe + 2004 165

(قسط نمبر 13)

افسوس

عاشق اکبر سید

تم زخم جدائی کے کبھی سہ بھی سکو گے
اس نے تو کبھی ہم سے یہ پوچھا بھی نہیں تھا
ہم زندہ ہیں جس شخص کی خاطر میرے ہدم
اس شخص نے مڑ کر کبھی دیکھا بھی نہیں تھا

دوسری طرف ماہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری کے چہرے کی کیفیت یکسر بدل چکی تھی۔
”ماہ ڈونٹ وری میں آ رہا ہوں۔“ بہت سرعت سے اذہان حسن بخاری نے سیل فون کا سلسلہ منقطع کیا تھا اور اس
تیزی سے گاڑی کی سمت بڑھا تھا۔
”اذہان کیا ہوا ہے؟“ ساہیہ خان نے اسے بہت پریشانی سے دیکھا تھا۔ اذہان حسن بخاری نے پلٹ کر اس کی
سمت دیکھا تھا۔ پھر سر کی میں ہلادیا تھا۔
”چنانچہ مگر ماہ بہت پریشان ہے۔ میرا گھر پہنچنا بہت ضروری ہے۔“
”میں بھی ساتھ چلوں۔“ ساہیہ نے غلت سے اس کی سمت بڑھتے ہوئے دریافت کیا تھا مگر اس نے دروازہ
کھولتے ہوئے سرے نہیں ہلایا تھا اور پھر اسی سرعت سے گاڑی میں بیٹھا تھا اور گاڑی بھگالے گیا تھا۔ ساہیہ نہیں جانتی
تھی کہ دوسری طرف صورت حال کیا تھی مگر وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ یہی تھا کہ کچھ تو تھا جس کے باعث ماہ اپنی پریشان
حالت میں تھی۔

کبھی کبھی ذہن جتنا سوچتا ہے اتنا ہی الجھتا جاتا ہے اور دانستہ طور پر کچھ بھی سوچ کر الجھنا نہیں چاہتی تھی مگر اس
باتوں پر اختیار نہیں ہوا کہ اسے سوچوں کے اس جال سے خود کو بچائیں یا رہی تھی۔
وہ رہ کر ذہن اس طرف جا رہا تھا۔ وہ رہ کر سارے منظر نگاہ میں کھوم رہے تھے۔ وہ رہ کر ساری باتیں خود میں
رہی تھیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ وہ حد میں وہ شدت میں بھلائے نہیں بیٹھ رہی تھیں اور میرب سیال سمجھتیں کہ پاری کی
ایسا کیوں ہے؟
شاید وہ شخص اسے کسی قدر حیران کر رہا تھا۔

وہ اس کی باتوں میں اس کی پرستائی کے سر میں کچھ اچھڑ رہی تھی۔ کچھ چواچواٹ افسوس تھا۔ وہ رات کے اس پہر ادا کر کے توئے پٹی میں جب اپنے سامنے سردار سنگھن حیدر لغاری کو کھڑا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ جتنا اسے یہ خواب کا کوئی سلسلہ لگتا تھا پھر اپنا کوئی دوسرا بھی سمجھ سکتے ہوئے اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ جب اس شخص نے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ کا پانی گرفت میں لے لیا تھا۔ میرب سیال بری طرح ہنسی لگی تھی۔ چند ثانیوں تک یہی کھڑی رہی تھی۔ پھر بہت آہستگی سے نگاہ پھیر کر اس کی سمت دیکھا تھا اور اس کے در پر ہونے کا یقین کیا تھا۔

”آپ؟“ وہ حیرت سے بولی تھی سردار سنگھن حیدر لغاری بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔
”تمہیں نہیں لگتا، مجھے خواب جان کر کم کوٹلی کر رہی ہو؟“

میرب سیال نے سردار سنگھن حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا۔ پھر بہت دھم انداز سے مسکرا دی تھی۔
”میں حقیقت کو خواب سمجھنے والوں میں سے نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے خواب اور حقیقت میں امتیاز کرنا خوب آتا ہے۔ خود کو برا بھلا ظاہر کرنا چاہتا تھا سردار سنگھن حیدر لغاری مسکرایا تھا۔
”میں جانتا ہوں تم بہت سیانی ہو۔ خوابوں کو حقیقت سمجھنے کی غلطی تم یقیناً نہیں کر سکتیں۔“
”تقریب سے کوئی دن پھر..... میرب سیال نے مسکراتے ہوئے بڑبڑا اور حیران ہو کر مسکرایا تھا۔
”اگر اعتراض کہوں تو کیسا لگے گا؟“ سردار سنگھن حیدر لغاری جواباً مسکرایا تھا اور میرب سیال لب بلب بھیج کر مسکرا دی تھی۔

”مجھے حیرت نہیں، ہوگی کیونکہ میں سمجھتی ہوں کوئی بھی رات قائم کرنے میں ہر فرد آزاد ہے۔“
سردار سنگھن حیدر لغاری چند ثانیوں تک اسے خاموشی سے بلکہ کسی قدر دلچسپی سے دیکھتا رہا تھا۔
”تمہارے متعلق کوئی بھی رات جسے جتنی طور پر قائم نہیں کی جاسکتی، جو بھی اخذ کرتا ہوں۔ بہت جلد اسے مسترد کرنا پڑتا ہے۔ تم بہت ان بری ڈنڈا لیں ہو۔“

”ان بری ڈنڈا لیں یا غلطی کیل؟“ میرب سیال بہت ملامعت سے مسکرائی تھی۔ پراعتدا انکھوں میں بہت اعلیٰ نثری کا ڈر تھا۔ سردار سنگھن حیدر لغاری نے اسے دیکھا تھا۔ پھر مسکرایا تھا۔
”تمہارا کیا خیال ہے۔ تم زیادہ حیران کن ہو یا پھر زیادہ ذہین؟“
”ہر ذہین حیران کن ہی ہوتا ہے۔“ اس نے لپکا تھا اور سردار سنگھن حیدر لغاری نے اس کا جواب میرب سیال کو اس شخص کو اس طرح دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ یہی شاید وہ اس کی سمت دیکھتی رہی تھی مگر سنگھن حیدر لغاری حیران ہونے یا چمکے بغیر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”سیال نے جسے ہر گز فریڈ چاہے جیسی بھی ہو۔ یوی ہمیشہ ذہین ہوتی چاہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری بیوی ذہین ہے۔ وہ بوقت مجھ کی طرح اس کے سامنے بین نہیں بناتا پڑتی۔ وہ قطعاً سنجیدہ نظر نہیں آ رہا تھا اور میرب سیال مسکراتے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”وہ بوقت مجھ کے سامنے بین بنانے کی ضرورت نہیں تھی جیسی نہیں آتی کہ وہ ان باتوں سے بہت کرا پائی ہو۔ پھر ناخواب جاتی ہے۔“ میرب سیال نے اس کے سینے کو گویا مل کر کہا تھا اور سردار سنگھن حیدر لغاری مسکرایا تھا۔
میرب کے کہیں کوئی تھی۔ سردار سنگھن حیدر لغاری بھی چند ثانیوں تک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر گویا ہوا تھا۔
”تمہیں گھر نہیں آتا؟“

”ہوں۔“ میرب سیال نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

”میرب! میرا یہ خواب تھا۔ میرا ایک گھر ہوا اور اس گھر میں کوئی ایسا جس کے سامنے میں صوبد رہوں۔ اس کی باتوں میں اس کی نواں اس کے سنگ سنگ چلوں اور یہ سب سب کی تہ ہو۔ محبت پرستی رہے اور اپنی کسی شے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ مجھے وقت نے کچھ ایسا سن سنا تھا کہ اگر کسی کی جلد کر دو گھڑی قائم نہیں کر سکا پھر اسے بہت سے دیکھنے بچے بہت سے نئے مگر کسی میں زندگی کی بارگشت نہیں تھی۔ میرب سب بہت رسی سا تھا۔ بہت بے کیف اور کسی قدر بے مزہ۔ کچ مجھے بھی کسی خاص کی چاہ نہیں تھی۔ کسی خاص چہرے کو دیکھنے کے متعلق میں نے بھی نہیں سوچا۔ کسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ ایسا دیکھ دو جو اس کے باقی سب کچھ مانع نہ بن جائے۔ ساری جبک ساری غاہری وضع قطع اور.....“ سردار سنگھن حیدر لغاری کا تھا پھر اس کے چہرے کو بے غور سمجھتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ”میرب میں نے بھی خوابوں پر اعتقاد نہیں کیا۔ کبھی خواب نہیں ہے مگر تمہارا ساتھ اب مجھے اچھا لگنے لگا ہے میرب۔ بہت پھر یاد رہا۔ اب ایک جگہ کے کوئل چاہتا ہے۔ تمہارے ساتھ میرب تمہارے ساتھ چلنے کوئل چاہتا ہے۔“

سردار سنگھن حیدر لغاری کہہ رہا تھا اور میرب سیال اسے کی قدر حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ یہ شخص اسے واقعی حیران کر رہا تھا۔ وہ تقریباً اعتبار مشفقہ کر رہی تھی۔ اس پر اعتبار کر رہی تھی مگر اس درجہ وسعت کی کڑی تھی۔ جب سردار سنگھن حیدر لغاری اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھا مگر کیوں تک لے گیا تھا اور ایک لمب خاص نے اس کے اندر بہت سے احساس ایک ساتھ بیدار کر دیئے تھے۔

”وہ گھر تمہارا ہے میرب۔ میرے سارے خوابوں سمیت۔“ کیا یقین بول رہا تھا اس کے لیے میں۔ مگر میرب سیال جانے کیوں اس لیے چہرے کا رن پھیر گئی تھی۔

”ہاں میرب اب میں خواب دیکھنا چاہتا ہوں تمہارے بارے میں خوب“ کیا مجھے تم اجازت دو گی کہ میں تمہارے متعلق کوئی خواب دیکھ سکوں؟“

سردار سنگھن حیدر لغاری کی قریب میں کچھ بیٹھ گیا تھا۔ میرب سیال اس لمحے انکھیں بہت سختی سے میچ گئی تھی۔ سردار سنگھن حیدر لغاری نے اس کے چہرے کو بے غور دیکھا تھا۔ پھر بہت دھیمے سے مسکرایا تھا۔ اس پر سے اپنی گرفت ہٹا کر دی گئی۔ میرب سیال کی جیسے جان میں جان آئی تھی۔

اس نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”میرب۔“ بے غور سمجھتے ہوئے لپکا تھا۔

”ہوں۔“ میرب سیال نے دیکھے بغیر کہا تھا۔

”ایک بات ہوں۔“

”جی۔“

”اعتبار آنے میں چاہے دیر لگے مگر اعتبار بہت مفید ہوتا چاہے۔“ سردار سنگھن حیدر لغاری کی نظر اس صبح چہرے کو بے غور دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔ ”میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ اب چلیں گے۔ تم اپنی بیگنگ مل کر لو۔ کچھ شاؤنگ وغیرہ کرنا ہو یا دوستوں کے لیے نکلیں لینے ہوں تو فہرست بنا کر مجھے شہیدوں سے آگاہ کر دینا تاکہ۔“ بہت نیک انداز میں دریافت کیا تھا۔

”اوکے۔“ میرب سیال بہت دھیمے سے مسکرائی تھی۔

ہونے کی ذمہ دار ہاں تو آپ بھلائی ہیں۔ کیا باپ ہونے کے فرائض بھی فراموش کر چکے ہیں۔ مگر کو تو ان کے مقام سے ہٹایا چکے ہیں۔ کیا آپ کی زندگی میں سے ہمارا مقام بھی خارج ہو گیا؟“ اذان حسن بخاری کا مدہم لہجہ مدہم حسن بخاری کو ساکت کر گیا تھا۔ کئی دیر تک وہ اسی طرح ساکت نظر دے رہے تھے۔ پھر بہت سخت انداز میں گویا ہوئے تھے۔

”تمہیں مجھ سے اس انداز سے خطاب ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ نہ ہی ہم سب ہی بچوں کے کئی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل ہے۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ میں وہی باپ ہوں جس نے آج ہمیں اس مقام تک پہنچایا ہے۔ تم جو کچھ بھی ہو، میری وجہ سے ہو۔ مجھ سے کٹ کر تمہاری کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مانا ہوں بڑے ہو چکے ہو مگر اسے بڑے قطعاً نہیں ہونے کے اپنے باپ کے مقابل آکر کھڑے ہو سکو۔ میں اپنے باپ ہونے کا کوئی فرض بھولا نہیں ہوں۔ تم مجھے مجھے جتنا ہے کی خوش قسمت کرو۔ نہ ہی باور رکھنا کی۔ میں اپنی ذمہ داریوں سے خوب واقف ہوں۔ تم آج ہر بات کے لیے مجھے شکم کر رہے ہو۔ اپنے باپ کو کیسے جس سے نہیں آج اس قابل بنایا۔ حالانکہ اگر تم غور کرو، اس سب کا سبب تم خود ہو تم اذان نے میرا راجہ کیا۔ گاؤں کے اپنے باپ کے مقابل آن لڑے ہوئے۔ جو کچھ بھی ہوا اس تک جو تم کو حاصل نہیں رہا۔ اس کا سبب تم تھے۔ حالانکہ ہم دونوں کا تھا۔ سچو بھی سچا تھا مگر تم نے اسے بڑھا دیا۔ ویل بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماں کے پیوڑ میں گئے اور مجھ سے کاؤن فرض کر لیا۔ حالانکہ مگر تو وہاں جا گئے کہ دوست کو ان سے اور دشمن کو ان؟ بیٹے ہونے کی تیرم بھول گئے ہو۔ میں نہیں مجھے بھابھی بھی یاد ہے کہ تیرم بیٹے ہو۔ یاد رکھو بیٹا جتنا بھی بڑا ہو جائے اپنے باپ سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں بھولا ہوں۔ سو تم بھی یاد رکھو۔“

سحر حسن بخاری نے مدہم لہجہ میں باور کیا تھا اور پھر فوراً ہی پلٹ کر کہاں سے نکل گئے تھے۔

اذان حسن بخاری کئی دیر تک خاموشی سے ہیں کھڑا اس سکوت میں کھوئے غفلتوں کے مغموم ڈھونڈتا رہا تھا۔



کبھی کبھی کسی صورت حال سے بچنے کی سعی کرنے کے سارے اقدامات دھرے دھرتے جاتے ہیں۔ بچانے کی کوشش کی جائے راستے قدموں سے بندھ جاتے ہیں اور اگر چاہاں نہ کوئی ایسی سعی تو دانستہ نہیں کی جی سحر اس کے باوجود جب لا معحق اس کے سامنے ایسی ہی قوہ کشا دیر تک سے سادہ سادہ بیٹھا رہا تھا۔

”میں اوزی دیاہٹ سے بیلیز سنسر پر راز کر سکتا ہوں۔ تم؟“ سحر مگر کوئی سب سے سادہ سادہ لگتا ہے وہ ہے۔ کسی دلفریبی سے مسکراتی ہی اور اوزی فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا تھا۔ اس اتفاقی حادثے پر فقط مسکراتے ہی اس کے پاس بیٹھنے کی چاہ نہ تھا۔

”دایر آگے ہوا دیاہٹ کیا نہیں۔ ایسی اتفاقی کی امید تم سے نہیں تھی اوزی۔ بڑے بے مروت ہو کر لوٹے ہو۔ اب کے تو۔“ لا معحق مسکراتے ہوئے شکوہ کر رہی تھی اور اوزی پر مسکراتا تھا۔

”تم نے بھی تو لا اتفاقی کی حد کر دی۔ کتنی کر لی اور جبر تک نہیں ہونے دی۔“ اوزی نے جواباً لگتا تھا اور لا معحق ہنس دیتی تھی۔

”تم آج ان میں میں چھپانے والی کوئی بات نہیں۔ تم کو جانتے ہو لا معحق پر کام ڈکنے کی چوٹ پر کرنے کی عادی ہے۔ تم سناؤ تمہاؤں نے وہ اپنے ساتھ کوئی گوری دھری دھری لائے ہو؟“ لا معحق اسی تردادی کے ساتھ مسکراتی ہی اور اوزی بھی مسکراتا تھا۔

”ہمارے عیسائے نصیب کہاں کیا ساری باتیں اسی شاپنگ مال میں کھڑے کھڑے کر لوگی؟“

لا معحق کھٹکھٹا کر ہنس پڑی تھی۔

”آج بھی ملنے کے کہاں اسی کثرت سے ڈھونڈتے ہو۔ تمہارے کہاں ہو؟“ لا معحق نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا تھا۔

”انا ہیے کہ یہاں۔“ اوزی نے مسکراتے ہوئے غصہ کیا تھا۔

”انا ہیے یہاں؟“ لا معحق چونکی تھی۔ ”لیکن اس نے تو کیا کچھ نہیں بتایا مجھے۔ حالانکہ ہماری ملاقات تو متواتر ہو رہی ہے۔“ لا معحق کے لیے جس حیرت نمایاں تھی۔ ”کیسے تم نے اسے خود تو متعین کیا تھا مجھے بتانے سے؟“

لا معحق نے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کی قدر چوک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ مسکراتا تھا۔

”آج بھی سبب الزام یاد کرنے کی عادت کی نہیں تمہاری۔“

”سب سے یہاں؟“ لا معحق نے رستورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔“

”اور تک قیام کرو؟“ لا معحق نے فیصل منتخب کی تھی۔ اوزی اس کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”کہاں؟“ آنکھوں میں کی درجہ شرارت آن رہی تھی۔

اور لا معحق ہنس دیتی تھی۔ وہی تعجب کی تھی۔ جو زندگی کے سارے احساس چکاڑے کا گراہے اندر کھینچی تھی۔

”تمہاری باتیں آج بھی اتنی ہی اچھی ہوئی ہیں اور دل میں اتنی ہی سلاشی لگتا ہے تمہاری تلاش کا سفر تمہا نہیں۔“

مسکراتے ہوئے تجویز کیا تھا۔

اوزی مسکراتا تھا اور پھر غور اس کی آنکھوں میں جھانک لگا تھا۔

”میں کو لبس نہیں ہوں کہ ایک حیران کن جگہ کی تلاش پر نکلوں اور راستے میں ہی بڑا ڈوڈال کر ہی رہتا عت کر لوں اور اسی مقام کا ہو رہوں۔ مجھے جن جہانوں کی تلاش ہے۔ ان سے کم ہوا تھا تو ان کے نہیں آتا لا معحق۔“

لا معحق نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ چمکا کر قریب مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر رہی تھی۔

”یہ عادت کچھ اتنی ہی اچھی نہیں اوزی۔ انسان کو تو دیکھو راز نگ ہو کر پوچھا ہے۔ ایسا ہونے سے بہت ہی آسانیاں

ہو جاتی ہیں۔“

”آسانیاں تو نہیں اچھی ہیں لا معحق جو مشکلات سے نظر میں چراتے ہوں۔ جنہیں زندگی کی آنکھوں میں

ہاں کھیں ڈال کر دیکھنے کی عادت ہی نہ ہو اور میرے متعلق تو جاتی ہو۔“ اوزی مسکراتا تھا اور لا معحق اس کی سمت دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔

”تمہیں اچھا لگتا ہے لیوں در بدر بیٹھتا؟“ یہ غور دیکھتے ہوئے راز دہانت کیا تھا۔

”دیکھنے کا اچھا لگتا ہے اس کے متعلق کبھی کسی نے جانتے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔“ اوزی نے کہتے ہوئے جیسے اسے لا جواب کر دیا تھا۔ لا معحق اس کی سمت دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔

”تمہاری تو نہیں کہ تمہیں جو اچھا لگتا ہے اوزی وہی سب دوسروں کو بھی اچھا لگتا ہو۔“ لا معحق نے مصلحت سے پر

الزام اختیار کیا تھا۔

”بدلی نہیں بدتم۔ آج بھی قابل کرنے کے سارے گراؤنا جاتی ہو۔“

”اور تم بھی تو بدتم۔ میں نے سوچا آج بھی اسی طرح بیٹھتا جانتے ہو۔“

”حسن کو بیٹھانے کی سعی کوئی کارفری کر سکتا ہے۔“ اوزی مسکراتا تھا اور لا معحق بھی مسکراتی تھی۔ دیر آؤ دوسر دکر

کے چلا گیا تھا۔
 ”تم نے بتایا نہیں کب تک قیام کرو گے اس شہر میں۔“ لامع حق نے مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا اور اوزی کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

”تم اگر شہر کی وضاحت نہ بھی کرتیں۔ تب بھی میں سمجھ سکتا تھا کہ تم شہر میں قیام کی ہی بات کر رہی ہو۔“ اس کی آنکھوں میں بہت سی شرارت رکی ہوئی تھی اور لامع حق اس لمحے ہنس دی تھی۔
 ”تم جیسے بندے کے سامنے یہ سب بہت ضروری ہو جایا کرتا ہے اوزی تم کسی بھی بات کا مطلب کہاں سے کہاں لے جاتے ہو۔“

”ہاں مگر کبھی کبھی بہت سی وضاحتیں اور تاہلیس بھی کسی بات کے واقع ہونے کو روک نہیں سکتیں لامع حق۔ شاید تم یہ بات نہیں جانتی ہو۔“ اوزی کا انداز باور کرانے والا تھا اور لامع حق اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔
 ”کبھی کبھی سفر پر چلنے سے قبل اس بات کا تعین کر لینا بہت ضروری ہو جاتا ہے اوزی کہ ہماری سمت صحیح بھی ہے یا کہ نہیں۔ آیا یہ رستہ فقار رستہ ہی ہے یا پھر اس کی کوئی ڈگر منزل کی طرف بھی جاتی ہے۔“

”شوق جنوں جب حد سے سوا ہو جائے تو اس بات کا کوئی ہوش رہتا ہی کب ہے لامع حق۔ اس بات کا تعین تو جب ممکن ہوتا ہے تا جب کچھ ہوش باقی رہے۔ کیا تمہیں ابھی تک اس بات کا اندازہ نہیں ہوا؟“ اوزی کا لہجہ مدہم تھا اور لبوں پر جیسی ہی مسکراہٹ مگر اس کے باوجود لامع حق اس کی سمت متوازن نہیں دیکھ سکی تھی۔ کبھی اوزی مسکراتا ہوا اس کو دیکھنے لگا تھا۔

”تمہارے فیانی محترم سے ملاقات ہوئی تھی۔ موصوف خاصی توپ شے واقع ہوئے ہیں۔“
 ”تم ملے ہو ان سے کہاں؟ اور بائے دی وے تمہیں کیسے خبر ہوئی کہ میرے فیانی وہی ہیں؟“ لامع حق کو حیرت ہوئی تھی اور اوزی مسکرا دیا تھا۔

”خبر نہیں ہوئی ہوئی اگر موصوف میرے دوست واقع نہ ہوئے ہوتے۔“
 ”دوست تم عضنان علی خان کے دوست ہو۔ حیرت ہے عضنان نے بھی مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔“ لامع حق کو شہد یا حیرت ہوئی تھی۔

”اس نے تو تمہیں اور بھی بہت کچھ نہیں بتایا لامع حق۔ اس کے بارے میں تو تمہیں کبھی اس درجہ تشویش نہیں ہوئی۔“ انداز بہت عام تھا مگر لہجہ بہت خاص اور لامع حق کے لبوں کی مسکراہٹ ایک لمحے میں غائب ہوئی تھی۔ اوزی نے اس چہرے کو یہ غور دیکھا تھا۔

”خوش ہو؟“ غالباً اس تعلق کے متعلق دریافت کیا تھا۔ لامع حق نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر بہت آہستگی سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

”ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا تمہیں کوئی ڈاؤٹ ہے؟“
 ”نہیں تمہارا خیال ہے لامع حق۔“ انداز باور کرانے والا تھا اور لامع حق مسکراتے ہوئے سرفی میں ہلانے لگی تھی۔
 ”میرے فکر کرنا چھوڑ دو اوزی۔ مجھے اپنی فکر کرنا خود آتا ہے اور میں تمہیں اس کیئر کے لیے لھینکس بھی نہیں کہوں گی۔“ وہ مسکرا رہی تھی اور اوزی ہنس پڑا تھا۔

”تم آج بھی اتنی ہی بے مروت ہو۔“
 ”اور بے لحاظ بھی۔ تم جانتے ہو مجھے بے وجہ کر ٹی دکھانا اچھا نہیں لگتا۔ اپنی ویز۔ عضنان علی خان کو کب سے

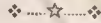
جانتے ہو؟

”کیوں ارادہ کہیں اس کے متعلق انوسٹی گیشن کرنے کا نہیں؟“

”جن سے محبت کی جاتی ہے۔ ان کے متعلق بذات خود جانا جاتا ہے۔ شہر کی ہواؤں سے یا چروں سے پوچھا نہیں جاتا۔“ جناب اتھارڈ اوی لب بیچ کر مسکرایا تھا۔

”بہی سسٹ لمی ایٹنگ گائے؟“ لہجے میں کوئی حسرت بول رہی تھی۔

”ہی ان“ لامحوت کے لہجے میں یقین ہی یقین تھا بول پر ہی دلغریب مسکراہٹ۔ اوزی اس چہرے کو دیکھ کر وہ گیا تھا۔



کبھی کبھی کوئی واقعہ اس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے کہ اس کے اثرات اگلے کی لمحوں تک زائل نہیں ہو پاتے۔ اذہان حسن بخاری کے اندر اس خلفشار نے سر اٹھایا تھا۔ سلسلہ ایسا تک تھا نہیں تھا۔ بلکہ انتشار کچھ اور بھی بڑھتا چلا گیا تھا۔ وہ جتنا سوچتا تھا۔ خود کو اتنا ہی بس اس پاتا تھا اور یہ صورت حال اسے اور بھی دگرگوں کیے جاتی تھی۔ اُس سے آنے کے بعد وہ بجائے اندر جانے کے وہیں لان میں مٹی کی بیچ بیٹھ گیا تھا۔

حالات نیم جاں کر دیے۔ دالے ہوں تو انسان فرار کے راستے خود بخود سوچنے لگتا ہے مگر اس کے پاس کوئی راہ فرار نہ تھی اور یہ کیفیت اس انتشار کو اور بھی بڑھا رہی تھی۔ کوٹ بازو پر دھرے وہ چپ چاپ وہاں بیٹھا تھا۔ جب سامیہ خان جاتی ہوئی اس کے پاس نہ کی تھی۔

”کہاں تھے تم؟“ اتنی ہی پریشان ہو رہی تھی اس وقت نے بتایا نہیں کیوں آف کر دیا تھا؟“ سامیہ خان نے دریافت کیا تھا مگر اذہان حسن بخاری کچھ نہیں بولا تھا۔ نہ ہی اس کی سمت دیکھنے کی زحمت کی تھی اس طرح ساکت سا بیٹھا رہا تھا۔ سامیہ خان اسے یہ غور کیے بغیر گئی۔

”اذہان! ایک نہیں ہے۔ میں تمہیں کم از کم اتنا دیکھ نہیں سکتی تھی۔ تم ہمارا دور فارحانی کو سنبھالنے کی بجائے غور اس صورت حال سے منہ چھپانے فرار کے راستے تلاش ہو رہے۔“ وہ کیوں نہیں کیا کر رہی؟ وہ کی قدر ہوتی ہے کہتے ہوئے اسے دیکھنے لگا تھا۔ سامیہ خان اس کے درشت انداز اور بلند بازو پارے سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اذہان حسن بخاری نے اسے دیکھا تھا پھر بہت آہستگی سے سر ٹی میں ہلا لگا تھا۔ انداز پر افسوس تھا۔

”آئی ایم سوری سامیہ۔“ مدہم لہجے میں کسی قدر مذمت تھی مگر سامیہ جواباً کچھ نہیں بولی تھی۔ بس فقط خاموشی۔ اسے دیکھتی رہی تھی۔ اذہان حسن بخاری اس کی طرف سے نگاہ پھیر گیا تھا پھر مدہم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

”بہی سمجھ میں کچھ نہیں آتا سامیہ۔ میں کیا کر رہا ہوں۔ جو ہو رہا ہے۔ میں نے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا۔ نہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے سامیہ کی جی کو اس طرح کی کیفیت سے دو چار ہونا پڑے گا۔ جب زندگی ایک حوالہ بنا بن کر رہ جائے گی اور ہم سب اٹھنے والے سوالات کے جواب میں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتے رہ جائیں گے۔ اذہان حسن بخاری کا انداز اس حد تک ہی لہجے ہوئے تھا اور سامیہ خان اسے خاموشی سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”سامیہ! میں نے کبھی بھی زندگی میں خود کو اتنے سنبھال نہیں پایا۔ یہ صورت حال دور نہیں ہے اس کے متعلق کوئی عمل کا نہیں آ رہا۔ میں ہر طرح کی کوششیں کر کے ٹھنک چکا ہوں۔ جب یہ لگنے لگے کہ تیرا کام آگئی ہے تو کبھی عقدہ دکھتا ہے کہ صورت حال پہلے سے کبھی بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ اس کا لہجہ مدہم تھا اور انداز تھا کا ماندہ۔

خان نے بہت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر دھو دیا تھا۔

”اذہان! انگشت ماں لینا دانش مندی نہیں۔ بہت ہی باتوں کے سر اندر سمجھ میں آئے والے ہوتے ہیں مگر مہیہ اپنے اندر بہت سے سوالوں کے جواب رکھتے ہیں۔ تمہیں ہمت سے کام لینا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے اسے قبول کر دو۔ حقیقت کو مان لینے سے کبھی بھی بہت سے سوالوں کے جواب خود بخود نہیں جاتے ہیں۔ تمہارا پرانہ ہی ہے اذہان کہ تم کی اگلاں حقیقت کو تسلیم نہیں کر پارے ہو اور یہی سب سے بڑا سبب ہے تمہاری سبکی کا۔ تمہارا ذہن اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں قبول کر پارہا اور یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے اذہان۔ کبھی بھی ایک حقیقت کو تسلیم کر لینے سے ہی بہت سی باتوں کا جواب مل جاتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو کم از کم اس صورت حال سے نشے کا سد باب ہی سمجھنا آ جاتا ہے۔

”میں تمہاری بات کو مسترد کرتا ہوں۔“ اذہان حسن بخاری نے اس کی سمت دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہتے ہوئے اس کے تمام الفاظ کو ایک لمحے میں رد کیا تھا۔ ”میں سامیہ خان۔ روکنا میں تمہاری رہ بات کو سب کتاباں باتیں ہیں۔ تم یہ سب اس لیے کہہ رہی ہو کیونکہ اس طوفان کا حصہ نہیں ہو سارہ۔ جس کا حصہ میں ہوں۔ تم اس طوفان کی شدت کو اس طرح سے محسوس نہیں کر رہی ہو جس طرح میں کر رہا ہوں۔ پھر تم کوئی حل کیونکر پیش کر سکتی ہو۔ جب تمہیں کسی بات کا اندازہ ہی نہیں۔“ وہ اس کا لہجہ انداز سب کس قدر اسی تھا اور سامیہ خان اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ نظروں میں حذر رہے۔ کچھ نہیں گویا۔ اسے اذہان حسن بخاری نے اسے کی اقدام کی توقع نہیں تھی۔

”اذہان! یہ ٹھیک ہے کہ مجھے خان باتوں کا ادراک نہیں ہے اور جس کیفیت سے تم کر رہے ہو اسے میں نے کبھی نہیں سمجھا۔ مگر یہ غلط ہے کہ میں اسے اس طرح سے محسوس نہیں کر رہی ہوں۔ تم نے اذہان خان نے مجھے ایک لمحے میں خود سے الگ کر دیا۔ پر کیا کر دیا۔“ اس کا لہجہ مدہم تھا اور انداز پر افسوس تھا۔ اذہان حسن بخاری اس کی سمت سے نظریں پھیر گیا تھا۔

”کبھی کبھی طوفان میں گھر سے ہوئے شخص کو صورت حال کا اندازہ اس انداز سے نہیں ہو پاتا جس طور کہ دور سے دیکھنے والے کو ہوتا ہے۔ جو دور سے دیکھ رہا ہوتا ہے وہ زیادہ بہ طور مہیا پر اندازہ کر پارہا ہوتا کہ صورت حال کتنی سنگین ہے۔“ وہ کبھی بھی اور پھر بناس کی سمت دیکھے، کتنی وہاں سے نکلتی تھی۔



”تو تم آج لامحوت سے ملے تھے؟“ انا بیہ شاہ نے اس کی سمت دیکھے ہوئے حتیٰ انداز میں کہا تھا اور کسی قدر حیران ہوتا ہوا مسکرایا تھا۔

”تمہیں کبھی خبر ہوئی؟“

”تمہارے چہرے پر کھساہ اڑی۔“

”اچھا۔“ وہ حیران ہوا تھا۔ ”تو کیا ایسی ساری باتیں چہرے پر آنے درج ہوتی ہیں؟“ اس کا سوال اس کی قدر سادہ تھا مگر انا بیہ شاہ مسکراتے ہوئے لب بیچ رہی تھی۔

”آف کو کر لیکن تم نے بتایا نہیں کیا ہوا۔ کیا وہ حیران تھی؟“ انا بیہ شاہ نے گفتگو کا سلسلہ بھر وہیں سے شروع کیا تھا اور اذہان کی باتوں پر بہت کچھ بھیجی تھی مسکراہٹ اُبھری تھی۔

”جب سب میرے چہرے پر درج ہے تو پھر بے کیوں رہی ہو؟“ انا بیہ شاہ نے اس کی سمت دیکھا تھا پھر مسکرا

دلی تھی۔

”اوزی اگرچہ تہاری حالت خاصی درگول ہو رہی ہے۔ مگر ایک فطری تجسس بھی تو ہوتا ہے نا۔“
”تو تم لطف لیتا چاہتی ہو میری کیفیات سے۔ کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے۔“

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر کر گئی
دنیا تو لطف کے لیے میرے واقعات میں

اس کا انداز وہابی دیتا ہوا تھا اور انابیہ شاہ ہنس پڑی تھی۔ ”جی اوزی نے مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔
”دوسرے پر ہنسنا آسان ہے نا؟“

”ہاں ہے مگر ہمدردی کے بجائے بھی تو میں ہی رکھتی ہوں نا۔“ انابیہ شاہ بہت دنوں بعد مسکرائی بہت تر تازہ لگی تھی
اوزی اس کی سمت پر غور دیکھا ہوا مسکرایا تھا۔

”اچھی لگ رہی ہو۔ اتنے دنوں بعد جھل کر مسکرائی۔“ اوزی نے کہا تھا اور وہ لب بلبھج کر چہرے کا رخ پھیر گئی تھی
”میں نے یہ تعریف اس لیے نہیں کی کہ تم اپنے مسکراتے لب اس قدر سختی سے بھیج لو۔“ اوزی نے اسے باور کرا

تھا۔

”تم نے بتایا نہیں ملاقات کیسی رہی؟“

”کیسی رہ سکتی ہے تمہارے خیال میں وہ گریز یاں ہم پریشاں پریشاں۔ ایسے میں انداز مدعا کیا ہوا نا۔
ہے۔ وہی جو اہل ملاقات میں رہا یاں سے بچ کر یادہ مختلف وقت قطعائیں۔“ وہ پر حراس انداز میں کہتا ہوا مسکرایا تھا۔

”رنگینی اس لڑکی سے مجھے لگ کر بھی نہیں لگا کہ میں اسے پہلے بھی میں لپ چکا ہوں۔ یا اسے پہلے سے جانتا ہوں
اس سے۔“ جتنی بار بھی ملاؤں ہر ملاقات وہی کھینچ لی گئی ہے۔“ اوزی کا انداز بہت ناز تھا۔ وہ تمام باتیں اس طریقے پر جان

کر رہا تھا جیسے دوسرے کی خبروں سے مزین کوئی اخبار پر کھنسا رہا ہو۔ نا انابیہ شاہ نے اسے پر غور دیکھا تھا۔ شاید یہی کہ
کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اوزی اس کی سمت دیکھا ہوا اپنے لگا تھا جیسے وہ مسکرائی ہوئی اس کی سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی۔

”مجھے اکثر کٹھن ہے تم دوسرے کی خبروں سے مزین کوئی اخبار پر پڑھ کر سنا رہے ہو۔ خود اپنی زندگی سے متعلق تمہارا نا
بڑا ہی کیوں ہوتا ہے۔ نا انابیہ شاہ نے تجز کر دیکھا تھا اور وہ مسکرایا تھا۔

”مجتب کی ہے تم نے بھی نا انابیہ شاہ؟“ مذمّم لہجہ میں دیا جب سوال تھا اور انابیہ شاہ جو مسکرائی تھی اسے بعد جو تک
اس کی سمجھنے لگی تھی۔

”یہ کیسا سوال ہے؟“ مگر اوزی اس کی سمت ہنسنا ہوا مسکرایا تھا۔

”انابیہ شاہ! آسمان شے نہیں ہے مجبت اسے کرنے والا تو دیکھ خبر بن جاتا ہے۔“ باور کیا تھا اور انابیہ شاہ اس
سمت سے نگاہ پھیر گئی تھی۔

”انابیہ۔“ اوزی نے بہت مذمّم لہجہ میں پکارا تھا۔

”ہوں۔“ انابیہ شاہ نے اس کی سمت کیلئے سے دانستہ گریز تھا۔

”نا مجبت بہت آسان شے نہیں مگر تیرا ہی مشکل بھی نہیں کہ چہرے پر برائیاں اڑ جائیں۔“ انداز چھپڑنے والا تھا
انابیہ شاہ نے اس کی سمت مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر رعب پڑا لیکن اسے بھگتا رہا تھا۔

”دیے جب ہمیں مجبت ہو تو مجھ ضرور بتانا۔“

”کیوں؟“ انابیہ شاہ نے کسی قدر ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ مگر وہ مسکرایا تھا۔

”وہوں مل کر سختی کریں گے۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی اور انابیہ مسکرا دی تھی۔

”مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔“ اس نے سرسری انداز سے کہنے کے ساتھ ہی ریموٹ اٹھا کر ٹی وی اسکرین کی
جانب اپنی توجہ مبذول کی تھی۔ اوزی نے اسے پر غور دیکھا تھا۔

”انابیہ۔“ وہ کبھی حد سے نہ گئی۔

”ہاں۔“ انابیہ کا انداز سرسری تھا۔

”کس طرح تم مجبت کے نام پر شائے ہوتی ہو اس سے مجھے صاف کچھ گڑ بڑ نظر آتی ہے۔“

”اوزی۔“ انابیہ شاہ نے اسے ٹھہرا تھا مگر وہ ہنس دیا تھا۔

”اور مکمل ہوئی تھی۔“ مانا ہے جن سے پکار کر اسے دروازہ کھولنے کی ہدایت کی تھی۔

”انابیہ دیکھو کون ہے باہر۔“

انابیہ نے جواباً اوزی کی سمت دیکھا تھا۔

”جاؤ دیکھو جا کر ساتھ والے کچن ابھر ہوں گے۔ اور ادا با سے ملنے آئے ہوں گے۔ انہیں دادا ابا کے کمرے میں
پہنچاؤ بنا اور سنو واکی میں میرے لیے کائی بھی بنا ڈالا۔“ اس نے دو تین آؤڑیاں ایک ساتھ دیکھے تھے۔ اوزی نے ہاتھ
میں پکڑا اور اس کی سمت اچھلا اٹھا اور گھورتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ مکمل توجہ سے ٹی وی اسکرین کی سمت دیکھنے
لگی تھی۔

کچھ لمحوں کے توقف سے اس کے قریب آہٹ ہوئی تھی۔

”گوں تھا اوزی؟“ وہ اس کی جانب دیکھنے بغیر ہولی ٹی وی۔ مگر دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

”اوزی تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟“ کوں تھا؟“ انابیہ شاہ نے ٹی وی کا ٹائم کر کے ہونے لگا اوزی کی سمت کی تھی
اور اوزی کی جگہ کی جگہ اور گو کھڑا اٹھ کر جو تک پڑی تھی۔

”آپ؟“ عصفان علی خان اس کی سمت دیکھا ہوا مسکرایا تھا۔

”کھانی لینے گیا ہے وہ؟ ادا با تم نے اسے آؤڑ کیا تھا؟“ اس کے دیکھنے پر وضاحت کی تھی۔ ”میں نے کے لیے نہیں کہو
گی؟“ عصفان علی خان نے یہ غور اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

”اوزی کے مہمان ہیں۔ اس کے آئے انتظار کر لیجئے۔“ وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ
کسی قدمز محمول سے بہتے ہوئے کسی عصفان علی خان نے ان سمت دیکھی آنکھوں کو دیکھا تھا اور مسکرایا تھا۔

”یعنی میں آپ کا مہمان نہیں ہوں۔“ وہ اس کے اجازت نہ دینے کے باوجود اس کے عین سامنے بیٹھ گیا تھا۔ انابیہ
خاموشی کے ساتھ ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”مجھے خاموش ہوا چلی ہے یہ جانے کی کہ تم اپنے مہمانوں کو کیسے ٹھہرتے کرتی ہوگی۔“ انابیہ شاہ نے اس کی سمت
دیکھا تھا۔ پھر ٹی وی آف کر کے ریموٹ ایک طرف رکھ دیا تھا۔

”آپ کو میرے متعلق اتنا جیس کیوں ہے۔ مانا ہوتی ہے ہر انسان کو تھوڑی بہت تجسس کسی دوسرے انسان سے
متعلق مگر اس درجہ آپ کیوں خیال کرتے ہیں کہ میں کسی اور پبلٹس سے آئی ہوں اور میرا ٹرینٹ و دیگر انسانوں کے
ساتھ آپ سب سے مختلف ہے؟“ وہ بولی تھی اور عصفان علی خان مسکرایا تھا۔

”اپنے بارے میں تم بہت اچھی اور مزیدار رائے رکھتی ہو۔ غالباً میں نے تمہارے متعلق ایسا کچھ خیال نہیں کیا تھا
”

مگر تم نے بتا کر مجھے لاجواب کر دیا ہے۔“ عصفان علی خان محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ انا بیہ شاہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”مجھے آج اچھا لگا ہے انا بیہ شاہ۔ آج تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم اچھا بول سکتی ہو۔ مجھے تمہاری خاموشیوں سے بہت وحشت ہوتی ہے اور.....“

”مجھے یہ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ عصفان علی خان کہ آپ کو کیا شے اچھی لگتی ہے اور کیا نہیں۔ لیکن مجھے آپ میں بہت کچھ ہے جو پسند نہیں ہے۔“ وہ اس کی سمت پر اعتماد انداز سے دیکھتی ہوئی بولی تھی۔ مگر عصفان علی خان ہنستا چلا گیا تھا۔

”اُدھر رہیں۔ کیا واقعی ایسا کچھ ہے اگر ہے تو پلیز ٹیل می میں اپنے متعلق تم سے سننے کے لیے منتظر ہوں۔ اچھی یا بری کچھ بھی مگر کچھ تو آئے کہ دوسری طرف ہے کیا۔ بہت گزر گئی خاموشی میں اب تو اس بھید کو کھل جانا چاہیے۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں شرارت رکی ہوئی تھی اور انا بیہ شاہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

اوزی بھی کافی لے کر آ گیا تھا۔

”یہ اتنی خاموشی کیوں چھائی ہوئی ہے۔“ ان دونوں کو خاموش دیکھ کر اسے کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔ انا بیہ شاہ کچھ نہیں بولی تھی۔ جب کہ عصفان علی خان مسکرا دیا تھا۔

”ہوسکتا ہے۔ ہم اس مقولے پر عمل کر رہے ہوں کہ خاموشی بھی گفتگو کرتی ہے۔“

”ویل سیڈ۔“ اوزی نے مسکراتے ہوئے اسے داد دی تھی۔ ”خاموشی کبھی کبھی واقعی باتیں کرتی ہے مگر کبھی کبھی باتیں اس خاموشی سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ کیا خیال ہے؟“ اوزی مسکرایا تھا اور عصفان علی خان جانے کیوں ہنس پڑا تھا۔

”شاید ہم میں سے کوئی اس حقیقت کو نہیں جانتا یا پھر جانتے تو جیسے نظر انداز کر رہا ہے۔ ان باتوں سے کہیں اہم یہ بات ہے کہ میرے فارم ہاؤس پر ایک گیٹ ٹو گیدر ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انٹی دادا اباسمیت تم سب بھی شرکت کرو۔“ عصفان علی خان نے مسکراتے ہوئے انا بیہ شاہ کی سمت دیکھا تھا۔

”آئی ہوپ کہ تم سب ضرور آؤ گے۔“

انا بیہ شاہ کچھ کہے بغیر اٹھی تھی اور پھر اسی خاموشی سے چلتی ہوئی وہاں سے نکل گئی تھی۔ عصفان علی خان کی نظروں نے تا دور اس کا پیچھا کیا تھا۔



اگینے بہت خاموش سی بیٹھی تھی۔ فارحہ اس کے سامنے تھی مگر دلجوئی کے سارے لفظ جیسے کہیں کھو گئے۔

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا مجھ میں کوئی بہت بڑی تبدیلی رونما ہو گئی ہے؟“ فارحہ اس کے موڈ کو بحال کرنے کے لیے بہت دھیمے سے مسکرائی تھی اور اگینے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

”جہابی آپ کو نہیں لگتا آپ کا دل گنجائش سے بہت زیادہ بڑا ہے؟“ اور فارحہ جانے کیوں مسکرا دی تھی۔

”اگینے ایسا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کی شہلی ایک عورت کے لیے کیونکہ اسے بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے اور جھیلنا بھی پڑتا ہے۔“ اگینے نے خاموشی سے فارحہ کی سمت دیکھا تھا۔

”جہابی! آپ کو لگتا ہے کہ ایسا کر کے کوئی فائدہ ہوسکتا ہے؟“

”فائدہ! فائدے اور نقصان کے متعلق سوچنا عبث ہے اگینے۔ میں نے اب تک کی زندگی میں جو بھی کیا اس میں

کبھی بھی کسی فائدے کی امید نہیں رکھی۔ آج سعد مجھ سے بدظن ہے۔ بڑا ہلکے ہیں اسے مجھ سے مگر میں یہ بات جانتی ہوں میں نے اس کے لیے اس گھر کے لیے کئی قربانیاں دی ہیں۔“ فادرہ لہجہ افسردہ تھا۔“ آج وہ ان قربانیوں کا صلہ کی اور کو دینا چاہتا ہے۔ جتنی حاجت ہو جائیگے اب وہ مجھ سے کہا جاتا ہے؟“ فادرہ نے نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔
 ”اگنیے! وہ جانتا ہے ہماری کپڑے کے کرنی پر سن بیٹرز وہ اس کے نام کر دے۔ انہی کی شریک حیات کے نام اور ایسا کرتے ہیں اسے اس بات کا قطعاً کوئی احساس تک نہیں کر گیا کہ وہ اپنے اور دیگر کردار ہے۔ فادرہ کے ہنسنے کی خوشیاں تو وہ کی اور کو ان کہی چکا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اب وہ اپنے بچوں کو بھی فراموش کر رہا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اسے قطعاً احساس نہیں ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کتنی بڑی نا انصافی کر رہا ہے۔ مگر میں یہ نا انصافی قطعاً بھی اپنے بچوں کے ساتھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں اپنا مقام تو شیئر کر سکتی ہوں۔ اپنے حصے کی خوشیاں بھی کسی تیسرے وجود کو سونپ سکتی ہوں مگر اپنے بچوں کا حصہ نہیں بانٹ سکتی۔ سعد جانتا ہے کہ میں اس کی پیاس پر سٹ کی شیئر ہولڈر میں ہوں۔“ بچی کے شیئر اس کے نام ہیں اور وہ انہیں بھی اپنے بچوں کی بجائے دوسروں میں بانٹ دینا چاہتا ہے۔“ فادرہ کی آواز مدھم مدھم تھی۔“ شاید وہ بہت دیکھ رہی ہے۔ اگنیے کے پاس اس کی سلی کے لیے شاید کوئی لفظ نہ تھے۔
 ”جی شاید وہ خاموشی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 فادرہ نے ٹھیک آٹھ گھنٹوں سے اگنیے کو دیکھا تھا۔

”اگنیے! میں نے ایسا کیا تو کیا خطہ کیا۔ کیا تو ایسا عجیب۔ وہ کہیں مجھے مورد الزام ٹھہرا رہا ہے۔“ فادرہ جذباتی ہو گئی تھی اور جی اگنیے نے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر بہت اچھی سے کئی میں مر دلاتے ہوئے فادرہ کی سمت دیکھا تھا۔
 ”بھائی! پلیز اگر آپ ہی حوصلہ ہاں میں گی تو باقی لوگوں کو کون سنہا لے گا۔ ان حالات میں آپ کو ثابت قدم رہنا چاہیے۔ وقت سب سے بڑا منصف ہے۔ آپ سب کچھ خدا کے حوالے کر دیجیے۔ وہ سب بہتر کرے گا۔ ایک دن بعد بھائی کو اپنی غلطی کا اعجاز ضرور ہوگا۔“ اگنیے نے لامنت سے پرے اپنے میں فادرہ کو سلی دی تھی۔ فادرہ ہنسنے لگی تھی جب باپا چوٹی کوئی سانسوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔
 ”مئی! بھائی! بھائی! اپنے کمرے میں چینگ کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا ہے مگر وہ مجھے کچھ بتا نہیں رہے۔“
 فادرہ اس اطلاع پر بھوونکا رہ گئی۔ ”اگنیے نے اور اس نے ایک ساتھ ان حسن بخاری کے کمرے کی سمت چپڑ قدم کی تھی۔ ان وہاں حسن بخاری تیزی کے ساتھ چینگنگ میں مصروف تھا۔

..... ☆ ☆

دوپہر میں سردار سنگھین حیدر بخاری کا فون کا ڈروہ اس کے ساتھ کرنا چاہتا تھا اور اس کے پاس ان کا کارڈ کا کوئی جواب نہیں تھا۔ شاید ایسے لیے دو شام میں تیار ہونے لگی تھی۔
 سردار سنگھین حیدر بخاری جب آیا تھا تو اسے تیار دیکھ کر کچھوں تک ساکت رہا تھا۔ پھر مسکرا دیا تھا۔
 ”بھئی! خل۔ لیکن میرے خیال میں تمہارے بال کٹے ہوئے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔“ کہتے ہوئے وہ اس کے قریب آیا تھا اور میں اس کے سامنے کا تھا اور پھر انہیں پھیلا کر اس کی پشت پر لے جاتے ہوئے اس کے جوڑے کی شکل میں بندھے بالوں کو بہت اچھی سے کھول دیا تھا۔ میرب سیال اس کی اس قربت پر ساکت رہ گئی۔ اس کے جوڑے سے اچھی خوشبو نے اس کے حواس خطا کر دیئے تھے۔ وہ نظریں جھکانے کی طرح بت نہی کھڑی تھی جب سردار سنگھین

حیدر بخاری نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے شہادت کی انگلی سے اس کے چہرے کی قدر اوپر اٹھا لیا تھا۔
 ”ہائیں! ناؤ یو گیس دی ری پرئی۔“ بہت دھیمی سی مسکراہٹ سردار سنگھین حیدر بخاری کے لبوں کا احاطہ کرتی تھی اور میرب سیال اس کے نظریں جھکا کر تھی۔
 ”چلیں۔“ بہت مدھم مدھم میں دریافت کیا تھا۔ سردار سنگھین حیدر بخاری اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بہت لامنت سے مسکرا رہا تھا۔

”ہاں مگر تمہرے وہاں میں کچھ بول رہا ہوں۔“ اس چہرے کو گناہ کی قدر دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور ان نظروں کی حدت میرب سیال کے لیے کی قدر پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ اس کے باعث کی قدر ابھن میں نظر ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔
 ”سنگھین حیدر بخاری کو نا اٹاس بات کا کوئی احساس نہ تھا۔ سردار سنگھین حیدر بخاری نے اس چہرے کو بغور دیکھا تھا پھر بہت اچھی سے اس روش پریشانی پر ایک جلتا ہوا پھر یو گیس پھونکا تھا اور میرب سیال کی رگوں کا سارا خون جیسے اس کے چہرے پر آن پڑا تھا۔ سینے میں کہیں یکدم ہی ارتعاش سا رہا پو گیا تھا اور وہ اپنی کیفیت پر خود آپ حیران رہ گئی تھی۔
 ”سردار سنگھین حیدر بخاری نے جب میں سے ایک ٹیکٹ نکالا تھا پھر اس میں سے ایک چلتا ہوا نازک سا مٹکس نکال کر اس کی گردن کی سمت بڑھا لیا تھا۔

”ماہانت ہے؟“ اس کے اس کی قدر حیرت سے دیکھنے پر غائب سردار سنگھین حیدر بخاری نے مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔ میرب سیال نے پھر اپنا سر ثابت میں ہلا کر نظریں جھکا لیں اور تب سردار سنگھین حیدر بخاری کے ہاتھ اس کی نازک گردن میں اس کی ہتھی مٹکس کو پھینک دیتے تھے۔
 قربتوں کی یہ کہانیاں بڑا راجاں گل سی۔ وہ لمبے لمبے کتنی بھی دلچسپ تھی۔ مگر یہ سب میرب سیال کے لیے جھیلنا بہت دشوار پورا تھا۔ لیکن وہ جیسے مکمل طور پر بے بس تھی۔
 ”سردار سنگھین حیدر بخاری نے اس کی گردن میں وہ موتیوں سے مزین قیمتی مٹکس پہنا کر ایک تنہیدی زاویہ نظر سے اسے دیکھا تھا اور پھر مسکرا دیا تھا۔

”ناٹ نو بیڈ۔“ اور میرب سیال نے کسی درجہ حیرت سے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا تھا۔ جی سردار سنگھین حیدر بخاری مسکرا رہا تھا۔
 ”آئی ٹھنک ناؤ یو گیس رہتی پرئی۔“ ان آٹھ گھنٹوں میں اس کے لیے سانس ہی سانس تھی اور میرب سیال اس لمبے جیسے تاجدار مسکراتے ہوئے نظر جھکا کر تھی۔
 ”دیکھنے کے لیے میری نظریں اس کا فی ہیں یا کسی قسم کے آئینے کی ضرورت اب بھی باقی ہے؟“ سردار سنگھین حیدر بخاری نے مدھم مدھم جیسے جب کہ اس سے دریافت کیا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔
 ”کیا اب مچل سکتے ہیں؟“ سردار سنگھین حیدر بخاری نے کہا۔

”وائے ناٹ شیئر۔“ اور اس کے ساتھ ہی وہ اسے لے کر آگے بڑھنے لگا تھا۔ میرب سیال کے لیے بے سارے تجربے بہت نئے تھے اور سارے حوالے مانجانے۔ شاید ایسے لیے وہ اپنی دھڑکنوں کا ارتعاش ابھی تک اپنے کانوں میں سن رہی تھی۔
 ”سردار سنگھین حیدر بخاری واقعی حیران کن تھا اور وہ اسے قدم قدم پر واقعی حیران بھی کر رہا تھا یا پھر وہی اس درجہ حیران ہو رہی تھی اور وہ حقیقت ان باتوں میں حیران ہونے والی کوئی بات نہ تھی۔ بہر حال جو بھی تھا میرب سیال کے لیے یہ لمبے قیامت سے کم نہ تھے۔

اس شخص کی سنگت اس کی ہمراہی اس کے لیے خواب جیسی تھی۔ وہ جانتی تھی یہ حقیقت تھی اور کچھ بھی خواب نہ تھا۔
مگر وہ بات خود کو یاد کرانے کے باوجود یاد نہ کر پا رہی تھی۔

ڈرنے کے دوران بھی جانے وہ کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ میرب سیال کو اپنا بہت کھو یا کھو یا سا لگا تھا۔
”کیا ہوا؟ کیا سوچ رہی ہو؟“ سردار سنگھین حیدر لغاری نے اس کی جانب کسی قدر تشویش سے دیکھا تھا۔ میرب سیال چونکی تھی اور فوراً ہی سرنگی میں ملا دیا تھا۔
”میں اس کی کوئی بات نہیں“
”سردار سنگھین حیدر لغاری نے جانے کس حد سے کس چیز پر نظر دیا تھا اور وہ یکدم ہی مسکرا دی تھی۔“
”آف کورس“
”تو پھر تم اتنی ہی صدمہ کی کیوں ہو؟“

”میں ایسا نہیں ہے“ میرب سیال نے مسکراتے ہوئے سرنگی میں ہلایا تھا۔
”کیا میں تمہیں خوش رکھنے میں ناکام ہوں؟ کیا میں اس کو کشش میں نہ کرنا کام ہوں؟“ سردار سنگھین حیدر لغاری نے اس کی آنکھوں میں سمجھاؤ کا تھوڑا سا مسکرا دی تھی۔
”آپ غلط سمجھ رہے ہیں ایسا نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے یہ سب کچھ“ صدمہ لے کر میرب سیال اظہار کیا تھا۔
”کیا؟“ سردار سنگھین حیدر لغاری جیسے کچھ نہ سمجھا تھا۔

”یہ سب“ میرب سیال نے کچھ جواڑ کر میرے لیے کر رہے ہیں۔ یہ رات میڈر سے میرے لیے اور.....“
”اور میں“ میرب سیال نے سردار سنگھین حیدر لغاری نے اس کے جملے کو مدیان میں سے اچک لیا تھا۔ وہ چہرے پر ہونے اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ سردار سنگھین حیدر لغاری اس کی آنکھوں میں اسی انداز سے دیکھتے ہوئے دریافت کر رہا تھا۔

”اور میں“ میرب سیال؟ تم نے بتایا نہیں میرے متعلق کیا خیال کوئی ہو تم؟ کیا سوچتی ہو تم؟“ سردار سنگھین حیدر لغاری کا سوال بہت ہی مشکل تھا۔ میرب سیال کوئی ایک رنگ خاموشی سے اس شخص کی سمت لگی رہی تھی پھر جیسے بے بسی سے نظریں پھیر گئی تھی۔
”آپ..... آپ بھی اچھے ہیں“ اس نے جیسے زبردستی وہ ایک جملہ ادا کیا تھا اور سردار سنگھین حیدر لغاری کے چہرے پر ایک نئی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”صرف اچھا؟“ جیسے کچھ اور بھی وضاحت چاہ رہی تھی مگر میرب سیال چہرے کا رخ پھیر گئی تھی۔ سردار سنگھین حیدر لغاری کو جیسے اس پر دم آ گیا تھا۔ جیسی مسکرا دیا تھا۔
”میں کس گھبراہٹ اچھا لگنے سے کچھ آگے بڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔ جہاں ادا کیا خیال ہے۔ یہ بات کچھ اتنی ہی بخش تو نہیں ہے۔“ اس کی قدر ملائم لہجے میں وہ اظہار دعا کرتا ہوا اس کی رائے چاہتا جا رہا تھا۔ ”مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔“
فلور پر کئی کئی دنوں سے آکسہرا پارٹی میں بیٹھتیوں کے جہاں آدے کیے ہوئے تھے۔ سردار سنگھین حیدر لغاری نے اس جانب ایک نگاہ کی تھی پھر مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا اور جیسی بہت آگے کے ساتھ اپنا چہرہ ادا تھا جس کے سامنے پھیلا دیا تھا۔ میرب سیال کی قدر جرت سے اس کی سمت دیکھنے لگی۔

”آؤ آؤ تمہارے ساتھ کچھ دیر قہقہہ کرنا چاہتا ہوں مجھے اجازت ہے نا؟“ صدمہ لے کر میرب سیال میں کئی گزارشیں تھیں اور میرب سیال ساکت کی اس کی سمت گئی تو میرب سیال نے کئی سیال ہلائی تھی۔
”مجھے اس سب سے کچھ شغف نہیں۔“

”مجھے تو ہے نا؟“ صدمہ لے کر میرب سیال پوچھنے کے سوال میں کیا کیا تھا۔ میرب سیال خاموشی سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ جب سردار سنگھین حیدر لغاری نے اس کے ناک سے ہاتھ کھانچے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لیا تھا اور وہ اس کے لیے جانے کیوں کئی عرض ہی نہ کرتی تھی۔ اچھی بھی اور اس کے سرگ جل پڑی تھی۔
دل کو کیسی ایسی ہی لگنے کی آرزو تھی۔ کیسی ایسی ہی مضبوط برقی منہ کی خواہش تھی جو اپنی پناہ میں لیتا تو دنیا کو کوئی ڈر باقی نہ رہتا۔ جو اس کے ہاتھ کو قہقاہہ تو لگتا ساری دنیا اس کی منہ میں آگئی ہو وہ جس کے سرگ کی کوئی دل پھر بھی جیسے مطمئن اس کے ساتھ چل رہی ہو۔ جس کی قربتوں میں اسے یہ زمین بھی آگئی اور ایسی ہی تو ہوا تھا۔ وہ شخص اس کے قریب تھا۔ وہ اس کی پناہ میں بھی۔ اس کی مضبوط ہاتھوں نے اس کے وجود کو قہقاہہ ہوا تھا۔ گھرجانے کیوں دل پھر بھی جیسے مطمئن نہ تھا۔ وہ ایسا کیوں تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ سردار سنگھین حیدر لغاری کی قربتیں کیا کیا کہنا یاں نہ کہہ رہی تھیں۔ وہ اس کی زلفوں پر جو کچھ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ اسے تو اپنا ہوش خانہ اس حدت سے جلتا ہوا محسوس ہوا تھا سارا وجود جیسے کسی آتش کے زور تھا۔

سردار سنگھین حیدر لغاری کے لب اس کے گیسو کوں پر ہولے ہولے پٹنے ہوئے محسوس ہو رہے تھے شاید وہ کچھ سرگوشیاں کر رہا تھا مگر میرب سیال کے خود اپنے اند کا شور اس قدر تھا کہ وہ کچھ بھی کی نہیں پارتی تھی۔ کچھ کچھ نہیں پا رہی تھی۔ بس اسے اپنا آپ کی لاؤ کے حصار میں لگ رہا تھا۔ حدت اتنی بھی کہ وہ خود کو دم روم سلگتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔



”کیا ہو رہا ہے یہ سب؟ کہاں جا رہے ہو تم؟“ فارحہ نے کس قدر حیرت سے دریافت کیا تھا مگر اذان حسن بخاری نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسی طرح سامان نکال کر سوٹ کیس میں رکھتا رہا تھا۔ فارحہ نے پیش قدمی کی تھی اور اس کے عین سامنے جا کر کھڑی تھی۔

”میں پوچھ رہی ہوں۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب؟ کیا کر رہے ہو تم؟ یہ؟“ اذان حسن بخاری نے ماں کی طرف ایک نظر دیکھا تھا۔ پھر چہرے کا رخ پھیر دیا تھا۔
”تھک گیا ہوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب میری برداشت سے باہر ہے۔ تھک چکا ہوں میں روز روز نوٹ بیوٹ کر اور سمٹ سیوٹ کر۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اب یہاں نہیں ہوں گا۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔“ واپس اسٹیٹ۔“ اذان حسن بخاری نے مطلع کرنے کے ساتھ ہی سامان اور دبا سوٹ کیس میں رکھنا شروع کر دیا تھا اور فارحہ اور اپنے اپنی جگہ ساکت رہ گئیں تھیں۔ پھر ایک لمحے میں فارحہ نے پیش قدمی کی تھی اور اس کے ہاتھ سے سب کچھ کے گرینڈ پر ایک طرف اچھال دیا تھا۔

”کیا کر رہے ہو تم؟“ تم نہیں پوچھو گرجاؤ کے ہم سب کو؟“ اس کی سمت دیکھا تھا مگر اذان حسن بخاری ان کی سمت سے نگاہ نہ اٹھا رہا تھا۔ کچھ لمحے کوئی نظر اٹھا رہا تھا پھر درد سے توقف سے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے فارحہ کی طرف دیکھا تھا۔

”میں! یہ بات آپ جانتی ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہ سب بدلنے والا نہیں ہے یہ تازہ درد بروز بڑھنے والا

ہی سے اور بڑھتے ہوئے تنازعہ عامتہ فہم نہیں ہوتے۔ یہ بات آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی جانتا ہوں گی۔
 کچھ ختم ہونے والا ہی نہیں ہے تو پھر کدھ کی۔“ اذہان سن بخاری کا لہجہ کدھ مانہ تھا اور فارحہ سے دیکھ کر وہ کسی
 خاموشی سے چکوں کے کنارے سے ٹھیکس بانی کے نظر سے ٹوٹ کر ٹھہرتے چلے گئے تھے اور اذہان سن بخاری ہاتھ لائے
 تھے ہوئے کڑھ سا یک طرفہ رخ کران کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

”کیا کروں میں تینے آپ؟ کیا کروں؟“ اس کا اندازہ کسی سے پر تھا۔ ”جب میرے یہاں رہنے والے
 بدل ہی نہیں رہا تو پھر میرے یہاں ہونے سے فائدہ؟ کسی آپ کیوں رد ہی ہیں میں آپ کو تو ہم نہیں کر رہا ہوں۔“ وہ
 تمام ارادے توڑتا ہوا آگے بڑھا تھا اور فارحہ کی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرنے لگا تھا۔ کہنے مال۔ پیٹلی
 محبت کا منظر یہ خود پیکر ہی تھیں۔

”مجھے... مجھے چھوڑ کر جانا چاہتا ہے تو اپنی ماں کو اتنا بڑا اور بھروسہ ہی ہے آج تیرے لیے یہ ماں کے چھوڑ کر
 چاہتا ہے تو؟“ فارحہ کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ چھوٹ چھوٹ کر رو رہی تھی۔ اذہان سن بخاری نے چوٹے ہاتھ
 سے ان کی آنکھوں کی نمی کو پونچھا تھا پھر اپنی ہاتھ کر سادھ لگا لیا تھا۔

”میں نہیں جانا چاہتا ان کی کو پونچھا تھا کہ بہت مشکل ہے۔ لیکن کیا کروں؟ آپ مجھے ہٹانے کیا کروں
 جب یہاں رہ کر میں سادھ حال آواز سے کسی میں نہیں کر رہا ہوں تو پھر میرے یہاں رہنے سے فائدہ؟ جب آپ
 دلوں کو اپنی ایک دوسرے سے رسد کر کے رہنا ہے تو پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ میں یہاں رہوں یا نہ کہیں۔“ اس
 لہجہ دم تنازعہ اور فارحہ کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

”مجھے فرق پڑتا ہے اذہان۔ تیری ماں کو فرق پڑتا ہے۔ تو کیوں اپنی ماں کو مزید بھی کرنا چاہتا ہے؟“ اذہان کی
 گردن تھکتے ہوئے سرے نفی میں ہلایا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ ان لوگوں کی میں وہ سب کچھ چپ چاپ جو سدا سن بخاری کہتا ہے
 کوئی مخالفت نہیں کروں گی۔ مگر تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“ ان کو ان کی حکم سے حوا بہرہ ہے تھے۔
 ”ساتھ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“ ان کے کڑھ لہجے میں عجب ایک ٹھک تھا اور اذہان نے انہیں باہوں میں سمیٹ

کر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

”جی! آپ سب کے بغیر میری زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ میں آپ سب کے بغیر نہیں جی سکتا ہوں۔ میرے
 لیے یہ سوچ بھی جان لیوا ہے مگر۔“ اس نے ٹھیک کر جملہ احوال چھوڑ دیا تھا۔ ”میں نہیں کہتا مگر سب سے آپ کی
 یا کسی کی غلط بات کو جب چاہا اتنی چلی جائیں۔ میں یہ سب نہیں چاہتا مگر میں آپ کو اس طرح ٹوٹ کر ٹھہرے
 ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے لیے یہ سب بہت تکلف دہ ہے۔ میں فرما رہا ہوں آپ سے نہیں چاہتا۔ فرانس میں صوفہ
 حال سے بھی نہیں چاہتا۔ فرانس میں تو میں اس ٹھکانہ و ریخت کے عمل سے۔ جو میں دیکھ نہیں رہا ہوں۔ میں
 آپ کو اس کیفیت میں نہیں دیکھ سکتا مگر میں آپ کو اس ٹھکانہ و ریخت کے عمل سے۔ جو میں دیکھ نہیں رہا ہوں۔ میں
 طرف اوتھتا ہوں۔ میں انہیں مصلحت سے مائل نہیں کر سکتا اور شاید میں انہیں قائل نہیں کر سکتا۔ وہ ہر آپ کو توڑیں گے
 پھوڑیں گے اور میں بھی کوئی احتجاج نہیں کر سکتا مگر میرے لیے یہ سب کچھ دیکھنا بھی بہت مشکل ہوگا۔ میں
 ہر آپ کو قوی فخر کرنے کے لیے ان کے سامنے جا کھڑا ہوں اور انہیں ہر باتیں خود کا پہلے سے بھی بڑا دشمنوں کو
 وہ غلط ہوتے ہوئے بھی خود غلط نہیں سمجھتے۔ انہیں گلے سے کہیں ان کی مخالفت کر رہا ہوں۔ یا آپ کو کوئی فخر
 کے لیے ان کے مقابل کھڑا ہو رہا ہوں۔ وہ یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ میں بھی آپ کو پھوڑ دوں گا تو آپ
 تنہا رہ جائیں گی۔ میں دانستہ ان کی مخالفت نہیں کر رہا۔ مگر ان کو جتنا نا اور درد کرنا میرے میں نہیں۔ مجھ سے یہ

نہیں ہو سکے گا اور نہ ہی میں آپ کو کبھی آپ کا مقام واپس دلا پاؤں گا۔ یہ فاصلوں کی خلیج پر جوتی چلی جائے گی۔“
 اذہان سن بخاری کا لہجہ ٹھکانہ خور تھا۔

”جی! کدھ گھر کے افراد سے متا ہے گھر میں بسنے والوں سے متا ہے۔ میں نے ہمیشہ ایک بسا ہوا گھر دیکھا ہے۔
 وہ سکھ دیکھا جو عظیم تر تھا۔ لیکن اب جب میں اسی لیے ہوں گے گھر کو ناپائیدار دیکھتا ہوں تو مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔
 اس گھر کی بنیادیں میرے سامنے ٹھکی ہوئی ہیں اور میں کچھ نہیں کر رہا ہوں۔“ فوری شاید کسی کبھی نہیں سے ہی قصور
 شاید اس وقت کا ہے جس نے ہم سب کو اس دور پر لاکھڑا کیا ہے۔ جس پر ہم چل کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ نہ
 ہی اس سے پلٹ پارہے ہیں۔ یہی ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس سے آگے کا مود کیا ہے۔ یا پھر اس سے آگے کی راہ
 کیا ہوگی۔“ اذہان سن بخاری کی آنکھوں کے کنارے بہت آہستہ سے بھگ رہے تھے۔ وہ اندازہ کے مرطلے سے
 چپ چاپ گزار رہا تھا۔ کہنے کی آنکھیں بھی کھینچنے لگی تھیں۔

فارحہ بھی آنکھوں سے ہاتھ اٹھ کر بیٹے کی سمت دیکھنے لگی تھیں۔

”میں تجھے اپنے ساتھ باندھ کر رکھنا نہیں چاہتی اذہان مگر میں تجھے سے جدا ہو کر بھی نہیں جی سکتی۔ ماں ہوں نا کیا
 کروں مجبور ہوں دل کے ہاتھوں۔ اپنی مانتا کے ہاتھوں۔ اس لیے تجھے بھی مجبور کر رہی ہوں کہ تو اس مشکل صورت
 حال میں بھی میرے ساتھ رہے۔ میرے ساتھ بنے چوہو خرش سے مگر سو چوہو خرش ہی اس خود خرش ہوتی ہے۔“ فارحہ
 بھی آنکھوں کے ساتھ ہوتی تھیں اور اذہان کی سجدوں کے ساتھ مودوب ہو کر ان کے سامنے جھکا دیا تھا۔

”مہی میں آپ سے الگ ہرگز نہیں ہوں۔ یہ جان آپ کی ہے ایک تو وہ مہی بے دلوں گا۔“
 ”لوہی بائیں کر کے اپنی ماں کو اور دھمکتے کر۔ وہ نہ ہٹائی لگاؤں گی۔“ فارحہ نے ہاتھ اٹھا کر محبت سے دھکی
 دی تھی۔ اذہان سن بخاری نے ماں کی سمت دیکھا تھا۔ پھر انہیں اپنے ساتھ جھکا لیا تھا۔



آنے سے پہلے کی ایک شام وہ سردار سنگھن حیدر لغاری کے ساتھ سب کے لیے گفٹس خرید کر تھی۔ جب مائی
 ماں کا فون آ گیا تھا۔ سردار سنگھن حیدر لغاری نے ہوش توڑی سے بات کر دیا تھا۔

”جی مائی ماں سب ٹھیک ہے یہاں جی آپ کی بھوہی۔“
 جی مائی ماں نے خائیا اس کی بات پوچھا تھا اور دھمکتا ہے اس کی سمت دیکھنے لگا تھا۔
 ”جی آ رہے ہیں میں تمہاری فلاحیت سے۔ نیچے۔ اپنی بھوہی سے بات نیچے۔“ اس نے نکل توں اس کی سمت بڑھا دیا
 تھا۔ ”میرب سیال نے اس کی طرف دیکھا تھا پھر توں اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔“

”السلام علیکم ایہا سیدی ہو؟“ مائی ماں محبت سے مخاطب تھیں۔ وہ مسکراتی تھی۔
 ”علیکم السلام ایہا سیدی ہو؟“ مائی ماں محبت سے مخاطب تھیں۔ وہ مسکراتی تھی۔
 ”جی ٹھیک ہوں۔ آپ کسی ہیں اپنی ماں؟“
 ”ٹھیک ہوں میں نہیں سے سوچا تم دونوں تو مجھے یاد کرو گے نہیں میں ہی یاد کروں۔“
 ”ارے یہ کیسے سوچ لیا آپ نے۔ اسیلا بھوہو ہلکا ہے۔ ہم آپ کے لیے بھول سکتے ہیں۔“ ”میرب سیال نے مودوب
 انداز میں کہا تھا۔

”جانتی ہیں جان میں تو اتفاق کر رہی تھی۔ یہ بتاؤ سنگھن حیدر لغاری خیال تو کر رہا ہے ہاتھ ماں؟“
 ”جی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سردار سنگھن حیدر لغاری کی سمت دیکھا تھا۔

”شاہدہ اظہار جو نظر آتا ہے دیا ہے نہیں۔ دیکھنے میں لگتا ہے وہ سخت گہرے۔ جسے شاید دوسروں کے جذبات کا قطعاً کوئی احساس نہیں۔ وہ شاید دوسروں کے متعلق سوچتا بھی نہیں گہرا کیا جیس ہے۔ سبکدین حیدر ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ تکلف میں تو وہ کسی جانور کے ننھے سے بچے کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ بات صرف سوراٹنے کی نہیں ہے جیادہ واقعی ایک حساس طبیعت کا مالک لڑکا ہے۔ بس کھلنے میں کچھ وقت لیتا ہے۔ اسے سمجھنا کسی قدر ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ وہ کسی سے خائف ضرور نہ سکتا ہے۔ لاطعل ضرور نہ سکتا ہے۔ مگر کسی کو دیکھ نہیں پہنچ سکتا۔ مائی اماں پر سبکدین حیدر لغاری کے متعلق کہہ رہی تھیں اور میرب سیال بے دھانی میں اس شخص کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری اس کی سمت بہت اچانکیت سے دیکھ رہا تھا۔

”نفس یہ نہیں جانتی جینا کرتا ہے کہ حد تک کچھ باقی ہو مگر میں چاہتی ہوں کہ تم اسے انڈر اسٹینڈ کر سکو۔ اسے سمجھنا اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ بس اسے دل سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ تم کچھ دہری ہو تاں میری بات؟“ مائی اماں نے اس سے دریافت کیا تھا اور اس نے سر پر دھائی سی اثبات میں ہلادیا تھا۔

”بات یہ ہے۔ جیادہ ہم کی کوئی حد تک سمجھنے لگتے ہیں تو پھر مشکلات کی قدر کم ہو گئے ہیں۔ بہت سی پریشانیوں ہماری اپنی تیار کردہ بھی ہوئی ہیں۔ اس میں مقصود صرف دوسرے کا ہی نہیں ہوتا۔ ایسا میں اس لیے نہیں کہہ رہی جیادہ کہ میں تمہاری ساس ہوں اور سبکدین حیدر لغاری کی ماں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں اس سے زیادہ تمہاری خیر خواہ ہوں۔ اسی لیے میں چاہتی تھی کہ تم دونوں کے درمیان ایک باہمی انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے۔ تم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سے سمجھو۔ میرا خیال یہ عرض اس کے لیے خاصا سودمند ثابت ہوا ہو گا ہے نا؟“ مائی اماں نے پوچھا تھا اور اس نے سر ایک بار پھر اثبات میں ہلادیا تھا۔

”جی۔“

”اچھا کیا واقعی تم ایک دوسرے کو سمجھنے لگے ہو کی قدر؟“ مائی اماں کو کسی قدر خوشی ہوئی تھی۔ وہ سردار سبکدین حیدر لغاری کی سمت دیکھتی ہوئی مسکراتی تھی۔

”جی کی قدر نہیں رفت ہوئی تو ہے۔ شاید اسے شناسائی ہوتی ہی کہتے ہیں۔“

”شکر ہے خدا کا۔ میں دل سے دعا گو تھی کہ تم دونوں کے لیے۔“ مائی اماں نے باقاعدہ شکر یہ ادا کیا تھا یہ بیانات دراصل یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ عرصہ بہت اہمیت کا حال تھا تاہم اس میں اس نے کئی زیادہ اہم بات ہے کہ سارا کام سارا کر دیا ایک عورت یا پھر لڑکی کی ادائیگی ہے۔ تم اسے اچھا ہو یا پھر مگر مرنے زندگی کے اس باب میں سمجھو بوجھ سے کام آگے کی کوئی لینا پڑتا ہے۔ بھی ایک بہت ہی زندگی و جدوجہد میں آسکتی ہے۔ ایک بڑا بستر گہر بن سکتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔“

”جی مائی اماں!“ میرب سیال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”بیانات یہ سختوں کی باتیں ہیں۔ نصیحتیں ہوئے بڑے بزرگ کرتے ہیں تو مجھے اپنی ساس میں سمجھ مان سمجھ مان سے بڑھ کر ایک دوست میں سبکدین سے زیادہ سمجھنا پڑے گی۔ یہ تم سمجھنا کہ میں کہیں کی مقام پر اپنے بیٹے کی حمایت کروں گی یا خواہ مخواہ سے فوڈ کروں گی۔ نہیں میں اسے اپنا بیٹا ہونے کی رعایت بالکل نہیں دوں گی اگر وہ کوئی غلطی اس شخص میں کرے گا۔ تم اس بات کا یقین کر لو اور سبکدین حیدر کو بھی سمجھا دو۔ جب سے گیا ہے کاروبار میں اچھا ہوا ہے۔ ایک بار بھی دھک سے بات نہیں ہوئی۔“ مائی اماں کو بھی مسکراہو اور وہ مسکراتی تھی۔

”آپ ان سے بات کر لیجئے۔“

”اس سے بات تو میں کروں گی ہی مگر پہلے سمجھنا چاہتا کہ وہ کیا بہت خیال رکھتا اور سبکدین حیدر کا بھی۔ تمہارے پاپا کی طبیعت اب کسی ہے؟“

”پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ آپ سبکدین سے بات کر لیجئے؟“ وہ فون پر تھا کہ ایک گفت شاپ کی سمت بڑھ گئی تھی اور جب وہ ایک کرشل ہارٹ ہاتھ میں لیے اسے جا چکی تھی۔ سبکدین حیدر لغاری وہاں آ گیا تھا۔ میرب سیال نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا مگر سردار سبکدین حیدر لغاری اسے دیکھنے کی بجائے پوری توجہ سے اس کرشل ہارٹ کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

”جیونی فل۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس آئٹم کو پورسوار کیا تھا۔ میرب سیال مسکراتی تھی۔

”اچھا ہے نا۔“

”ہاں بہت۔“ سردار سبکدین حیدر لغاری نے ہاتھ بڑھا کر وہ گفٹ اسٹیم اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ متاثر کن انداز میں اس کرشل ہارٹ کو دیکھتے ہوئے اپنی کوڑیاب کیمیر کی سمت مبذول کی تھی اور اسے فوراً بیک کرنے کو کہا تھا۔

میرب سیال اسے بتاتی تھی کہ لے لینا چاہتی تھی۔ مگر اب یہ کسی سے اسے صرف دیکھ کر کہی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری شاید اس کی مشکل سمجھ گیا تھا۔ بھی بہت ملامت سے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے بھاری مضبوط ہاتھ سے بچوں کی طرح چھپتا تھا۔

”تم کچھ اور لے لو۔ شاہاش۔“ اور میرب سیال اسے دیکھ کر کہی تھی۔ جانے کس کے لیے منتخب کیا تھا۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کرشل ہارٹ کو اسے قلع اس بات کا نہ تھا کہ اس نے اس کے ہاتھ سے اسے لے کر اپنے لیے بیک کر لیا تھا۔ بات اس سے بھی نہیں یہ بات دہری تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اسے کسی کے لیے بطور خاص منتخب کیا تھا۔ وہ خانی خانی ظالیوں سے غش و دیکھ رہی تھی جب سردار سبکدین حیدر لغاری اس کے قریب کھڑے ہوئے تو سمجھنے لگا تھا۔

”گیا ہے نا۔ مائی اماں نے ایسا کیا کہ بڑیا کیا تمہارا موڈ بگڑ گیا؟“

وہ ایک لمحے میں چونکی تھی۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔“ اس نے نرم فنی میں بلایا تھا اور سردار سبکدین حیدر لغاری مسکرا دیا تھا۔

”شیدو۔“ غور اس کی سمت دیکھتے ہوئے اسے دریافت کیا تھا۔

”ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی سمت سے لگا پھیر گئی تھی۔

مائی اماں کا کہہ رہی تھیں؟“ سردار سبکدین حیدر لغاری کو جانے کیوں جانے کا حقوق ہوا تھا اور میرب سیال اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

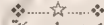
”کچھ خاص نہیں۔ بس یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ آپ کو کچھ خاص تحس نہیں ہو رہا جانے کا؟“ وہ مسکراتی ہوئی پر اعتبار نظروں سے اس کی سمت دیکھتی ہوئی ہوئی تھی۔ سردار سبکدین حیدر لغاری نے اس کی سمت پر غور دیکھا تھا۔ پھر جانے کیوں مسکرا دیا تھا۔

”ہو سکتا ہے۔ ہم میں بہت پرل باتیں ڈکس ہوئی ہوں۔ جن کے متعلق کسی اور سے شیئر کرنا ناممکن ہو۔“

میرب سیال نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور سردار سبکدین حیدر لغاری کو اس کے پر اعتماد اعزاز پر کی قدر تیرت ہوئی تھی۔

”اور نکلی۔“ غالباً وہ محظوظ ہوا تھا۔
 ”ہاں۔“ میرب سیال سکرانی ہوئی اس کی جانب توجہ بنا کر گٹھس پیک کرانے لگی تھی۔
 ”میرب۔“ ہوئے سے نکلا تھا۔
 ”جی۔“ وہ بٹنی نہیں لگی۔ اسی طرح کھڑے کھڑے جواب دیا تھا۔ اس کی پشت پر کھڑا سنگین حیدر زاری مسکرایا تھا۔

”جانتی ہو۔ بزنس ڈانف میں کچھ بھی پرستل نہیں ہوتا۔“ چایا تھا۔ وہ مسکراتی تھی۔
 ”ہوئے۔“ اسے روکیا تھا۔ انداز نکال کا برا عرصہ تھا مگر سنگین حیدر زاری مسکرا دیا تھا۔
 ”بزنس ڈانف میں بھی بہت کچھ پرستل ہوتا ہے۔ جیسے ابھی آپ نے کہ وہ کراہٹ ہلک کر دیا تو میں نے آپ سے بالکل یوں پوچھا کہ وہ آپ نے کس کے لیے پیک کر دیا ہے۔“
 ”اوہ نہ بات ہے۔ یہ۔“ سردار سنگین حیدر زاری حیران ہوئے۔ یہ زیادہ محظوظ ہوا تھا۔ مگر میرب سیال مزید کچھ بھی کہے بغیر آگے بڑھ کر اس کی اور بات اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے سردار سنگین حیدر زاری کو بھی پیش قدمی کرنا پڑی تھی۔



کتنے ان گزر گئے تھے۔ وہ اس روز کے بعد اس کی طرف نہیں آئی تھی اور اسے بھی مصروفیت اس اور درجہ رہی تھی کہ وہ اس سے بات تک نہ کر سکا تھا مگر اس کے باوجود اسے مطلع تھا کہ وہ اس سے ناراض ہے اور وہ جانتا تھا غلطی بھی اس کی تھی۔ یہی شام میں وہ اس کی طرف آ گیا تھا۔ وہ تیس پر تھی۔ اسے دیکھتے ہی منہ پھیر کر وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مگر اذبان سن بخاری نے بہت سرعت سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس کی سمت دیکھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ ساہیہ خان کی قدر نا گواری اسے اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔ مگر وہ بہت مودب انداز میں سر جھکا گیا تھا۔
 ”میں جانتا ہوں۔ غلطی میری کی سو آئی اہم سوری۔“ دم لے کر کہتا تھا اور ساہیہ خان اس کی سمت دیکھ کر ہنسی

تھی۔
 ”میں غلطی تمہاری نہیں تھی۔ اذبان سن بخاری۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں تمہیں اپنا کچھ بھی تھی۔ تمہی تمہاری دل جوئی کرنے کی بات تھی مگر مجھے نہیں بتا کہ تم اسے اپنی زندگی میں مداخلت نہ کرو گے۔“ ساہیہ خان نے اس کی قدر ادا کر لی۔
 ”میں کہا تھا۔ مگر اذبان سن بخاری مسکرا دیا تھا۔
 ”آئی سیڈ آئی اہم سوری! مجھے اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ تب ہی۔“
 ”لیکن تب تو تم نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“ ساہیہ خان نے اس کی سمت پر شکوہ نظروں سے دیکھا تھا۔ اذبان سن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”جب تم نے پوچھا ہی نہیں تھا؟ یاد ہے فوراً ہی اچھی تھیں اور چلی آئی تھیں۔“ یاد دلایا تھا مگر ساہیہ خان اس کی سمت سے رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھی۔
 ”ساہیہ جائیز لڑاؤ اندازہ نہیں دیتی۔“ اس کے سینے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے دم لے کر کہتا تھا کہ درخواست کی تھی اور ساہیہ خان اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

”اذبان سن بخاری! میں جانتی تھی۔ تم کس درجہ مشکل میں گھرے ہوئے ہو۔ مجھے تمہاری کیفیت کا اندازہ تھا۔“
 ”جی میں نے نہیں دیکر دوستوں سے ہٹ کر نہ کیا۔“ مجھے معلوم تھا کہ میں دجوبی کی ضرورت ہے مگر میں نے بھی جانتی تھی کہ میں ہمدردی کا کوئی عام انداز نہیں بھانے گا۔ شاید تم اسے ہمدردی کا اچھا خیال نہیں کرو گے۔ اس لیے میں نے تم

کے ایک مختلف رویہ اپنایا۔ مقصد فقط یہی تھا کہ تم کسی قدر سنبھل جاؤ۔ زندگی کی حقیقتوں کو فیس کرنا سیکھ جاؤ۔ میں نے ایک عام دوست سے بہت کچھ تمہاری دجوبی کی مگر تم نے..... اذبان سن بہت برے ہوئے۔ وہ چہرے کا رخ پھیر کر لگی۔
 اذبان سن بخاری مسکرا دیا تھا۔

”واقعی بہت برا ہوں میں مگر کیا کروں۔ ایسا ہی ہوں میں۔ کیا تم مجھ سے طرح قبول کر سکتی ہو؟“
 ”ساہیہ خان نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر ایک دھڑکی میں مسکرا ہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔
 ”اذبان! تمہارا پارا ملے جتا ہے کیا ہے؟ تم اپنے دوستوں کو بہت ہی کیو دل لیتے ہو اور ایسا کرتے ہوئے تم ان کے جذبات کو بھی کسی قدر ہٹ کر جاتے ہو۔“

”لیکن یہ بات بھی جج ہے کہ میں اپنے دوستوں کو کھونا قطعاً بھی نہیں چاہتا۔ سو یاد کیوں آئی کہ لوزا نے بیسٹ فرینڈ ناؤ۔“ اذبان سن بخاری نے اپنا چہرہ اٹھا کر اس کی سمت پھلایا تھا۔ ساہیہ خان نے اس کی سمت دیکھا تھا۔ پھر اپنا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ پر چڑھ دیا تھا۔
 ”مجھ سے۔“ اذبان سن بخاری مسکرایا تھا۔ ساہیہ خان بھی مسکراتی تھی۔

”میں تم سے ناراض نہیں تھی اذبان۔ میں ایک دوست کی کیفیت کو سمجھتی تھی۔ میں جانتی تھی تم کتنے ڈپر لیڈ تھے اور ایسے میں کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں کس نہیں کچھ وقت دینا چاہتی تھی تاکہ تم اس صورت حال کو خد آپ مجھے سکوار قبول کر سکو۔“ ساہیہ خان نے دیکھتے ہی کہہ لیا تھا۔ اذبان سن بخاری اس کی سمت دیکھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔
 ”ساہیہ خان! اب میری بہت بھلائی ہو۔ تم نے واقعی ٹھیک کہا تھا کہ جب تک میں اس صورت حال کو قبول نہیں کر لوں میں اس سے نہیں نٹ سکتا اور اب میں نے صورت حال کو قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔“

”ابھی اسٹیٹ دوبارہ جانے کا ڈرامہ رہا۔“ ساہیہ خان نے مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔ اذبان سن بخاری بہت دھیمے سے مسکراتے ہوئے چہرے کا رخ پھیر گیا تھا۔
 ”تو ساری خبریں دے رہی جا رہی تھیں اس کی فوری تو خود کیوں نہیں آگئیں؟“
 ”روکے۔“ ساہیہ خان نے وضاحت چاہی تھی۔ اسے مگر وہ کچھ بولنے پر آمادہ نہ تھا۔

”میں جانتی تھی تم میں جاسکو گے اذبان۔“
 ”کیوں؟ تمہیں یہ یقین کیوں تھا؟“ اذبان سن بخاری کو کسی قدر حیرت ہوئی تھی اور ساہیہ خان مسکراتی تھی۔
 ”اذبان سن بخاری! جو شخص مجبوس میں بندھا ہو وہ بھی کہیں نہیں جاسکتا۔ میں جانتی تھی۔ خود سے وابستہ رشتوں کی محبت تمہیں کہیں جانیے نہیں دے گی۔ بہتر ہو گا کہ تم اس بات کا یقین کر لو اور اتنے دھم دھارے کی کو پریشان کرنے کا ارادہ نہ کرو۔“

”فارحہ آئی نہیں مگر ان کی منگو نظر اس بل چھٹی لڑکی کو پریشان کرنے کا ارادہ کر سکتا ہوں نا۔“ وہ اسے شافوں سے تھامتا ہوا مسکرایا تھا۔ ساہیہ خان مسکراتی تھی۔

”اذبان! فارحہ آئی بہت پریشان ہیں۔ جائیز تم واقعی انہیں اتنے دھم دھارے پریشان مت کرنا۔ بہت سی امیدیں ہیں انہیں تم سے۔ بہت چاہتی ہیں وہ کہیں؟“ ساہیہ خان نے باور کر لیا تھا اور اذبان سن بخاری ہمدردی کے لبوں سے لڑکی کو دیکھ کر رو گیا تھا۔

”تم مجھے یہ یقین دہانتے تھے اذبان؟“ اس کے اس طرح دیکھنے پر وہ مسکرائی تھی۔
 ”نہیں ایسی بات نہیں ہے مگر میں تم سے اس قدر بھلائی کی باتیں اسے کیا کہ نہیں کر رہا تھا۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”تم کیا کہتے تھے سایہ خان کو صرف ہنسی مذاق ہی کرنا آتا ہے۔“
 ”نہیں، میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ تم ہر گھنٹہ میں کتنی خوب صورت ہو۔“ آنکھوں میں شرارت لیے وہ مسکرا رہا تھا اور سایہ خان ہنس دی گئی۔ وہ اپنی فطرت کی سی۔
 ”کلیئر بیٹھ میرے ساتھ رہنا اپنی طرح۔“ اذان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے دم لہجے میں درخواست کی تھی اور وہ سر اشات میں ہلائی ہوئی مسکرا دی گئی۔
 ”ہاں مگر تمہیں ایک پراس کرنا ہوتا۔“

”پراس؟“ وہ چونکا تھا۔
 ”ہاں وہ یہ کہ تم آئندہ کتنا بھی بڑا کر اس کیوں نہ زندگی میں آجائے تم اسے اتنا ہیوی نہیں لو گے اور بیشک شہنشاہی کے سوچ بچ کر اس صورت حال سے نمٹو گے۔“ سایہ خان نے اپنا نازک سا ہاتھ گے پر بڑھایا تھا۔
 ”لیں آئی ڈی پراس۔“ اذان حسن بخاری نے مسکراتے ہوئے اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پر دھریا تھا۔



عصفان علی خان کو کوشش کے باوجود غیور نہیں آ رہی تھی۔
 ایک بے خودی کی سی ایک اضطراب کی بھی جود کو چار اطراف سے گھیرے ہوئے تھی اور وہ بے بس تھا۔ مکمل طور پر بے بس۔

”نہ جانے کب سے
 امیدیں کچھ باقی ہیں
 مجھے ہرگز تیری یاد
 کیوں آتی ہے
 نہ جانے کب سے
 وہ بھی کچھ نہیں پایا تھا ان آنکھوں میں ایسا کیا جادو تھا۔ اس چہرے میں کسی کشش تھی۔ کسی دلکشی تھی کہ وہ اس سے آگے بڑھ کر نہ گئی۔ نہ پاتا تھا کچھ سوچ ہی نہ پاتا تھا۔ کیا تمہید تھا ان آنکھوں میں۔
 دور جتنا بھی تو مجھ سے

پاس تیرے میں
 اب تو عادت ہی ہے مجھ کو ایسے جینے میں
 زندگی سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے
 اب تو زندہ ہوں میں۔ اس غلیظ انسان میں
 کتنی باتیں ہیں جو ان کی س
 کتنی کہانیاں ہیں جو کسی بیان نہ ہو سکیں تمہیں جنہیں کبھی وہ اس سے کہہ ہی نہ سکا تھا۔ کسی بے اختیار تھی اس دل کی اور کسی بے نیکی کی اس کی۔

جاہت امیکا ہے تیری بڑھتی جانے
 آہٹ امیکا ہے یہ تیری مجھ کو ستانے
 یادیں کہہ رہی ہیں اس کی کدوں ڈوب جانے

اور آنکھوں میں غم غم بن جائے
 اب تو عادت ہے مجھ کو ایسے جینے میں
 کبھی کبھی
 کبھی باتیں ہیں
 بھلا دو انہیں
 مٹا دو انہیں

اجانک اس کے پیچھا آہٹ ہوئی تھی اس نے پلٹ کر دھان کیا تھا۔
 ”عصفان۔“ اما کو اسے اس وقت جاگتا دیکھ کر کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔ بھی وہ چلی ہوئی آگے بڑھائی تھیں۔
 ”تم سے نہیں بولیں ابھی تک؟“ اما نے دریافت کیا تھا اور اس نے بنا جواب دینے نظر اس جھکا لی تھیں سرخ آنکھوں میں کوئی گہرا اضطراب بول رہا تھا۔ فاطمہ خان نے کسی قدر فکر مندی سے جینے کی پیشانی پر ہاتھ دھرا تھا۔ عصفان علی خان بہت دھیمے سے مسکرا رہا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں اما۔“ وہ ہولے سے کہہ کر سر جھکا گیا تھا۔ فاطمہ خان نے جینے کو بغور دیکھا تھا۔ پھر بیٹے کے سامنے بیٹھ گئی تھیں۔

”کیا بات ہے۔ تم پریشان لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو؟ اس روز بھی میں نے پوچھا تھا مگر تم ناں لگے تھے کیا کہتے ہو۔ ماں سے ٹھوٹ بولنا اس قدر آسان ہے۔ کیا میری لگاؤ نہیں دیکھ رہی۔“
 ”کیا؟“ وہ مسکرایا تھا۔ مگر انداز بہت بھجا بھجا تھا تھا۔ ”کیا دیکھ رہی ہے آپ کی نگاہ؟“
 فاطمہ خان کچھ نہیں بولیں مگر وہ بیٹے کی جانب بہ غور دیکھ رہی تھیں عصفان علی خان نے ماں کی طرف دیکھا تھا پھر بہت دھیمے سے مسکرا رہا تھا۔

”اما! میں نے آپ سے کچھ چھپایا ہے۔“
 ”کیا؟“ فاطمہ خان چرکی گئی تھیں۔

”بہت کچھ اما۔“ وہ سر جھکا گیا تھا۔ انداز بے حد بھجا بھجا تھا تھا۔ ”بہت کچھ۔“ وہ ان کی سمت دیکھنے لگا تھا۔
 ”لیکن اب میں مزید کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ آپ جانتی ہیں کسی جرم کا مرکب نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھنے لگا ہوں۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود ایک احساس جرم میرے قدموں سے ہر گھڑی لپٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اما آپ جانتا چاہتی ہیں نا میں کس لیے پریشان رہتا ہوں۔ وہ کوئی بے یقینی ہے جو مجھے ستانی رہتی ہے۔“

اپنی اضطراب سے بھری آنکھوں کو وہ ان کی سمت اٹھائے کہہ رہا تھا اور فاطمہ خان ساکت سی بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔
 (ہائی آئینہ ماہ)



صرف ایک

ریشہ غزل

تجھے دیکھنے کی حسرت میری آنکھ میں نہاں ہے
تیری دکھ بھری کہانی کہیں خواب ہو نہ جائے
تیرے درد کا مسیحا تیرے رزم نوچتا ہے
تیرے ہجر کی نشانی کہیں خواب ہو نہ جائے

”ماذیہ..... ماذیہ“ وہ اسے نکارتا کچن تک چلا آیا۔ اور اٹیٹ خود تیار کر لیتا۔ ”اس نے نرم خمندے لیے تھا۔“ تم نے میرے کپڑے پر پس کیوں نہیں کیے؟ میں اسے فکر کے مزید جلا دیا تھا۔
اب میں آفس تمہاری ساڑھی پہن کر جاؤں؟“ وہ بری طرح تپا ہوا تھا۔ رات میں ماذیہ نے اپنے کپڑے پر پس کر کے ڈالے تھے جب اس کے کپڑے پر پس کرنے بیٹھی تو لائٹ چلی گئی۔ کئی گھنٹوں کی خواری کے بعد لائٹ آئی تو پاور انتہائی کم تھی جس کے باعث اس کا سوٹ پر پس ہونے سے رہ گیا تھا۔
”ساڑھی پہن کر تم خاؤں تو ضرور لگو گے۔“ اس کی بات کو ماذیہ نے اٹھا لیا۔
”شٹ اپ..... تم ہمیشہ یہی کرتی ہو میرا کام سب سے آخر میں کرتی ہو۔ اول تو کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا مگر مجبوری کا نام شگر۔ میں تمہارا شوہر جو بھرہا کرنا پڑتا ہے۔ اگر میرے کام اتنے ہی ناگوار کرتے ہیں تو مت کیا کرو میں خود کر لیا کروں گا۔“
”کیلی..... پھر میں ٹھیک پر انتظار کروں تم جائے“
ایک تو جہیں انڈہ فرامی کرنا نہیں آتا۔ ایک سوا

حسب معمول اس کا تھیدی پر گرام شروع ہو چکا تھا۔
 ”اب میں سونا کو یہاں بلانے سے رہی، ماشاء اللہ
 سے وہ اپنے گھر بار کی ہے اسے اپنے شوہر کے لیے
 اٹنے فرمائی کرنے دے بہتر ہے۔“ اس نے بغیر ماسٹو
 کے جواب کیا۔
 ”تم اپنے سے فرمائی کرنا نہ کیسنا کوئی کام ڈھنگ سے
 سے نہیں کرتیں۔“
 ”سوچ لو..... پھر سارے کام جنہیں خود کرنے
 ہوں گے اس سے اتنے کے بعد نہ تمہیں جانے لے
 گی اور نہ ہی کھانا۔“
 ”تمہارا پھر..... فائدہ؟“ وہ اس کی دھمکی پر ہلکایا
 تھا۔
 ”یہ فائدہ کم ہے کہ جنہیں میری صورت نظر آتی
 رہے جس کے بغیر تمہارا گزارہ نہیں ہے۔“ وہ شرارت
 سے مسکرائی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اس کے
 کاموں پر لاکھ تھیدی کرنا رہے مگر اسے مادی سے بے پناہ
 محبت تھی۔ تھیدی کی اس کی شروع سے عادت کی پہلے وہ
 بہنوں کے کاموں پر کرتا تھا بعد میں مادی کی صورت
 میں ایک وجود اس کے سامنے تھا۔ نہیں دونوں اپنے
 گھر کی ہو چکی تھیں۔ مسز دودھیا بڑے بیٹے کے گھر
 راتی تھیں اور دوسری ان کے ساتھ والدہ کی حیات نہیں
 تھے۔
 ”تم میری ہر بات کو اس طرح نظر انداز کرتی ہو کبھی
 اپنی غلطیوں کو سدھارنے کی کوشش نہیں کرتیں۔“
 ”ادھر ارسل کر گئیں میں جا کر انڈے تو جو جائے تو
 اس میں میرا قصور ہے؟ پھر تمہیں زردی ثابت جا چاہے۔
 کہیں سے جانا ہوتا ہوا تھے تو خرچے ہیں حالانکہ نہیں
 بعد میں بھی تو ذرا کڑی کھانا ہوتا ہے کیا تم ایک انڈہ پورا
 ایک ہی وقت میں کھا سکتے ہو۔“ اس نے تیراگی سے
 آنکھیں پیلانی تھیں۔
 ”میری سلیقہ اور ڈھنگ ہے جس سے تم کو کھانا دور
 ہو۔“

”میں ایسی ہی سی ہوں۔ تم اپنے کتنے کام سلیقے
 سے کرتے ہو دواش روم سے لے کر کمرے تک تمہاری
 کتنی ہی چیزیں پھیلی رہتی ہیں کبھی تم نے اٹھا کر انہیں
 رکھا۔ وہ دروازہ میں ہی اپنی جگہ پر رکھی ہوں مگر میں
 نے تو تمہیں اس کیس نہیں کھا اور نہ ہی نوکا۔ اس کی مسلسل
 تھیدی نے اس کا سوڈ آف کر ڈالا تھا۔ وہ غصے میں گرم
 چائے کے گھونٹ بھر لی۔
 ”انیم سو ری.....“ ارسل کو اپنی زیادتی کا احساس دہا
 تھا۔
 ”اوش ادکے.....“ اس نے کپ ٹیبل پر رکھتے
 ہوئے کہا۔
 ”پھر ناشتہ کرو ڈھالی چائے کیوں لی رہی ہو؟“ اس
 نے نوکا تھا۔
 ”اچھی میرا موڈ نہیں ہو رہا۔“
 ”پھر یہ ناشتہ لے جاؤ میں بھی نہیں کر رہا۔“ اس
 نے ہاتھ پرے پسند کیا تھا۔
 ”میں بعد میں تھولوں گی، تم تو آفس جا رہے ہو کھا
 کر جاؤ۔“
 ”تم بھی کرو میرے ساتھ..... مجھے معلوم ہے
 تمہیں میری باتیں بری لگی ہیں اس لیے تم نہیں کر رہی
 مگر یہ تو سوچو یہ سب تمہارے پھلے کے لیے ہیں۔“
 ”اف.....“ وہ بڑبڑاتی تھی۔
 ”ادھر اور سو نا کبھی میری باتوں کو ماسٹو نہیں کرتی
 تھیں۔ میں کبہا تمہارا تھوڑا وہ رہتی رہتی نہیں۔ تم تو برا
 مان جائی ہو۔“ وہ بولا۔
 ”نہوں نے ہی تمہاری عادتیں خراب کی ہیں۔ اگر
 شروع سے نوکا ہوتا تو تم سیدھے ہوتے بیوی کے کان
 نہیں کھارے ہوتے۔“
 ”میں تمہارے کان کھا رہا ہوں۔“ اس نے مادی کو
 گھورا تھا۔
 ”تو سوچ سے میرے حسن کے قصیدے پڑھ
 رہے ہو۔ کبھی سوٹ پر تھیدی بھی ناشتہ پر اعتراض۔“ تاہم ا

دیکھو ساڑھے آٹھ ہو رہے ہیں آفس پہنچنے پہنچتے تم پھر
 لیٹ ہو جاؤ گے اور اگر کام میرے سر رکھو گے.....“ اس
 کے احساس کرانے ہی وہ اٹھا تھا۔
 ”اب تم پچھنچ کر اور اور بیک لارڈ۔ میں شو پینٹا
 ہوں۔“ مادی بیک اور گھڑی لیے آگئی تو وہ شو پینٹا
 کھڑا ہو چکا تھا۔
 ”دو پیر میں کیا پکاؤں؟“ مادی کو کھانا یاد آیا تھا۔
 جب سے اس کی ساس بڑے بیٹے کی طرف تکی تھیں
 تب سے یہ ذمہ داری ارسل کے سر آگئی تھی۔ اگر وہ اپنی
 پسند سے کچھ پکائی تھی تو اسے پسند نہیں آتا تھا۔
 ”سوال سر پکالو۔“ اسے پہلے ہی دیر ہو رہی تھی اس
 کے میاں پر وہ پھنسا گیا۔ بیک کے ہاتھ سے لپٹے
 ہوئے بولا تو وہ نے اختیار اس دی۔ ”یعنی کہ مغز ہے
 ناں..... ویسے تمہیں اس چیز کی ضرورت بھی ہے۔“ وہ
 معنی خیزی سے بولی تھی۔
 ”مازی.....“ اس میں بائیک کی جاہاں نہیں
 ہیں..... اس نے سنجیدی سے اس کے لفظوں کو نظر انداز
 کیا تھا۔ وہ چاہاں لے کر آئی تو وہ دروازے سے باہر
 نکلے ہوئے بولا۔
 ”چکن فرائی بنا لیا اور موڈ ہو کو نئے بھی۔“
 ”کو نئے مجھے اچھے نہیں لگتے۔“ اس نے منہ بتایا
 تھا۔
 ”تم نے کھانے ہیں سچانے نہیں.....“ وہ کہتا ہوا
 باہر نکلتا تھا۔
 ”یہ تو ہے مگر.....“ چکن فرائی ٹھیک ہے وہی بناواں
 گی۔“ اس نے پیسے ہوئے دروازہ لاک کیا تھا اندر
 آئی تو ٹیبل ہو رہی تھی۔
 ”میں مادی.....“
 ”مادی.....“ مادی گھڑی آئی ہوئی ہے اگر کوئی مسئلہ نہ
 ہو تو تم بھی آ جاؤ۔“ دوسری طرف دروازہ کھنکھناتی تھی۔
 ”پہلے کال کر لیں تو میں ارسل سے کہہ دیتی۔“ اس
 پھوڑ دیتے۔ اب میں اکیلے کیسے آ سکتی ہوں۔“ اس

نے مجبوری ظاہر کی۔
 ”میں گھر بھائی سے کہتی ہوں وہ جنہیں آفس جانے
 سے پہلے پھوڑے ہوئے چلے جائیں گے۔“ وہ وہ
 آفری۔
 ”رائٹ..... پھر میں تیار ہوتی ہوں۔“ اس نے
 رضامندی دیتے ہوئے ریسپور کھا تھا۔ رضی کا ابھی
 ایک ماہ پہلے ہی شادی ہوئی تھی اس لیے اس کا اپنے
 شوہر کے ساتھ آ جانا ہو رہا تھا۔ دوپہلی الگ ہو رہی
 تھیں۔ اس نے گھر سے ہی ارسل کو آفس فون کر دیا
 تھا۔
 ”صحیح تو کہ پروگرام نہیں تھا۔“ وہ بار بار سرسرا
 کے پکڑوں سے بیزار ہوتا تھا اس لیے روکے کچھ لکھے
 بولا۔
 ”ہاں..... تمہارے جانے کے بعد وہ نہ فون
 کیا تھا۔ پھر میں نے بھی سوچا اتنے دن ہو چکے ہیں
 راضیہ سے ملے ہوئے۔ میں چلی آئی اب تم کھانا نہیں
 کھانا۔“
 ”ایسا کچھ نہیں ہو رہا، تمہیں معلوم ہے مجھے اس
 طرح بار بار یاد آنا اور کھانا کھانی پسند نہیں ہے۔“
 ”ارسل! وہ کبھی تمہارا ہی گھر ہے۔“ مادی کو اس کا
 لہجہ پسند نہیں آیا تھا۔
 ”تو..... میں فضول بحث نہیں چاہتا میں آفس سے
 تمہیں چھپنے کے لیے آؤں گا اور تم گھر چلو گی کھانا
 گھر پر ہی کھا لیں گے۔“ اس نے سختی سے کہا۔
 ”اور راضیہ سے کہیں؟“ وہ مایوس ہو گئی۔
 ”کچھ کچھ گھر کو میری بلا سے۔“ اس نے ریسپور چٹا
 تھا۔
 ”ہنہ..... ایک تو اس شخص کے خرچے۔“ اس نے
 کہتے ہوئے ریسپور کھا اور پھانسا سوچتے ہوئے بہنوں
 اور بھائیوں کے درمیان بیٹھی۔ ”پھر تم شام کچھ
 ناں۔“ بڑی بھانجی نے پوچھا تھا۔
 ”نہیں بھانجی، ارسل کے ساتھ وہاں بھائی کی؟

”آ جاؤ یا ایمان سے اسکاٹی کمرے کے لیوٹ کے موٹ میں تم قیامت لگ رہی ہو۔“

”ڈائیا لگ..... جیٹ۔“ اس نے سر جھٹکا تھا۔

”تمہیں میری محبت ڈائیا لگ نظر آتی ہے۔“ وہ قدموں پر پیڑی وہ اس کے سر پر تھا۔

”تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو میری بات مانتے“ میرا دل رکنے کی محبت میں ہوتی کہ محض ڈائیا لگ بازی کرتے رہو جب پروف کرنے کا وقت ہو تو آنکلیں مانتے سر رکھ لو۔“ اس نے غصے سے اپنا بازو پڑا دیا تھا۔

”جج تمہارے بغیر کھو سوتا ہونا لگے ہے اور مجھے معلوم تھا تم کھانا کھاؤ تو کم وہیں ضرور لگ جاتیں تمہارے بغیر مجھے فینڈ بھی نہیں آتی۔“ وہ حال دل سنا رہا تھا۔

”فینڈ کیوں نہیں آتی؟“ وہ حیران ہوئی۔

”بدھو اس کو محبت کہتے ہیں۔“ وہ اس کا سر ہلاتے

ہوئے مسکراتا تھا۔
”ہماری شادی کو ایک سال ہو چکا ہے جناب“ کھل
آئے خوابوں کی دنیا سے۔“ وہ بے زار ہوئی۔
”گزرتے دنوں کے ساتھ میری محبت ہوتی ہی
جاری رہے، تم یقین نہ کرو تو اور بات ہے۔“
”اور جب رہا تب ہر کام میں تنقید کرتے ہو تب
تمہاری محبت کہاں ہوتی ہے۔“ اس نے غور کیا تھا۔
”تمہارے آس پاس ہی پیکر لاری ہوتی ہے۔۔۔
بچ۔“ اس نے یقین دلایا تھا۔
”ٹھیک ہے پھر جاؤ ہوگی سے نان لے کر آؤ، لیکن
فرانی کے ساتھ مزہ دیں گے۔“ اس نے ارڈر دیا تھا۔
”اور۔۔۔“ وہ خرم آتا گوندنے جاری تھی۔ ”وہ
فوراً باہر جانے اور کام کے خیال سے اچلا تھا۔ آفس
سمانے کے بعد وہ بہت کم باہر جاتا تھا۔
”تمہاری محبت نے باندھ لیا ہے اب آنا کیسے
کوئیں۔“ وہ ڈرائیو سے مسکراتی تھی۔
”تم بہت چالاک ہو۔“
”تم سے کم آپ جاؤ ہیں اتنے میں کھانا لگاتی ہوں
اور جلدی کرتا“ بھوک لگ رہی ہے۔ اچھا ہوتا وہیں
کھا کر آجاتے۔ یہ ہے بھانجی مرغا اور سرخ
جبو لے بنائی تھیں حکمران ہوتا۔ وہی کرنے ہو جو دل
چاہتا ہے۔ اتنا اچھا ڈنس کر دیا۔“ وہ انفس کر رہی
تھی۔ وہ اپنی قسمت پر آنی مجربا باہر نکلتا تھا۔ ”خواہ خواہ
ہی اسے نیکار بیٹھا“ کھانے کے بعد پکارا تا تو۔۔۔“ وہ
موچنار ہوا باہر نکلتا تھا۔

❦❦❦❦❦❦

”ارسل کتنا اچھا ہوتا اگر ہمارے پاس بھی اپنی
گاڑی ہوتی۔“ اس نے حسرت سے مونی کا گاڑی کو
دیکھتے ہوئے ارسل سے کہا۔
”اپنی بانیک ہے یاں۔۔۔“ اس نے بیٹھے ہوئے
اشارت کی۔

ایک سے کوئی جو بحث مباحثہ نہیں۔" وہ ٹوٹلے سے لپے کر تے ہوئے اس کے برابر لپکی۔
 "بانگ پر ہی شکار ادا کرو گا، بعض لوگ اس سے ہی محروم ہوتے ہیں۔" گاڑی روڑ پر لاتے ہوئے وہ بیڈی سے گویا ہوا۔
 "جن لوگوں کے پاس نئے ماڈل کی کاریں ہیں وہ کن سائیکل ادا کرتے ہیں جو اس کٹارہ کروں۔" اس نے اپنی چھوٹی سی تاک کو سیکڑا اٹھا۔
 "تکڑی کرنی، ڈاک با رہا پر چلا گیا تو تھارے ایک سے ایک سے شکار کریں کھڑی کروں گا۔" ہمارے سب خواہوں کو حقیقت میں ڈھیل دوں گا۔" جھوٹا انتظار دار۔۔۔۔۔ آکس کریم کھاوا گی۔" اس نے ارکو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 "ہیوں۔۔۔۔۔" ارسل نے پارکے قریب ہی گاڑی لکی تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا اور وہ اس کے اسرار پر ناک کی طرف آئی تھی۔ بہت دنوں سے سونیا اسرار بھی کر رہی تھی کہ وہ کونسا تھا۔ آج کا سارا دن وہیں گزارا۔ وہ گھر کا شام میں کھانا کھا کر رخصت ہوئے تھے۔
 "سونیا کی طرف وہ لوگ بہت کم جاتے تھے۔ سونیا بھی امیر لک میں بیاتی تھی۔ وہ لوگ ان کی حیثیت کے مقابلے میں خاے اور نچے تھے۔ ان کے گھر جا کر کے خواب اس کی خواہشیں اس کی تشنہ رزوں میں پریشان کرنے لگی تھیں۔ اس نے اچھی امیر لک میں آج نہیں سمجھی تھیں۔ شادی سے پہلے پیدا اور اس سے وابستہ چیزوں کے سلسلے میں بھی اسے ترسنا نہیں پڑا۔ اگر شادی کے بعد ہی چیز موم چھ کر اسے بہت جتن سب سے لپٹی پڑتی ہیں اپنی جیب کے دیکھ کر سمجھ کرنا تھا۔ ارسل نے بھی اسے خرچ کے سلسلے میں ٹوکا تھا۔ اگر اسے معلوم تھا کہ ارسل کی اتنی ہی خواہ ہے میں اس کی طرح گزارہ کرنا ہے اور کتنے روپے اپنے بچ کے لیے نکالے ہیں۔ ارسل کی شرافت اور پھر ادنیٰ ہونے کی بنا پر رشتہ پڑا تھا۔ بقیل ابو کے

اتنے اچھے پڑھے لکھے سیکھے اور سمجھ دار خاندانی لڑکے ملنے کہاں ہیں۔ اس رشتے میں سب سے زیادہ رضامندی ان کی ہی رہی تھی کیوں کہ ازل ان کے دوست کا بیٹا بھی تھا اور وہ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس کی اور بہنیں دونوں ہی اچھی تعلیم یافتہ تھیں۔ وہ مالی طور پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے اپنے بنگلے تھے جب کہ وہ ازل کی سنگت میں تین کمروں کے فلیٹ میں بیاہ کر آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ آگس کریم کھاتے ہوئے مگر انتہائی تھی۔

”اے کمان جیجر پاز برآؤ جے ہے وہ اپنا ہے اور اسی میں خوش ہونا چاہئے“ ازل نے اس کی اداسی کو نوٹ کر لیا تھا۔

”ازل تمہارے حالات کب بدلیں گے۔ یہ اول چاہتا ہے بڑا صاحب صورت سا گھر ہو اس کے پورے ملک میں کئی کاروبار لائے نہ کھڑی ہوں اور خرچ کے لیے اتنا پیسہ ہو کہ سوچنا نہ پڑے کہ اگر یہ خرچ ہو گئے تو پورا مہینہ کیسے چلا جائے۔“ وہ اپنی خواہشیں بتا رہی تھی۔

”جہاں بہت سا پیسہ ہوتا ہے وہاں خوشیاں کم ہوتی ہیں“ محبت کی سب کی طرح خوش ہوئی ہے اور وقت کسی نایاب شے کی طرح ہاتھ سے پھسلتا رہتا ہے۔ ابھی ہمارے پاس یہ سب نہیں ہے مگر ہم کتنے خوش اور مطمئن ہیں۔“ ازل نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی کمرٹ میں لیتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سر میں جھماکا تھا۔

”یہ سب تو قریب ہے مگر ازل اس زندگی کا چارم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اصل زندگی ہی وہی ہے۔ مکمل خواہشوں اور آزادیوں کے ساتھ جینا“ اب سوچنا نے مجھے اپنی شایگ دکھائی تھی۔ ایک سے ایک اور شے کا قیمتی سوٹ اور پرفیم لائی ہے۔ دیکھ کر ہی آنکھیں روشن ہو جائیں اور ایک دم ہو جب سے کہہ رہی ہوں مگر بیچ بدور ہے پالوموٹ لے آتے ہیں نال رہے ہو مکمل۔“ اس نے منہ ہچکلاتے ہوئے کہا۔

”ایسی بات ہے تو پھر کل چلتے ہیں۔ میں آفس سے آنے کے بعد تمہیں لے جاؤں گا۔“ وہ اس کا دل رکھنے کے لیے بولا۔

”سچ؟ پر اس کرو۔“ وہ خوش ہوئی۔
 ”پراس کی کیا ضرورت جب کہدیا سو کہدیا۔“ وہ شابہنا انداز میں بولا۔
 ”جی نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہو رہا پر اس کرو ورنہ کل تم آفس سے فون کر کے کہدو گے میننگ ہے بڑی ہوں۔“ اس نے ارسل کا ہاتھ پکڑ کر اسرار کر دیا۔
 ”اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔“ وہ ہنسنا تھا۔

اس کی ایک ہاں نے دنیا کو کتنا خوب صورت اور روشن کر دیا تھا۔ مازی نے آفس کریم کھاتے ہوئے ارسل کو کھیر کے لیے محبت سے دیکھا تھا۔ رات کے جب وہ کھڑو لہو کے تو جھٹکے تھے۔ ارسل لہاس پیچ کر کے سوئے کے لیے لیٹا تو مازی کو یاد آیا اس کا سوٹ پریس کرنا تھا۔

”ارسل! میں روز دوڑ تمہاری ڈریسنگ سے بہت تنگ ہوں روز سوٹ پریس کرو کم از کم سوٹ دو دن تو چلایا کرو۔“
 ”مینجس میں آفس جاتا ہوں کسی ٹیڈی رکان نہیں کہدو روز ایک سوٹ چلاؤں۔“ اس نے چولا کہا۔
 ”پھر بھی۔۔۔ میں اب اتنی کھنکی ہوئی تھی مگر تمہارا سوٹ پریس کرنا ضروری ہے۔“ اس نے استری کا پلنگ لگاتے ہوئے کہا۔

”تو کرو۔۔۔ تمہارا کام ہے وہ تو تمہیں ہی کرنے ہیں۔“
 ”ہاتھ بٹانے میں کوئی حرج تو نہیں۔“ وہ چڑی۔
 ”ہاں کل سے کھانا بھی میں ہی بنالیا کروں گا۔“ اس نے طنز کیا۔
 ”سچ۔۔۔ ایک بار پھر کہو۔“ وہ کھلنے ہوئے بولی۔
 ”گڈ نائٹ۔“ اس نے نکی منہ پر کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تم ابھی نہیں سو رہے۔“ اس نے بڑھ کر کہیے چمکا تھا۔
 ”یہ کیا حرکت ہے۔“ وہ حیران ہوا اس کی کارروائی پر۔

”میں کام کر رہی ہوں تمہاری وجہ سے اس لیے آپ کو سونے کی ضرورت نہیں ہے جب تک میں جاگ رہی ہوں تم بھی جاگو۔“ اس نے وارننگ دی۔
 ”خدا کو مانو۔۔۔ رات کا ایک بج چکا ہے سچ آفس سے لیٹ ہو جاؤں گا۔“ اس نے دہائی دی۔
 ”میں نہیں معلوم۔“ وہ کندھے پر کرا پتا کام انجام دے گی۔ وہ نیند میں کھنکی بندھوئی آکھوں سے اچھٹا ہوا اس کی باتوں پر ہوں۔۔۔ ہاں کرنا ہے۔ جب وہ اُدھے کھنکے کے بعد بیڈ پر آئی تو ارسل تقریباً چھوڑ رہا تھا۔

”تم ابھی تک جاگ رہے ہو میں تو سبھی تھی۔“ وہ حیران ہوئی۔
 ”تم نے ہی کہا تھا جاگنے کو اور۔۔۔ اب۔۔۔“ وہ گنگ پر گر کر غائب ہوا تھا۔
 ”کہا تھا مگر۔۔۔ اتنی فرمانبرداری بھلا کس کھاتے میں کرنا نقصان کر بیٹھو۔“ وہ اس کے کان کے پاس جا کر بولی تھی۔ وہ کسمسا کر روٹ بدل کر غائب ہوا تھا۔

”کبھی تمہاری کسی دوست کی شادی ہوتی ہے کبھی کسی دوست کی تھوڑے دنوں میں بے زار ہو چکا ہوں گفٹس دیتے دیتے۔“
 ”ارسل شرم کرو تم کتنے سنجوس ہو۔ ان لوگوں نے ہماری شادی پر جو گفٹ دیئے تھے کیا لے کر گئے رہیں کسی کو دین نہیں۔“ وہ افسوس سے گویا ہوئی۔
 ”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس وقت میرے پاس اتنی کم نہیں ہے کہ کوئی مناسب سا گفٹ آ سکے۔ اس نے صاف کہا اور سونے پر جا بیٹھا۔

”اگر میں نہیں کی تو تیلیم بہت خفا ہوگی۔“ اس نے تھا۔

”مل کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
 ”کسی کے آنے سے نیانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
 ”تقریب ہو جاتی ہے کبھی غصہ ہوتا ہے۔ اگر وہ تمہاری ہلکی دوست ہے تو کبھی زیادہ ناراض نہیں ہوگی۔“

”چلو۔۔۔ ناراض نہ کی۔ اسے اس خاص موقع پر باری کی تو قیل ہوگی ناں۔“ وہ اس کی وضاحت پر ہلائی۔
 ”تم فون کر کے کہہ دینا میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم پھر کسی دن مل آئیں گے۔“ ارسل نے غدار لٹا۔

”یہ کوئی بات نہیں ہے جب شادی نہیں گئے تو بعد میں جانے کی کیا عیب ہے۔“ اسے غصا آ گیا۔
 ”ٹھیک ہے پھر تمہاری مرضی۔“ وہ اٹھ کر مل دیا۔
 ”تم کہاں جا رہے ہو۔“ اس کمرے سے باہر جاتے کہہ کر یاد کیا غصہ بڑھنے لگا۔
 ”جب تمہارا موڈ ٹھیک ہو جائے گا میں آ جاؤں گا۔“ وہ ناولی بولا۔

”میرا غصہ اتنی جلدی نہیں ہو سکتا۔ ہر بات پر اپنا دل مارتے ہو وہ خواہی کو دباوے رہو شادی کے بعد رات کو اس لائف ہوتی ہے مجھے نہیں چاہیے۔“ اس کی آنکھوں میں ضبط کرنے کے بھی آئینہ لگے۔
 ”تمہیں پتہ ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟“ ارسل نے اس سے اس کی صورت دیکھی تھی۔

”وہی کہہ رہی ہوں جو سچ ہے۔ اس ایک سال میں دن کی میری خوشیاں میری میری آرزو میں رہی ہوئی رہی ہیں۔ ہر خواہش ہر خوشی کے پتے پتے۔ دوسروں کو دیکھنا ان کے شو پر کبے ہاتھ کھلا کر کے ہے ہیں سوچتے بھی نہیں اور ایک تم ہو ذرا سے بیسے کر دیئے فوراً حساب کتاب شروع ہو گیا۔ تم بہت بچوں ہو۔“
 ”شٹ اپ۔۔۔ غصے میں نجائے کیا اول فول بول لی ہو۔ مجھے اعزاز نہیں تھا میں پیسے سے اتنی محبت

ہے اتنا پیارا اور لگاؤ ہے۔ اگر یہ ہوتا تو پہلے اتنا کیا لیتا کہ تمہارا دل بھر جائے پھر شادی کرتا۔“ وہ پیر بیٹھا ہوا پیر لگا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مازی نے روٹی دی سوچتی رہی۔ اسے سب سے زیادہ غصا کا سوس بھی ہو رہا تھا اور اس کی ناراضگی اگلے دن جلا رہی تھی۔ کئی گھنٹوں بعد جب اس کی داہنی ہونٹ تو مازی وہیں لاؤنچ کے صوفے پر بیٹھی گئی روٹنے سے اس کی آنکھیں سوچ چکی تھیں اور چہرہ استاسا ہو رہا تھا۔

”تم۔۔۔ ابھی تک رو رہی ہو۔“ ارسل اس کے قریب آ کر دھا تھا۔ اس کے پوچھنے کی دیر بھی اس کے آسوا کیا ایک کر کے گرنے شروع ہو گئے۔
 ”اوہ یار۔۔۔ ام سوری لیکن غلطی تمہاری تھی مان لو تمہارے غصہ دلانے پر مجھے غصا آتا تھا۔ چلو اب بات ختم کرو گھنٹوں آفس کریم لایا ہوں۔ تمہیں پسند ہے نا اٹھو۔“ ارسل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔
 ”مجھے نہیں کھانی۔“ وہ کھنکی گئی۔

”مازی! غصہ دہی اچھا ہوتا ہے جو جلد ختم ہو جائے۔ چلو یار اب مان غی جاؤ تمہارے بغیر دنیا تاریک تاریک نظر آ رہی ہے۔“ اس نے محبت سے اسے اسے فریب کیا تھا۔
 ”صرف ڈائیاگ۔۔۔“ وہ غرائی تھی۔
 ”ڈائیاگ نہیں میری محبت ہے تمہیں کیا معلوم مجھے ہے۔۔۔“

”پلیز ارسل۔۔۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹی تھی۔ ”میں تمہاری اس لٹاغی سے تیز آرا چکی ہوں۔ میری ذرا سی خوشی ذرا سی خوشی تو پوری کر نہیں سکتے پھر کہتے ہو محبت ہے۔ اسے کہتے ہیں محبت۔“ وہ کھنکی سے دور جا بیٹھی تھی۔
 ”تم محبت کو مادی چیزوں میں تو لیتی ہو۔ کتنی بھگانہ سوچ ہے تمہاری۔ بہر حال اب موڈ ٹھیک کرو آگس کریم مکمل کر دی ہے جاؤ کسی چیز میں پلٹ کر لاؤ۔“
 ”میں نہیں کھا رہی۔۔۔ خود کھا لو۔“ اس کا غصہ اترا

نہیں تھا۔

”سوچ لو میں خود بھی نہیں کھاؤں گا، پھینک دوں گا اسے۔“ وہ اٹھا تھا۔

”جب دیکھو اپنی ہی کرتے ہو، میں صبح کھالوں گی تم ابھی کھالو۔“ وہ اس کے ہاتھ سے پکٹ لیتے ہوئے بولی۔

”نہیں کھائیں گے تو ساتھ ہی۔“ اس نے واپس بیٹھتے ہوئے کہا تو اسے مجبوراً کچن کا رخ کرنا پڑا۔ وہ اس کی ضد سے واقف تھی۔

”جہیں پوری دنیا میں میرے جیسا شوہر نہیں مل سکتا، اتنی محبت کرنے والا اتنا کیئرنگ۔“ وہ اس کا غصہ اتر جانے کے بعد جھٹل چیتے کرتے ہوئے بولا تو وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”اتنا جلاتے جو وہ.....“

”خدا گواہ ہے میری کوئی کوشش نہیں ہوتی، جہیں ذرا ذرا سی بات دل پر لے لینے کی عادت ہے اسے تبدیل کر دینے میں صرف اپنی تجبوری تباہی تھی اور تم نے بات کا افسانہ بنا ڈالا حالانکہ شادی میں ابھی ایک ہفتہ پڑا ہے، گفت سے لیے میں تمہیں رقم لائی دیتا مگر تم سے برداشت کہاں ہوتا ہے، صبر کا مادہ ہی نہیں ہے۔“

”یہ بات تم اب کہہ رہے ہو اس وقت بھی کہہ سکتے تھے مگر تمہیں عادت ہے مجھے جلانے اور ستانے کی۔“ کئی گھنٹوں کی صبح کے بعد ایک بار پھر ان کی تو تو میں میں شروع ہو چکی تھی۔

”مازی! سنا ہے عورت اس وقت چڑچڑی ہوتی ہے جب اس کی عمر بڑھ جاتی ہے سچ بتاؤ تمہارے ساتھ بھی کہیں ایسا ہی کوئی معاملہ تو نہیں۔“ وہ شرارت سے ہنسا تھا۔

”تم سے پورے آٹھ سال چھوٹی ہوں، اگر میری عمر بڑھے گی تو تم مجھ سے پہلے بڑھے میاں کہلاؤ گے۔“ اس نے غصے میں کشن اس کی طرف اچھالا تھا۔

”سنا ہے عورت جلدی بوڑھی ہوتی ہے۔“ وہ

چھیڑنے سے باز نہیں آیا تھا۔

”ہاں! نہیں تمہارے جیسے شوہر مل جاتے ہیں۔“ وہ دودھ دبوٹی تھی۔

”مجال ہے کبھی لا جواب ہو جاؤ، کتنی تیز ہو تم! میں تمہیں معصوم سیدھی اور نجانے کیا کیا سمجھ بیٹھا تھا۔“ وہ شادی سے پہلے کا حوالہ دے رہا تھا۔

”تو لے آتے کسی اور نیک پروین کو۔“ اس نے ہاتھ جھٹکا تھا۔

”لے تو آتے لیکن ہمیں ایک پری چہرہ بھاگی تھی اور اس کے سحر نے نکلنے نہیں دیا۔“ وہ شوخی سے اسے قریب کرتے ہوئے بولا تو اس کی شرارت پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ درآئی جو کہ صلح کی علامت تھی۔

”مگر ایک سوٹ پر سات ہزار خرچ کر دینا کہاں کی فطنت دی ہے۔ ہم سوٹ کتنی بار پہن سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ تین چار یا پانچ بار اس سے زیادہ تو وہ استعمال نہیں ہو سکتا اور پھر تقریبات میں پہننے والے کپڑے میں مگر میں استعمال نہیں ہوتے اس کے باوجود اس نے اب خرید لیا۔“ مازیہ اپنی بڑی بہن ناچہ کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی خریداری دکھائی تو اس کی آنکھیں چیزیں اور پھر رقم سن کر پھٹ گئیں۔

”نہیں آئی کم از کم ایک سوٹ پر اتنا خرچ نہیں کر سکتی۔“ اس کی آفر پر اس نے فوراً انکار کیا تھا۔

”اگر تم افروڈ کرنے سے گھبراری ہو تو پھر میں تمہیں گفت کر دیتی ہوں، نو پر اہلم۔“ وہ مطمئن انداز میں بولیں۔

”نہیں..... نہیں یہ بات نہیں ہے دراصل ایک سوشل بیک گراؤنڈ ہے ملنا ملنا ہوتا ہے پارٹیز، انڈنڈر ہوتی ہے میں تو خاندانی تقریبات کے علاوہ کہیں جاتی بھی نہیں ہوں۔ میں کیا کروں گی اتنا مہنگا سوٹ لے کر۔“ اس نے نرمی کے ساتھ انکار کیا۔

”پھر بھی میرا اپنا خیال تو یہی ہے چیز ایسی ہال

”بولو..... سن رہا ہوں۔“

”ارسل! سب گھومنے جاتے ہیں ڈوہلی تو مڑتا ہے
ہیں ایک ہم ہیں شادی کے بعد سے اب تک کہیں نہیں
گئے۔ راضیہ کو دیکھو شادی کے دوسرے ہی مہینے
سوئزر لینڈ چل گئی تھی اور ہمیں مری بھی نصیب نہیں
ہوا۔“ وہ اس کے بازو سے لگتے ہوئے فرمائش کر رہی
تھی۔

”اتنا ہی گھومنے کا شوق تھا تو کسی پائلٹ سے شادی
کر لیتیں میں اپنی انکم میں اتنا ہی اضافہ کر سکتا ہوں جس
حساب سے چل رہا ہوں۔“ حسب توقع وہ ہنجر کا اٹھا
تھا۔

”کتے کتے کواں بوتہ۔“ تو مڑیں گڑ جیسی بات ہی
کر دیتے۔ کسی کا دل ہی رکھ لیتے ہیں۔“ وہ اسے
گھورتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمہارے دل کے چکر میں میرا بل بوھتا جا رہا
ہے۔“ سوائے فرمائش پر گراموں کے تم عموماً کو اور اتنا
ہی کیا ہے۔“

”اور تم مردوں کو اپنے پر گراموں پر پانی پھیرنے
کے علاوہ اور کیا آتا ہے۔ جب دیکھو..... گھر سے باہر
دستوں میں قہقہے لگتے ہیں۔ گھر آتے ہی منہ بن جاتا
ہے کف پینے لگتا ہے غصہ سوار ہو جاتا ہے۔“ وہ بولی تو
چیز بولی پٹی کی۔

”شٹ اپ..... مجھے سونے دو اور جب ہو کر خود
بھی سو جاؤ۔“ اس نے منہ میں یکے میں پر دھکے کھا تو وہ
اٹھ کر دھڑلے دروازہ بند کر لی باہر آ گئی۔

”یہ زندگی ہے اس زندگی کے خواب لڑکیاں
آ نکھوں میں سما جاتی ہیں شادی کے بعد یہ ہوگا..... وہ
ہوگا کہہ سکتی بھی نہیں ہوتا سوائے نیشنل کے۔“ اس نے
سر جھٹکتے ہوئے ہیڈروم کے دروازے کو گھورا تھا جیسے
وہاں اس کڑا ہوا درلی دی آن کر کے بیٹھ گئی۔ دو گھنٹے
گزرنے نہ پائے تھے کہ ارسل جھومتا ہوا کھڑک چلا آیا۔
”چلوں بار بار ایک تک تم اپنی آنکھیں پھوڑ رہی ہو“

بندر کراوے۔“ اس نے بڑھ کر ٹی دی آنکھ کیا تھا۔
”تم سو جاتے نہیں تو سخت نیندا رہی تھی۔ اس
بازو چھڑا اور دوہٹ کر بیٹھی تھی۔

”تمہیں معلوم ہے تمہارے بغیر مجھے سانس ہی
نہیں آتی۔“ وہ اسے مناتے ہوئے بولا۔
”ہا..... صرف ڈائلاگ۔“ اس نے مذاق اڑایا تھا
جل کر۔

”مازی! مجھے تم سے کچی محبت ہے۔“ وہ ناراض
ہوا۔
”جیسی دو گھنٹے بعد آ رہے ہو۔ اسی وقت نہیں
متا کھتے تھے۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں نے سوچا یہ تو روز کا ناٹک ہے۔“ وہ ہنستا تھا۔
”کیا..... یہ ناٹک ہے۔“ اس نے شک سے کٹ
اس کو دے مارا تو وہ بے اختیار ہنس دیا۔

”آئی لو یو بار بار اٹھو تھی۔“ اس کے محبت بھرت
اصرار پر اس کا مڈو ٹھیک ہو چلا تھا۔ ابھی کہہ دیر پہلے وہ
ایک دوسرے سے بے زار ہو رہے تھے اور اب پھر ان
کے دل محبت سے لبریز ہو چکے تھے۔ ملکی چوکی بھی لوگ
جھونک زندگی کا حصہ ہے اس کی خوب صورتی ہے۔
مازی نے لہجہ کو ہموار کیا تھا۔

96969696

ارسل کو پرومٹ کر کے ہیڈ آف بیج دیو گیا تھا۔ وہ
اپنی پروموشن سے خوش تھا اور نئے آفس کے ساحل سے
بہجی۔

”میں عیناً تو کہیں سے بھی باس کی بیٹی نہیں لگتیں
اتنی خوش اخلاقی اور نرمی سے بات کرتی ہیں کہ یوں لگتا
ہے پھول چھڑ رہے ہوں۔“

”دو چار میرے لیے بھی لے آیا کرو۔“ مازی نے
کھانا سیٹ گرتے ہوئے سرسری کہا۔
”دیا۔“ ارسل حیران ہوا اس کے کھنکھوں پر۔
”وہا..... پھول۔“ وہ جھپٹے ہوئے بولی۔
”تم نے ابھی انہیں دیکھا نہیں ہے۔ دیکھو تو

جلس ہو جاؤ۔ انتہائی حسین اور پر فیکٹ۔“

”ہاں میں ٹھیک تھا شہر کی نزدیک کی نظر کم زور
اور دور کی تیز ہو کر تھی ہے جیسی تو گھر کی مرغی وال برابر
نظر آتی ہے۔“

”ابھی نہیں ہے، مجھ سے پوچھو تم سے حسین کوئی اور
نہیں۔“ ارسل فوراً دوا ٹانگ ہوا۔
”اچھا..... تجھ کوئی دیر پہلے تو سمجھنا تھیں۔“ وہ طنز
سے مسکرائی۔

”وہ تو باس ہیں تمہارا ان کا کیا مطلب.....“
”ارسل! میں کچھ دن رہنے کے لیے آئی کی طرف
جاؤں گی۔“ اس کا فرمائش پر گرام شروع ہوا۔

”کیوں..... ابھی دو ہفتے پہلے ہی تو تم کہیں تھی۔“
وہ شک سے برسم ہوا۔
”تو..... دو ہفتے ملا کر چورہ دوں ہو جاتے ہیں کیا یہ
کم ہیں۔“ وہ انٹاس پر چلائی تھی۔

”تمہارے جانے سے مجھے پریشان ہو جاتی ہے۔
کم از کم اس کا تو خیال کیا کرو۔“ ارسل نے نرمی سے
اسے منانا چاہا۔

”تم دیریں آ جایا کرو ناں۔“ مازی نے مشورہ دیا۔
”نہیں..... میں بار بار سہ سال کے چکر پسند نہیں
ہیں۔“

”مرضی سے تمہاری..... میں نے پیٹنگ کر لی ہے
تم مجھے آس جاتے ہوئے صبح چھوڑ دو گے۔“ اس نے
کنکھ سے چکاتے ہوئے بات ختم کی۔

”مازی..... مت جاؤ یا تمہارے بغیر گھر سونا
سونا محسوس ہوتا ہے اور پھر تینوں نام ہوں کے بد مزہ
کھانے کھا پڑتے ہیں۔“

”تمہیں میرا نہیں کھانوں کا غم ستا رہا ہے۔ بازار
کے کھانے ہضم نہیں ہوتے تمہیں فضول ضد نہ کرو وہیں
آ جایا کرو۔“ کہنے کو مازی نے کہہ دیا تھا کہ ارسل ان
تین دھڑوں کے دوران ایک بار بھی اس سے ملے ہاں
نہیں آیا۔

”حیرت ہے اس بار ارسل بھائی ایک بار بھی ملے
نہیں آئے۔“ وردہ نے قہج کا اظہار کیا۔
”بڑی ہوں گے اپنے کاموں میں۔“ مازی نے
دل بہلایا تھا۔

”بڑی تو وہ یقیناً ہیں مگر کاموں میں نہیں بلکہ گفتگو
میں۔“ وہ کھنکھائی۔
”کیا مطلب؟“ مازی حیران ہوئی۔

”وہ دوا میں طرف دیکھیں ارسل بھائی کسی کے
ساتھ چکر کر رہے ہیں۔ میں لے کر آتی ہوں۔“ وردہ
انگلی کی دوہرت کی زیادتی کے باعث ایک ٹک ارسل
کو پھینک دی گئی۔ وردہ وہاں جا کر ارسل کو سر پرانزوے
کچی کی اور اشارے سے اسے بھی وہاں آئے کا کہہ رہی
تھی۔ وہ بے دلی سے برس اٹھا کر طرف آئی تھی۔

”چنگ کاٹن کے کڑے والے سوٹ میں تراشیدہ
بالوں کو شولڈر پر بٹھیرے وہ بے حد نازک و خوب
صورت تھی۔ اس کے چمکے نقوش اور بے تماشا خوب
صورتی نے لہجہ کو مازی کو اسے توجہ دے دیکھنے پر مجبور کر
ڈالا۔

”ہم یہاں شاپنگ کرنے آئے تھے سو جانچ
کر تے چلیں وگرنہ یہ ہی نہیں چلتا آج کل آپ کی
مصروفیات کیا ہیں؟“ وردہ کھنکھ مذاق کر رہی تھی مگر اس
کے لفظوں پر ارسل کڑ بکا۔

”ہم تو فورٹ ٹائم یہاں آئے ہیں۔“
”میرے ہی کہنے پر ارسل یہاں آئے ہیں انہیں
کہیں لے جانے کے لیے بہت اصرار کرنا پڑتا ہے۔“
وہ کہہ رہی تھی۔

”آپ کی تعریف۔“ وردہ نے خوش دلی سے
پوچھا۔
”میں شرازی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں شریک ہوں مجھے
خوش ہوئی۔“ وہ کہہ رہی تھی۔
”کیوں نہیں..... ضرور۔“ وردہ کو بیٹھنے کو کہہ مازی

نے معذرت کی تھی۔
 ”بھئی کھنکھن..... ہمیں دیر ہو رہی ہے آپ لوگ بچ کر“
 ”مگر.....“ ارسل نے کہا تھا۔ باا۔ باا۔ باا۔ کے پیچھے تیز سے نظر آ رہے تھے۔ وہ مزید کچھ کہنا نازیہ مگر یہ دیکھ لگاں ڈر کی طرف بڑھ گئی۔
 ”بچ بچہ کبھی سہی.....“ وردہ اس کی طرف سے معذرت کرنی اس کے پیچھے آ گئی۔ وہ دوڑھول کر پیٹھ چٹکی لگی ڈیر پورگ سیٹ سنبھالنے ہی شروع ہو گئی۔
 ”اچھا ہوتا ارسل بھائی کی جب ہوتی ہو جانی اور تم تجسوں لڑکی تو را وہاں سے بھاگ آئیں گئیں خرچہ نہ ہو جائے۔“ وردہ نے منہ نہایا۔
 ”ان کے ساتھ ان کی پاس بھی آجھا نہیں لگتا۔“
 ”میں تو انہیں کو لگ بھی گئی۔ کیا زبردست پاس ہے۔ تم ان سے پہلے بھی مل چکی ہو؟“
 ”ہوں۔“ اس نے سر سر کیا۔ ارسل کو کینا شیرازی کے ساتھ دیکھ کر اس کا دل غم و غصے سے چل رہا تھا۔
 ”وائف سے ملنے کا تم نہیں اور غیروں کے ساتھ بچ اڑائے جا رہے تھے۔ وہ ہنوز سوچوں میں کئی تھی۔ شام میں ارسل اسے لینے آ پہنچا تھا۔ چپ چپ شرمندہ شرمندہ سا۔ وہ بھی کچھ کے بغیر اسے کاموں میں لگی رہی۔ گھر آ کر بھی اس کی خاموشی زندگی تو ارسل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر برابر بٹھالتے ہوئے پوچھا۔
 ”مسلک کیا ہے منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟“
 ”وہم ہے آپ کا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ قدرے اٹھ کھڑے ہوئے لیجے بھی بولی۔
 ”موز کیوں خراب ہے۔ سنو بولو مسکراؤ۔“
 ارسل پیچیدہ ہوئے۔
 ”آپ کی کام بخوبی کر رہے ہیں۔ گھر میں زندگی گھر کے باہر بھی۔“ وہ طنز نہ بولی۔
 ”مجھے پہلے ہی معلوم تھا تمہارا موڈ اسی لیے خراب ہے۔ تم نے مجھے حینا کے ساتھ دیکھا تھا مگر بارہ میری

”جلدی آوازی۔“ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ پھر کھنکھن کر بیٹھا آواز سے آوازیں دینے لگا جو کہ اس کی عادت تھی۔
 ”میرا موز نہیں ہے تم کرو۔“ وہ سرد مہری سے ویس جھکن کی دہلیز پر کھڑی ہو کر بولی گی۔
 ”موز ہونہ ہو یہ ہمارا اصول رہا ہے ایک دوسرے کا ساتھ ضرور دیں گے۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔
 ”ضروری نہیں ہر اصول پر عمل کیا جائے۔“ وہ سبک میں برتن نکلی۔
 ”یہ کام بعد میں کرتی رہتا“ پہلے ناشتہ کر دیا چاہے تھوڑا سا سی کھا دیکھو مجھے دیر ہو رہی ہے اور تمہارے بغیر مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈانٹنگ نیل کے اس لے آیا تھا۔ ناچار اسے بیٹھا پڑا۔
 ”کل تمہیں لانے کے چکر میں بیٹھے امان بلڈرزی فائل مکمل کرنی پڑی تھی۔ اب اٹھو ہی اس کا خیال آجیے آفس جیتے ہی عینا وہ فائل مانگے گی اور.....“
 ”تم فائل کی باتیں آفس تک رکھا کرو۔“ وہ اٹھ کر ہونے لگی تو وہ چوک اٹھا۔
 ”ارسل آج تو بیٹنگ تھی آٹھ بجے پہنچ جانا تھا۔“
 ”تم نے ناشتہ تو کیا نہیں.....“ اسے اٹھ کر کوٹ پہنچنے کے لیے کہہ کر مایہ نے پاؤں دلا دیے۔
 ”ویس ٹینٹیں میں کرلوں گا پیچھے چھوٹے آٹھ تو وہ ہاں جا میں گئے اور وہاں سارے آٹھ زانڈ انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ شوز دیکھ رہا تھا جب موبائل کی بزدلی اس نے پکڑ دیکھ کر کیا۔
 ”پہنچ رہا ہوں..... دراصل میرے ذہن سے بیٹنگ والی بات بالکل نکل چکی گی۔“
 ”ہاں ہاں موا آٹھ تک پیلیز تم سنبھال لینا۔“ دوسری طرف سے حینا نے کہا کیا گیا تھا۔ وہ شکر گزار لیجے بھی بولا۔ ”جیک بوجھنا بیٹا۔“
 ”بھئی حینا“ وہ زیادہ ہی دوستانہ بھائی جانی تیں۔ ”وہ طنز سے اسے دیکھ کر سوچنے لگی۔“ وہ پھر میں

کے ساتھ آسٹریلیا اپنی سسرال چلی گئی ہے۔ میں
تصویریں لاکر دکھاتی ہوں۔ ”وہ کھانے کے کمرے میں
آئی تھی۔ یہاں وہ ارسل کو دکھانے کے لیے لائی تھی مگر
رات کی بدحالی نے یہ موقع آنے ہی نہیں دیا تھا۔
”ابنا! اندھنوں میں تو ساری ہی اچھی آئی ہیں اب
اندھے کے بھی نصیب اچھا رکھے۔“ وہ دعا دے رہی
تھیں۔ ”آمین“ کہتے ہوئے وہ مسکرائی۔

§§§§§

”تمہارے ساتھ وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا“
نوح جھکے ہیں۔ وہاں ڈیڑھ پریشان ہوں گے۔ ”لغینا نے
بل منگوا لیا تھا۔
”ڈنڈی خرابش! آپ نے کی تھی مجھ کا چہرہ کو حکم کی
تقلیل کرنا تھی سو آپ مجھے خطا وارڈیں کہہ سکتیں۔“ ارسل
شوخی سے گویا تھا۔
”کہہ سکتے ہوں سو پورے زندگی میں خوشیوں کے چند
پل بھی بہت جیتی لگتے ہیں۔ اس میں سب سے لیتا چاہتی
ہوں۔ پتہ ہے ارسل بہت عرصہ بعد میں نے یوں جوینا
سکھا ہے۔ تمہاری صورت میں مجھے اچھا انسان اور
دوست ملا ہے دگر تو شیرازی نے مجھے ایسا ہی کر ڈالا
تھا۔“ بلیک ستارہ کی خوب صورت سازشی میں اس کا
نازک سراپا اور قیامت خیز حسن کمال لگ رہا تھا۔ ارسل
نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔

”اگر وہ پاکستان نہیں آتے تو آپ ان کے پاس
نیویارک چلی جاتیں! جہاں تمہیں ہوں وہاں کپور و ماثر
کر لیتا چاہئے۔“
”بہت کیا ہے یہ بھی مگر شاید شیرازی کوئی میری
ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے تین سال سے میں یہاں
ڈیڑے کے ساتھ رہ رہی ہوں اور وہ وہاں اپنے برکس میں
بڑی ہے۔“ وہ کولڈ ڈرنک کے سب لیتے ہوئے بولی۔
”مجھی راپیلے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟“

ارسل نے پوچھا۔
”وہ تین باشر شیرازی نے کال کی تھی مگر میں گھر پر

نہیں تھی۔ وہ سمجھا شاید میں بات نہیں کرنا چاہتی پھر اس
نے کیا کہیں اور میں نے بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ اگر
اسے اپنے برکس سے زیادہ میری ضرورت ہوتی تو وہ
یقیناً آتے اور مگر..... بعض چیزیں انسانوں سے زیادہ
اہم ہوتی ہیں۔“ وہ سوچ انداز میں گویا ہوئی۔
”ہوسکتا ہے ان کے نزدیک آپ کی اہمیت ہو اور وہ
آپ کی پہل کے منتظر ہوں۔“ بھی بھی یہ ہماری اتانم
سے کوئی فیصلہ نہیں کرنا دیتی۔ آپ بھی نہیں اس کا
شک کو تو نہیں ہیں۔“ ارسل نے سمجھا تھا۔

”تمہارے ساتھ شاید میں ان کی طرف سے پہل کی
منتظر ہوں۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی اور اٹھ
کھڑی ہوئی۔ ”بہر حال ان تین سالوں کی دوری نے
مجھے بہت حد تک مطمئن اور برکون کر ڈالا ہے۔ اب
اگر وہ تیرے تو کیا..... ڈنڈی یو بھی دگر سکتی ہے۔
”مگر.....“ عینا! اگر وہ آجائے تو زندگی اس سے
زیادہ بھی دگر سکتی ہے کیوں؟“

”شاید.....“ اس نے نظریں چرائی تھیں اور کار کی
طرف بڑھ گئی۔ ارسل گھر آیا تو پونے دس بج رہے
تھے۔
”کھانا تو تم یقیناً کھا کر آ رہے ہو۔“ مادیہ نے تنگی
سے کہا۔

”تم نے کھایا..... وہ دراصل برکس میٹنگ تھی اور
بعد میں ڈنڈی.....“ مادیہ نے شک کی وجہ سے وہ
جھوٹ بولنے پر مجبور تھا۔
”ہاں! تو کھا آئی جو ان کپا ہے آپ نے“ ہر روز
ڈنڈی برکس میٹنگ ہر روز جی کہانی۔ ”وہ عرصہ سے کہتے
ہوئے کھانا فریج میں رکھنے لگی۔

”اوکم آن یا ڈیسی بات ہے تو میں تمہارے ساتھ
بھی شریک ہو جاتا ہوں۔“ اس نے بڑھ کر اسے سنایا
تھا۔

”ضرورت نہیں ہے اس کی۔“ اس نے ہاتھ جھٹکے
تھے اور اپنا کام کر گئی۔

”مادیہ! تمہیں اتنا غصہ کیوں آنے لگا ہے۔ میں اگر
کام کروں گا تب ہی تمہاری سب خواہشیں آرزو نہیں
پوری ہوں گی۔ تمہارے وہ بے خواب جوتہ دیکھی آئی
ہو ایک ایک کر کے پورے ہوتے جاتیں گے۔ ابھی
ہماری فحش فلمیں ہے چند سال بعد ہماری اولاد وہ سکھ
اٹھائے گی جو ہمارا نصیب نہ بن سکے۔“
”پھر بھی جب سے تم نے نیا آفس جوائن کیا ہے
تمہاری لائن ہی متحج ہو گئی ہے۔ پہلے ہمارے پاس کتنا
وقت ہوا کرتا تھا ایک دوسرے کے لیے اور اب نہ تو تم
ڈیڑی کھانا کھ رہی کھارے ہو اور نہ ہی فرصت ہوتی ہے
تمہیں میرے پاس بیٹھنے کی۔“ اس کی آنکھوں میں
آنسو آگئے تھے۔

”ایسی بات ہے تو آج پوری رات باتیں کرتے
ہیں صبح ویسے بھی چمٹی ہے۔“ اس نے مادیہ کے آنسو
اپنی اپریوں سے صاف کر کے ہونے پر کمر نہایا۔
”بہتے دو باتیں تم نے ابھی پڑکے ہو جانا ہے۔“ وہ
غرائی کی۔

”ایسا ہو نہیں سکتا“ کوئی بھی چیز سے بڑھ کر
نہیں ہے چاہے وہ عزیز ترین بینہ بیاری ہی کیوں نہ
ہو۔“ وہ مگر اپنا تھا۔ مادیہ جانتی ہی وہ بینہ کاس قدر کچا
تھا۔

”میں آکس کر لیتا ہوں تم اسے میں کھانا کر دو
مجھے معلوم ہے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ رات بھر جاگوں گا تو
دوسری بار ڈنڈی کا جالس سکنا ہے۔“ وہ دو گرام بناتے
ہوئے ناپاکار تو مادیہ کا موڈ ٹھیک ہو چلا تھا۔ وہ کھانا سرو
کر رہی تھی جب تل ہوئی۔ ارسل ابھی تک آٹا نہیں تھا
وہ لاچار اس طرف آئی۔

”پہلو..... جی فرمائیے۔“
”ارسل کا موبائل میرے پاس رہ گیا ہے۔ اس
سے کچھ مگر کم کریں صبح آکر لے جائے۔“ عینا
شیرازی کی آواز اور پھر لفظوں نے اسے اپنی جگہ پھر بتا
ڈالا تھا۔

”ارسل کا موبائل.....“ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔
”دراصل جو موبائل اس کے پاس ہے وہ میرا ہے
غلط فہمی کی وجہ سے.....“ وہ عینا نے کیا کیا کہہ رہی تھی
اس کے کان میں سائیں سائیں کرنے لگے تو اس کا مطلب
تھا کہ تو برکس میٹنگ کی اور نہ ہی کوئی برکس بلکہ وہ
از خود عینا کے ساتھ شام گزار کر آیا تھا اور عینا نے یہ سلسلہ
کب سے شروع تھا اور وہ کب سے اس کی آنکھوں
میں دھول جھونک رہا تھا۔

”مروا چاک نہیں بدلتا“ اس کی دلچسپی اپنی عورت
سے کم ہوتی ہے پھر اس کی توجہ کارکن کو اپنی اور تھی بے
اس کے ساتھ رہی تھی..... اسے سرخ کے الفاظ یاد
آئے تو اس کا مطلب ہے ارسل کی دلچسپی کا سامان بھی
عینا شیرازی ہو سکتی تھی۔ اب اگر وہ منہ سے اقرار نہ
کرتے تو اس میں اس کا اپنا بھرم تھا۔ اقرار کر کے یہ بھرم
بھی جاتا رہتا۔ وہ پھر کون سا راستہ اختیار کر لیتی کیا.....
پھوٹا نا اٹھائی آسان ہوتا ہے اور پھر پڑائی جھگڑے ہر
وقت کی نشینیں سب سے کیا دیتی ہے سوائے تلحی کی
کے..... اور اگر اسے سارے اس طرف جاتے ہوں تو
پھر خاموشی کے ساتھ ہی رہا کیوں نہ پناہ پائی جائے کیوں
دنیا کو تھا دکھایا جائے۔ ارسل کی آمد تک وہ عینا نے
کیا کیا سوچ چلی تھی۔ وہ آکس کر لیتا تھا کہ وہاں لے
آیا تھا۔ ”تمہیں تو چاکلیٹ فلور پسن نہیں تھا۔“

مادیہ نے کہا۔ ”تمہیں تو نے نا..... مس کافی ہے
میں جانتا ہوں تم ہمیشہ خوش رہو مسکرائی رہو۔“ اس کی
گر جوتی کے باوجود وہ مسکرائی۔ اسے سب فریب
لگ رہا تھا۔

§§§§§

”بڑے بھائی نے بہت اصرار سے کائنات کی
سالگرہ میں انوائٹ کیا تھا“ صبح اس نے ارسل کو یاد بھی
کرایا تھا اس کے باوجود شام کے پانچ بج رہے تھے اور
اس کا پتہ نہ تھا۔ تنگ آکر اس نے آفس بلائی کیا۔ ”وہ تو
ابھی تھوڑی دیر پہلے نکلے ہیں۔“ ارسل کی ٹوکیگ نے

اطلا دی۔

”کب تک واپسی ہوگی؟“
”آئی ڈونٹ نو۔“

چند لمبے کوفت سے سوچتے ہوئے اس نے فون بند کیا تھا پھر ارسل کے موبائل نمبرز پر مرنائی کیا جو مسلسل آنکھ جارا تھا۔

”کیا ہوا یادی۔۔۔ پھر ارسل بھائی آ رہے ہیں ناں۔“ وردہ نے پیچھے سے کرپو چٹھاتا۔

”نہیں۔۔۔ آفس میں نہیں ہیں۔ حالانکہ یاد بھی کرا تھا مگر۔۔۔“

”چلو خیر ہے آ جائیں گے تم اتنے میرے ساتھ اندھا ہال کرے کی پیٹنگ کر دو۔“ وہ اس کا بازو تھام کر اسے اندر لے آئی تھی۔ ”میں تھا کہ سلسل سوچوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ درہ کر خیال ارسل اور عینا شیرازی کی طرف جا رہا تھا۔ جب سے اس کے شک کو کفایت ملی تھی تب سے اسے ارسل کا اعتبار نہ رہا تھا۔ وہ جی بھی قبول رہا ہوتا تو اسے یہی محسوس ہوتا مجھے وہ اس سے جیسا کہ برہادر ہو کوئی بات چھپا رہا ہو۔ بلا خرد وہ اسے بے تکلف چکا تھا۔ اس وقت تک اس کا داغ انتہائی گرم ہو چکا تھا۔ چند گھنٹے جس خوار و جلن میں گزارے تھے اس نے اس کا داغ خراب کر ڈالا تھا۔“

”سنا نے کا وقت ہے جب تعریف اپنے اختتام کو پہنچتی تو ابھی بھی آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کل آ جاتے مجھے لینے کیوں کر تمہیں تو پارٹی یاد ہی نہیں تھی تمہیں تو آفس یاد رہتا ہے یا پھر میرا شیرازی اور میں کوئی عینا شیرازی تو ہوں نہیں جو اہمیت رکھتی ہو۔“ کھر آ کر وہ ٹھہر گئی تھی۔ اس کی خاموشی جس طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہو رہی تھی کھر آ کر وہ طوفان آچکا تھا۔ وہ چوہلی آتا رہا تا کہ کبھی نہی اور جو منہ آں یا بلوئی رہی۔
”یقین کر لیجئے ہوشیادوں رہا۔ باہر سے ڈیلی کیشن آ گیا تھا سب ایس میں بڑی تھوڑ۔۔۔“

”چلیز ارسل روز ایک ہی بھانہ بناتے ہوئے تم

تھکتے نہیں ہو پھر نہیں ہوتے اور نہ ہی بنزرائین کا میں ان فضول ڈراموں سے تنگ آ چکی ہوں۔۔۔ بہانوں سے بیزار ہو گئی ہوں۔ اگر تم عینا شیرازی کے ساتھ تھے تو کل کر اعتراف کیا کرو بڑوں کی طرف اپنے مکمل چھپا ہوا کر۔“

”کیا بکواس ہے یہ۔۔۔ تم ہوش میں نہیں ہو۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”تمہیں ہوش و خروش بے گانہ کر دیا ہے۔ تم بلا جھجکا بلا دھڑک جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہو۔ اپنے مکمل چھپاتے ہو یا عشق کہ لو سے دنیا کی نظروں کے سامنے لانے سے ڈرتے ہو مگر میں نہیں ڈرتی۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو کہو میں سننے کو تیار ہوں اور اگر کوئی فیصلہ کر بیٹھے ہو تو بتا دو مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ سن سکتی ہوں اور براہ راست بھی کر سکتی ہوں مگر یہ چھپا چھپی کا مکمل بند کر دو۔ میں اس سے سخت نفرت کرتی ہوں۔“ وہ اس کا کوٹ خیموں میں جکڑے اس سے سوال پر سوال کر رہی تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں سے برساتا اضطراب دھت پر اسل کم ہم ہو گیا۔ وہ اسے ہوش و دھواں سے بیگانہ محسوس ہوئی۔

”تم کھلم نہیں ہو۔۔۔ تمہاری طبیعت یقیناً خراب ہے۔ وردہ ٹھیک کر رہی تھی۔“ ارسل نے اسے شانوں سے اٹھاتے ہوئے تشویش سے کہا۔
”اگر میں ٹھیک نہیں ہوں تو اس کے فے وار تم نے مجھے ذہنی طور پر ہمار کر ڈالا ہے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر غصے سے چلائی تھی۔

”ماذیہ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیوں اتنی فضول باتیں کر رہی ہو میں تم سے کیا چاہوں گا سوائے تمہاری محبت کے۔“ وہ منی سے اسے بھجاتے ہوئے بولا۔
”محبت کی؟“ وہ ہمت سے کروٹیں نہ گھومتی ہو چکی ہے اس لفظ سے تم مراد اس لفظ کو خوب استعمال کرتے ہو مگر

انے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔“

”کیا تمہیں میرا اعتبار نہیں۔۔۔“ ارسل بے یقینی سے گویا ہوا۔ ماذیہ خاموش ٹھہر رہی۔

”بتاؤ مجھے۔۔۔ کیا تم مجھ پر اعتبار نہیں کرتیں؟ کیا تمہیں میری محبت جھوٹ لگتی ہے۔“ وہ اس کے بازو تھام کر کمر کاٹا۔ جو باوہ اپنے بازو چھڑا کر بیدروم میں بند ہوئی۔

”اگر تمہیں ہی میری محبت کی ضرورت نہیں میرا اعتبار نہیں تو پھر اتنی محنت آتی جدوجہد میں کس کے لیے کر رہا ہوں کس کے لیے میں دولت جمع کر رہا ہوں؟ جب تم ہی اس لائق سے خوش نہیں تو پھر کیا فائدہ اس خواب کا۔۔۔ اس کو کشش کا اور اس چلن کا جو کل نہیں ملنے والا ہے۔“ وہ ٹانگی کی ناف کو ملے ہوئے کھٹک کر دین کا ڈونچ پر گر سار گیا۔ ماذیہ کے الفاظ نے اس کے اندر اپر پٹائی سی بجائی تھی۔ اس کی اتنی بدگمانی اسے اپنی نظروں میں کر آئی تھی۔

۹۹۹۹۹۹۹۹

صبح جب وہ آفس گیا اس وقت ماذیہ کی کمرے میں بند تھی اس کا خیال تھا بھتا وقت اسے لینے اس کا غصہ خنڈا ہوا تھا جائے گا اس لیے اسے منانے کا خیال ترک کر کے وہ چلا گیا تھا کہ یہ کام وہ شام میں بھی کر سکتا تھا مگر شام میں اس کی غیر موجودگی سے اس کا تھا ٹھنک گیا۔ اس کی بے وقوفی اور جذباتیت پر اسے انتہائی غصہ چڑھا فون کر کے اس نے ماذیہ کو بلا نا چاہا تو اس نے بات تک نہیں کی۔ وردہ معذرت کرتی رہی۔ ارسل نے جمل کر لائن کاٹ کر ڈالی۔ ”میری محبت نے مجھے کم زور نہیں سرچھا ڈالا ہے اب جب تک تم خود نہیں آؤ گی میں بھی لینے نہیں جاؤں گا اور دیکھوں گا یہ زورمہ کب تک چلتا ہے۔“ وہ سکتا رہا اور لپٹے پاؤں کی بنی کی طرح کھر میں پھر ہلا۔ ایسی باتیں کب بھیجی رہتی ہیں جہاں ماذیہ کے گھر والوں کو ان کی عقل کا نظم ہوا وہ اس کی سسرال میں بھی یہ بات بھیل گئی۔ سسر و قار بڑے بیٹے کے گھر سے ارسل کے پاس چلی آئیں۔

”وہ نا مجھ سے تم کیوں نہیں برت رہے؟ اگر کوئی بات ہو گئی ہے تو ختم کر جاؤ گے کر آوے۔“ انہوں نے حکم سننا تھا۔

”نہیں مئی۔۔۔ اس بار وہ خود گئی ہے اس لیے اسے آنا بھی خود ہی پڑے گا غلطی بھی اس کی ہے اس لیے معافی کا حق بھی اس کا بنتا ہے۔“

”انہوں نے یہاں غلطیاں نظر انداز کر دی جاتی ہیں ارسل۔“ انہوں نے یہاں سے بیٹے کو کل کرنا چاہا۔ ”غلطیاں معاف کی جاسکتی ہیں بدگمانی نہیں۔۔۔ میں آپ کے اصرار پر چلا گیا کیا تو وہ نہیں آئے گی۔“

”تم ایک بار سنا کر ڈو بیجو۔“
”میں نے فون کیا تھا اس نے بات تک نہیں کی اور آپ کہتی ہیں میں اسے منا کر دیکھوں۔ مئی جی راہ پر اس نے قدم کھینچے ہیں وہ ہم دونوں کو الگ کر دے گی۔ آپ دیکھنا اس کی بدگمانی کیا رنگ لائے گی۔“ وہ پاؤں پٹختا رہ لگا تھا۔

”انڈن نہ کرے کیسی فضول باتیں کر رہے ہو۔“ وہ پیچھے سے پکارتی ہی رہ گئیں۔ دوسرے دن وہ ماذیہ سے ملنے کھر آئی تھیں۔

”مجھے تم سے اتنی نا سنجھی کی توقع نہیں تھی۔ اگر کوئی بات ہو چکی تھی مئی تو کم از کم مجھ سے نہ کہنا تھا۔ یوں روکھ کر اپنے سینکے آئینہ خانے کے لیے فائدہ مند ہے اس سے نہ تو تمہارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور نہ ہی تمہاری پریشانی کم ہوگی۔“

”آپ کو کبھی معلوم تھا ماہ بہت ہوتے ہیں میں نے بہت کوشش کی ارسل کے جھوٹ کو برداشت کرنے اور اسے نظر انداز کرنے کی فکر۔۔۔ میرا حوصلہ ڈونٹا چلا گیا۔ جب وہ اپنا زیادہ وقت اس عینا شیرازی کے ساتھ گزار کر آتا تھا مجھ سے کہتا کہ برس پیٹنگ می ڈنر تھا یا پھر کوئی اور مصروفیات آپ بتائیں میں کیا یہ سب سیکھ لیں تھا۔ یہ سب پہلی بھی تھا مگر وہ وقت کی پابندی نہ کرتا تھا۔ وقت سے کھر آتا تھا اور چلن اب پر دوشن

چاہئے۔ انسان کی دوست کے ساتھ تو عمر گزار سکتا ہے
طرک کی انجینی کے ساتھ نہیں۔“

”اور آپ کے ڈیڈ کیا کہتے ہیں؟“ ارسل نے
پوچھا۔

”شریازی سے شادی میں میری پسند شامل تھی اس
لیے فیصلہ کی پرکھی نہیں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں
میں نے بد وقت فیصلہ کرنے میں ابھی بھی وقت ضائع
کیا ہے مجھے چند سال پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہئے تھا۔
”آپ مطمئن ہیں اس فیصلے سے۔“ اس نے

پوچھا۔
”ہوں۔۔۔۔۔“ عینا نے سر ہلایا تھا سارے معاملات
کلیئر ہو گئے تھے اس کے اطمینان کے بعد کیا گنجائش
نکلنی تھی۔ وہ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے اسے
سمجھا تھا کہ اس کے اپنے فیصلے اس پر خوش نہیں سکتا تھا۔ وہ
خود بخود گھبراہٹ میں سمجھتا تھا کہ اس کی شادی
”تم خوش ہو اس فیصلے سے؟“ عینا نے ارسل سے

پوچھا۔
”اس فیصلے سے آپ کا مطمئن ہونا ضروری ہے۔
میری رائے غیر اہم ہے یہ آپ کی زندگی کا معاملہ ہے
جسے آپ کو طے کرنا ہے۔“ اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر
جانتا رہا کہ اس کا اظہار کیا۔

”تم سمجھ رہے ہو بات کرتے ہوئے بہت تکلف کرتے
ہو حالانکہ میں تمہیں ایک اچھا دوست سمجھتی ہوں مگر تم
شاید ایسا نہیں سمجھتے۔“ عینا نے نوکا کا ہاتھ
”ایسی بات نہیں ہے۔ آپ صرف دوست نہیں
ہیں۔“ وہ کہتا تھا۔

”پھر۔۔۔۔۔“ ارسل نے نوکا کا ہاتھ
”پھر۔۔۔۔۔“ یہ کہہ رہا تھا۔ اب کوئی گنجائش نہیں رہی
ہمارے رشتہ میں جسے بچانے کی کوشش کی جائے وہ
خوش ہے اپنی دنیا میں اور میرے آنے سے باندھنے
سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ سمجھتے سمجھتے کچھ
میں رک رک کر کہہ رہی تھی۔ شیریازی کے دو ٹوک
جواب نے اسے برت لیا تھا۔ وہ بظاہر مسکرا رہی تھی مگر
اس کی آنکھوں کا اضطراب اور مدد نظر آ رہا تھا۔

”جب اسے ضرورت نہیں ہے تو پھر فیصلہ ہو جاتا
ہو۔“

”پلیز می۔۔۔۔۔“ اب کچھ دنوں کے لیے آپ بھی
خاموشی اختیار کر لیں ہو سکتا ہے ہماری خاموشی سے
”مگر۔۔۔۔۔“

”اگر مگر کچھ نہیں پلیز میں تنگ آ گیا ہوں اس لیے
ہے۔“ عینا نے اقرار نہ کر لیا اور بات سے مگر وہ
ہے۔۔۔۔۔ اور ایک دن وہ از خود اس کا اقرار کر رہی
ہے۔ ”شاید شرمندگی محسوس کرتے ہیں اپنی ہی محبت پر۔“
”ہو سکتا ہے کہ بدگمانی کا شکار ہو۔۔۔۔۔ اور ایسا کچھ نہ
ہو۔“ وہ اس کے سننے سے انکشافات پر دم بخود تھیں۔
ارسل اس حد تک جا سکتا تھا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔
وہ تو ذہنی کے لیے بہت پائل تھا۔ کم از کم وہ اس سے یہ
امید نہیں کر سکتی تھیں۔

”بدگمانی نہیں میں یقین ہے کہ سکتی ہوں یہی سچ
ہے۔“ وہ اپنی بات سے ایک آج پیچھے ہٹ کر تیار نہ تھی۔
وہ سوچ میں ڈھکیں آخر معاملہ کیا ہے۔ رات میں
انہوں نے ارسل سے اس سلسلے میں بات کی تو وہ بکھر
گیا۔

”اگر وہ ایسا سمجھتی ہے تو ایسا ہی سہی پہلے تو نہیں تھا
اب ضرور ہوگا۔“

”اب وہ خوف نہ بنو ذرا صبر سے دل و دماغ سے
سوچو اگر بدگمان ہوئی ہے تو کوئی نہ کوئی اتنا تمہاری
طرف سے بھی ہوئی ہوگی۔“ عینا نے اتنا متفرق یونی
نہیں ہو جاتا۔

”جن کے دماغ چھوئے اور سوچیں بہت ہوں
انہیں متفرق ہونے میں وقت نہیں لگتا۔“ وہ سنی سے بولا۔
”ارسل اس طرح کی باتوں سے معاملات سمجھتے
نہیں ہیں۔“ انہوں نے دھکیں سے بے نیوکیکا۔
”اور جس قسم کی باتیں آپ کی پرورانی کر رہی ہیں
ایسی باتوں سے صلہ ہوتی بھی نہیں ہے۔“ وہ ہنسنے
میں تھا۔

”اسے چھوڑ دو اپنی کہم کوئی جلی کی نہیں سارے
جواسے کہہ رہے ہو۔“

مناسکتا تھا اگر اہل ان کے خول سے نکلتا تو..... مگر جس طرح ازبائی جگہ پر اپنے آپ کو درست تسلیم کر رہی تھی اسی طرح اسلانی جگہ پر اپنے آپ کو درست مانتا تھا۔ ان کے درمیان کے مباحثوں نے عینا اور اس کی دوشی کو مزید بڑھا دیا۔ پہلے وہ عینا کے اصرار پر ملتا تھا اب مازیہ کی غیر موجودگی اور اس کے احساس کو کم کرنے کے لیے اس سے ملنے پر مجبور تھا۔ عورت کی یہ فطرت ہے وہ دھجک کرتے ہوئے صبر و تحمل کا دان یا بھڑ سے پیچڑ بیٹھتی ہے۔ غم و غصے میں اپنا نقصان کرتی ہے۔ اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری کو آنے کا موقع خود زور اہم کرتی ہے۔ حالانکہ جب تک انسان نظروں کے سامنے ہو اس کی اہمیت ہنوز برقرار رہتی ہے۔ وہ نا صرف اہمیت گھٹا دیتی ہے بلکہ چہروں کے نقوش بھی بڑھادی ہیں۔

ازبائی اس کی طرف سے چہل کی منتظرگی گمروہ کو بڑھ چلی تھی۔ گمروہ اپنا حق ادا کر دیا تھا اب اسے ہی بڑھ کر اسے ماننا تھا۔ اپنی جگہ قائم نہ تھی۔

❧❧❧❧

”ارسل سڈنی جا رہا ہے۔“ ناجیہ آپنی نے اسے اطلاع دی تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ چائے کے سپ لیتی رہی نہ حیرت کا اظہار کیا اور نہ ہی غم و غصے کا۔

”سہمیں حیرانی نہیں ہوئی۔“ انہوں نے اسے ٹوکا۔
 ”نہیں..... دوون پہلے سو نیا کا فون آیا تھا اس نے
 بتاتا تھا۔“

”پھر بھی تم سکون سے بیٹھی ہو۔ اگر وہ چلا گیا تو دو سال بعد آئے گا اور پھر ناراض ہو کر جانا تعلق توڑنے“ ختم کر دینے کے برابر ہوتا ہے۔ کم از کم یہ تو سوچا بیانا نہ سہی اپنے آنے والے بچے کے لیے تمہیں کچھ دماڑ کرنا چاہئے؟“

”صرف میں ہی کیوں کپڑا کر دوں..... وہ غلط ہو کر مجھ اپنی جگہ ڈٹا ہوا ہے اور میں درست ہو کر بھی خطا وار قرار دی جا رہی ہوں۔ کہاں کا انصاف ہے؟“

”اس لیے کہ گھر بنانے کے لیے عورت کو ہی جھٹکانا
 اور کچرہ و زائچہ کرنا پڑتا ہے تم شاید اس کے بغیر دہلی کی
 آئندہ کا سوچ بچ تمہارا پچھوئے مجھنے کے قابل ہوگا
 تو اسے یقیناً رسل کی ضرورت محسوس ہوگی کیا تم اور رسل
 کی طرح اپنی زندگی میں کسی اور کو شل کر سکو گے؟“
 ”میرے لیے ایک ہی شادی کا تجربہ کافی ہے۔
 میں اپنے بچے کے سہارے زندگی گزار سکتی ہوں مگر اس
 شخص کے ساتھ کسی طرح رہ لوں جو میرے من پر میری
 محبت کے قصیدے پڑھتا ہو اور باہر خانے کی کس کس سے
 ملتا ہو۔“

”ماذہ ہو سکتا ہے ارسل کے سلسلے میں ہمیں غلط فہمی ہو گئی ہو۔“ انہوں نے اسے سمجھانا چاہا۔

”غلط فہمی ہوئی تو وہ اب تک آ کر مجھے لے جاتا مگر وہ ایک بار بھی نہیں آیا حتیٰ کہ ابو کے بلانے پر بھی اس نے سہاں قدم نہیں رکھے۔“

”نہک ہے وہ نہیں آیا تو تم چل جاؤ اس نے تو تمہیں نہیں نکالا تھا تم از خود وہاں سے آئی تھیں۔ تمہیں

یہ قدم خود اٹھانا چاہئے۔
 ”آئی آپ بھی..... آپ بھی یہ کہہ رہی ہیں۔“
 رقیقہ اودھک سے بولی تھی۔

”ہاں..... اس لیے کہ عورت اپنی سبک پر رہ کر اپنے حقوق کی جنگ جیت سکتی ہے۔ اپنی جگہ چھوڑ کر نا صرف وہ بے مول ہوئی ہے بلکہ بے کنارہ بھی اور تمہاری کوئی طاقت تمہارے لیے اتنا نقصان کے باعث نہیں ہوگی جتنا تمہارے آنے والے بچے کے لیے ہوگی۔ مجھے دیکھو عثمان کون سا مجھ سے محبت کرتے ہیں! اپنے بڑے میں مکن دولت بڑھانے میں مجھ سے تو وہ بدست و دینے ہیں اور نہ ہی اپنے بچوں کو کھیریں میں ان کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں۔ اس لیے کہ عورت کوئی اولاد کے لیے جینا بڑھاتا ہے اور جو عورت اپنے لیے جیتی ہے وہ عورت تو ہو سکتی ہے ماں نہیں! ابھی بھی وقت ہے ماذیہ سوچو مجھ کو مسز وقار کا ٹونڈا

تھا انہوں نے اسی ایلو سے بات کی تھی اور ان کا خیال بھی
 یہی ہے کہ کمر کھول چلے جانا چاہئے۔ وہ اس آئین کا ادھر
 بہتر فیصلہ دیتی ہوتا ہے جو برکت اور برکل ہو۔ انہوں
 نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا تو
 دوا نسواں کی آنکھوں سے نکل کر گلاں پر پڑ پڑے۔
 جس شخص نے اس ایک ماہ کے عرصے میں پلٹ کر پوچھا
 نہیں تھا ایک نون کا ایک ٹک نہیں کی بھی اب دوبارہ اس
 کے پاس جانا اس کی صورت دیکھنا ایسا ہی تھا کہ گھر سے
 بازار کے سامنے بندہ رسوا ہو جائے۔ اس کے متغ
 کرنے کے باوجود مقررہ قدر نے اپنی کوکشیں چھوٹی
 نہیں کیں۔ یہی وجہ تھی کہ آج ایک مہینے بعد مادی
 دوبارہ ان کے ساتھ ان کے گھر پہنچی۔ اس وقت جب گھر
 لوٹا تو گھر میں ہوتی چھیل چھیل کر دھڑکنا دونوں نہیں اور
 بھائی بھائی بھائی بھائی سمیت آئے ہوئے تھے۔

”ارے آج کوئی خاص تقریب ہے یا.....؟“ اس کی نظر ماڈیہ پر نہیں پڑی تھی۔

”خاص الخاص دن ہے بھئی..... دیواری جی دوبارہ
گھر آگئی ہیں۔“ بڑی بھابھی نے لگاؤٹ بھرے لہجے

میں کہہ کر اسے چونکا دیا تھا۔ مازیہ پر نظر پڑتے ہی جہاں خوشنوا کی کا احساس جاگتا تھا وہیں اس کی وجہ سے ہونے والی جگہ ہنسائی پر اس کے اعصاب تنے تھے کہ وہ مڑ کر کسی کی طرف بڑھ گیا۔

بھائی میں اس شخص کریں گے جو بھائی کو اور زیادہ شرمندگی ہوگی پلیر یا ختم کر سناں دیکھیں تو وہ گفتگو کر دے ہوگی ہیں۔" او بیوہ میں چلی آئی۔

"اس کی ذمہ داری ہے اور خود ہے۔" اس نے مختصر بھرنے لیں لیکن کوئی اتار نہ ہوئے کیا۔

"پلیر بھائی ناں اسی پلیر میں ختم کر سناں جس طرح بھائی واپس آ گیا وہ اسے پتہ چلی آئی تھی ختم کر کے زندگی کی دیوار سے شروعات کریں۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا تھا۔ اور چنے کے ساتھ جب وہ باہر آؤا تک باہر چھوڑے اسے گیا۔" طرح طرح

کی باتیں، یہ مذاق، تھے ان سب کے درمیان اسے اپنا دودھ پینا ہی خیر امر لگا۔ وہ عیالی الذہنی کے ساتھ سمجھ و مدار کے ساتھ فکر کر سکتا تھا جسے عیسیٰ بنی مندوں نے اسے شرمندگی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا مگر بڑی باہمی کی عادت ان سے مختلف تھی۔ وہ ہر قدم پر اسے اس کی عقلی اور شرمندگی کے گھر پر اور احساس کو رابری تحسین۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ارسل کے اندر جانے پر بھی وہ ہنس کر کہہ رہی تھیں، ”گلتا ہے دیور، جی کا غصہ اترا نہیں ہے۔“ اور اب اس کی وابستگی پر وہ ذایہ کو چھیڑ رہی تھیں۔ ”ماذیہ تو گلتا ہے بے چارہ بولنا سنی بھول گئی ہے۔“

”اسی کو توئی بات نہیں ہے بھائی بیٹے بیٹے تھک گئی ہوں گی۔ جا میں آپ کو جو ریٹ کر لیں۔“ سونیا نے اس کی مشکل آسان کی تھی۔ کرے میں آ کر اسے اپنے اکیلے پن اور تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے واپس آ کر غلطی کی ہو۔ اس کی اجمہیت نے اسے بھٹس پہنچائی تھی۔ وہ کپڑے بدلنے لگے ہوئے باقاعدہ رو رہی تھی۔

✻ ✻ ✻ ✻

ہونا تو چاہئے تھا کہ وہ اس گہنی کو تو اسلخت بات کر دیتا مگر اس کے آنے کے بعد بھی اس کا اچھی رویہ سے بچو کے لگا رہا تھا۔ اس کی اجنبیت اسے شرمسار کر رہی تھی۔ وہ بات کرنا تو درکنار اس سے الگ ہونے پر سو رہا تھا۔ مگر وہ قدر نے اسے طور پر جینے کو بہت سکھا یا اور یہ تین کی سن ہو چا تھی میں کہ جانے سے پہلے یہاں کے روئے ٹھیک ہو جائیں۔ ان کے درمیان کوئی گمان دور ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ کچھ روز کے اپنے اپنی بڑی بہو کے پاس چلی گئی تھیں تاکہ ان کی موجودگی میں وہ جھجک کا شکار نہ ہوں مگر ان کے چلے جانے سے فائدہ اُترتا ہی نہ تھا۔ کھار ہوئی تھی۔ اسلخت باتیں سو رہا تھا۔ ان کا دور یہی گھر کو لونا وہ ایک بار پھر نیشن کا شکار ہوئی جارہی تھی۔ وہ افس میں تھا جب

”تم اگر جاؤ تو اس رشتے کے سلسلے میں مادیہ کو اعتماد میں لے سکتے ہو مگر میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جو لوگ محبت کرتے ہیں وہ بڑے خوشخوش اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ مادیہ کو سکتا ہے اسے ایک نکتہ نہ کرے اور پھر اسے نہ مکی بنایا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ تم نے دو سال سنڈی میں دیکھے بھی گئے اُس نے اسے اور ہوسکتا ہے بعد میں تم ہیں سب مل جو اوتو اسے کی گھر ہو سکتی ہے۔ دیکھو ہمارے سرکل میں اتنے لوگ ہیں کہ ان میں چوکی کرنا مشکل ہے مگر مجھے کسی امیر دولت مند سے شادی نہیں کرنی بلکہ اچھے انسان اور دوست سے کرنی اس لیے میں نے بہت سوچنے کے بعد تمہارا انتخاب کیا ہے حالانکہ تم آل ریزی کی طرف سے اور تم سے بہتر لوگ بھول سکتے ہیں مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے بہتر لوگ تو کتنے ہیں مگر اچھا دوست نہیں۔“ عینا نے اسے ایسے سوز پر لاکھڑا کیا تھا کہ وہ اسے آپ کو ہر طرف سے بے بس پار تھا۔ عینا نا صرف سین میں بھی جھپٹتی تھی بلکہ اس کی ناک میں بھی بغیر ہاتھ ملائے وہ تمام عمر گزارا تھا۔ ایک ہی میں تمام خواہشیں اور راز بھی جھپٹتی ہوئی ہو جاتی تھیں گھر کہتے ہیں جھپٹ اور راز بھی جھپٹتے نہیں ہیں اگر وہ عادی طور پر اس بات کو چھپا بھی لے تو کبھی نہ مکی تو یہ راز افشا ہوتا تھا اور پھر دوسری شادی کے بعد وہ بھی ہوئی زندگی گزرتا تھا صرف مادیہ کی مسرت نہ ہوتی بلکہ اسے عینا کی طرف بھی دیکھنا پڑتا۔

”میں یہ براہم“ ارسل کو سب مل سوجھ میں گھر آدیکھ کر مادیہ کی کنگ سے کہنے لگی۔

”تھنک“ سوجھ رہا تھا اگر اپنا پریس ہو تو انسان کو یوں خوار نہ اٹھائی پڑے۔“ اس نے مادیہ سے نظریں چرائی تھیں۔ اتنے دنوں بعد اگر کربا تو ان دونوں کے مابین تعلقات ہووارہوئے تھے۔ یہ بات ایسی چنگاری تھی کہ اگر مادیہ کو یہ چل جاتی تو ان کے تعلقات میں ایک بار پھر آگ لگ جاتی اور شاید سب کچھ ختم ہو جاتا۔

”تم اگر جاؤ تو اس رشتے کے سلسلے میں مادیہ کو اعتماد میں لے سکتے ہو مگر میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جو لوگ محبت کرتے ہیں وہ بڑے خوشخوش اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔ مادیہ کو سکتا ہے اسے ایک نکتہ نہ کرے اور پھر اسے نہ مکی بنایا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ تم نے دو سال سنڈی میں دیکھے بھی گئے اُس نے اسے اور ہوسکتا ہے بعد میں تم ہیں سب مل جو اوتو اسے کی گھر ہو سکتی ہے۔ دیکھو ہمارے سرکل میں اتنے لوگ ہیں کہ ان میں چوکی کرنا مشکل ہے مگر مجھے کسی امیر دولت مند سے شادی نہیں کرنی بلکہ اچھے انسان اور دوست سے کرنی اس لیے میں نے بہت سوچنے کے بعد تمہارا انتخاب کیا ہے حالانکہ تم آل ریزی کی طرف سے اور تم سے بہتر لوگ بھول سکتے ہیں مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے بہتر لوگ تو کتنے ہیں مگر اچھا دوست نہیں۔“ عینا نے اسے ایسے سوز پر لاکھڑا کیا تھا کہ وہ اسے آپ کو ہر طرف سے بے بس پار تھا۔ عینا نا صرف سین میں بھی جھپٹتی تھی بلکہ اس کی ناک میں بھی بغیر ہاتھ ملائے وہ تمام عمر گزارا تھا۔ ایک ہی میں تمام خواہشیں اور راز بھی جھپٹتی ہوئی ہو جاتی تھیں گھر کہتے ہیں جھپٹ اور راز بھی جھپٹتے نہیں ہیں اگر وہ عادی طور پر اس بات کو چھپا بھی لے تو کبھی نہ مکی تو یہ راز افشا ہوتا تھا اور پھر دوسری شادی کے بعد وہ بھی ہوئی زندگی گزرتا تھا صرف مادیہ کی مسرت نہ ہوتی بلکہ اسے عینا کی طرف بھی دیکھنا پڑتا۔

”میں یہ براہم“ ارسل کو سب مل سوجھ میں گھر آدیکھ کر مادیہ کی کنگ سے کہنے لگی۔

”تھنک“ سوجھ رہا تھا اگر اپنا پریس ہو تو انسان کو یوں خوار نہ اٹھائی پڑے۔“ اس نے مادیہ سے نظریں چرائی تھیں۔ اتنے دنوں بعد اگر کربا تو ان دونوں کے مابین تعلقات ہووارہوئے تھے۔ یہ بات ایسی چنگاری تھی کہ اگر مادیہ کو یہ چل جاتی تو ان کے تعلقات میں ایک بار پھر آگ لگ جاتی اور شاید سب کچھ ختم ہو جاتا۔

مجھے تو اتنی بڑی خوشی ملی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا بتاؤں آج میں بہت خوش ہوں۔“ وہ ہنس رہا تھا قہقہے لگا رہا تھا۔ مسز داس کی سرست سمجھ رہی تھیں۔ انہوں نے فون نائیکو سے دیا۔

”پہنچ گئے ہیں ناں؟“ مادیہ نے کہا۔

”ہاں..... بالکل اور تمہیں بہت مس کرتا ہوں۔ پہلی فرسٹ میں مجھے بی بی کی تصویریں بھجواؤ اور اپنی بھی آئی کر لیں لو۔“ اس کے نظروں پر مادیہ کا چہرہ ہلکا ہو گیا۔

”ارسل..... تم سب آؤ گے؟“

”جلدی..... اپنا خیال رکھنا خوش رہنا۔“ وہ تاکید کر رہا تھا اسے بھلا رہا تھا ورنہ ابھی تو جانے میں ڈیڑھ سال باقی تھا۔

”بہت خوش نظر آ رہے ہو کس کا فون تھا؟“ وہ فون رکھ کر پلٹا عینا کافی لے لے پائی۔

”پاکستان سے مکی کا فون تھا۔“ وہ بولنے بولتے رہا۔

”وہاں سب خیریت ہے نا۔“ وہ اس کے قریب ہی آ بیٹھی تھی۔

”ہاں..... دراصل بیٹا ہوا ہے۔“ وہ لوگوں کی کیفیت میں بولا۔

”کس کا؟“ عینا نے پوچھا۔

”میرا“ اس نے کہتے کہتے عینا کے تاثرات جانے چاہے جہاں جہاں کے ساتھ مسرت بھی تھی۔

”اوہ رینک..... تم بالکل ناں نہیں ہواؤنی دیر سے آ میں بائیں کر رہے ہو ڈائریکٹ نہیں جانتے تھے کہ تمہارا بیٹا ہوا ہے۔“ کس پر اسے اور کیا ہے؟

”صحیح مند ہے اور ظاہر ہے اچھا ہی ہوگا۔“ عتیقہ بی بی کی تصویریں بھجواؤ جس کی تو دیکھنا۔

”انہی اچھی خبر پر پانی ڈیو بہہ پڑے۔“ کیوں؟ آج رات ڈنر ہو جائے۔

”شیوور.....“ وہ ہنستا تھا۔

”تم سوجھ رہے تھے کہ شاید مجھے اس خبر سے خوشی نہیں ہوگی یا میں طبیسی کیل کروں ہے ناں۔“ وہ اس کی سوجھ پوچھ لایا کرتی تھی۔

”یہ تمہیں نہیں ہے میں سوجھ رہا تھا کہ ہم آئندہ جس رشتے میں بندھے والے ہیں شاید تمہیں اس کے حوالے سے یہ خراج بھی نہ لگے۔“

”ہم دوست پہلے ہیں یہ یاد رکھنا۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔ تمہارے پر اہم میرے پر اہم ہیں۔“

”عینا..... تم بہت اچھی ہو اور مادیہ سے مختلف بھی۔“

”ہاں فیس بابائی نیچر۔“

”دونوں ہی..... پہلے میں یہ فیصلہ کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ اب اتنے عرصے میں میرا دل کہتا ہے تمہارے بارے میں میرا فیصلہ یقیناً پوزیٹو ہوگا۔“

”اوہ تھنک پورسل۔“ عینا فیصلہ کرنے میں دقت ضرور ہوئی ہوگی مگر جب تمہارے آفس شفٹ ہوئے تھے تب تم سے فرسٹ ملاقات میں میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تم اچھے دوست اور لائف پارٹنر ہو سکتے ہو اس وقت خیر بازی سے ڈائریکٹ لینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر مجھے اس سے بات کر کے احساس ہوا کہ میں خواہ خواہ اپنا وقت پر بار کر رہی تھی۔ اس شخص کو میری ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے مکی نہیں سوجھا تھا کہ میری زندگی میں شیڈ کی کے علاوہ مکی کوئی اور سکتا ہے اور وہ..... کوئی شخص اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کے تمام ڈھنگ ہی سمجھ جائیں۔“ اس نے مسکرا کر ارسل کی طرف دیکھا تھا۔

”تم مجھے ایسی باتیں کر کے ضرور مغرور کر دو گی۔“

ارسل نے اسے چھیڑا۔

”مغرور کیا کہ یہ نہیں مگر تم اچھے لک ضرور ہو سکتے ہو پوچھ میں کیا کیا رہے ہو۔“ اس نے بکس سے آتی خوشبو کی طرف ہی توجہ کرانی تھی۔

(آخری قسط)

میری نفرت میں

اقبال صغیر احمد

فرت نے جھلپا آ نکھیں بھیگ گئیں
جذبول کی ہر ایک کہانی یاد آئی
اتنا پیار بھی خود پر بھاری ہوتا
اب سنبھلے تو ہر نادانی یاد آئی

”اس نے اس وقت میرا ساتھ دیا جب اپنے بھی منہ چھپا کر بھاگ گئے تھے، میری ہر مشکل پر ہریشانی کو شیئر کیا اور کبھی بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں مشکلات کی ان گھن گھڑیوں میں تنہا ہوں آج تک وہ میرا بازو بنا ہوا ہے میرا حوصلہ میرا سہارا میرا یقین ہے وہ اتنا فرما تیرا ساتھ میرا بیٹا ہوتا بھی تو نہیں وے سکتا تھا جتنا شاہ ویز نے مجھے دیا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح وہ اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے غلابے ملا رہے تھے ایک وقت تھا جب وہ اس کی تعریف و توصیف سے خار کھاتی تھی۔

ان کی شاد ویز پر تو از شوخ سے چڑنی کی لٹکن اب وقت بدل گیا تھا حالات بھی تبدیل ہو چکے تھے۔ سب سے اہم تبدیلی یہ تھی کہ مشعل مشعل نہ رہی تھی۔ اس کا غرور و عظمت اُکڑا اور نخوت سب بدل گیا تھا وہ مرابطہ بدل گئی تھی اس کے احساسات جذبات سب بدل گئے تھے۔

”پاپا کی تعریف سے اسے ایسی ہی خوشی ہو رہی تھی جیسے وہ شاہ ویز کی نہیں اس کی تعریف کر رہے ہوں۔“
”نہیں گزشتہ بیسویں دنوں سے محسوس کر رہا ہوں آپ میں اور شاہ ویز میں کشیدگی چل رہی ہے۔ شاید کسی غلط فہمی کی بناء پر کیا بات ہے یہ میں نہیں جانتا صرف آپ سے ایک ریکوریسٹ ہے میری شاد ویز جیسے بیٹا انسان کو بھی گھوتا مت بھونے والے لوگ بہت کم لوگوں کو دوبارہ مل جاتے ہیں۔ غلطی کسی کی بھی ہو پھل آپ کر لیتا بیٹا یہ چھوٹی مولیٰ ناراضگی از دو راجی رشتوں کا حصہ ہوتی ہیں اگر آپس خواہ تو اہ طول دیا جائے تو کچھ باقی نہیں بچتا۔“



شاہ ویز کو چانک برنس کے کسی مسئلے کے باعث پیرس جانا پڑ گیا اور اس غلطی میں وہ گیا تھا کہ مشعل سے اس کی

کوئی بات نہ ہو یا تھی ادھر مشعل کے شب و روز بدل کر رہ گئے تھے۔ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔ ”حرا“ سے چھوڑنے پر راضی نہ تھیں اور وہ ڈرا بیچ بیچ کر اسے گھر پر بلوا رہا کرتی تھی وہ دو پہران کے سہرا لڑائی شام گھر لوٹی تو حسن بیک صاحب کو اپنا منظر پائی تھی۔

حرا کی گھبڑوں کا کوئی کنارہ نہیں تھا تو حسن بیک کی شفقتوں و بیاری و ستیوں لائحہ و دھنیں اور وہ کوئی باٹ کر رہ گئی تھی۔

شاہ ویز گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اس نے اس دوران اس مرتبہ کال کی تھی بہت عام سے لے کے میں اس کی خیریت دریافت کرتا۔ ”حرا“ فرخ حسن بیک سب سے گفتگو کرتا اس کا عام انداز مسترا نہ رہا یہ اس کے تمام حوصلوں کو بے کر ڈالتا۔ ”وہ جو اس سے کچھ خاص“ سننے کی تمنا کی تھی کچھ حال اور سنانے کو بے قرار کی اس کی آواز سننے کی دل کی دھڑکن خاص انداز میں چھلنے لگی تھی۔

اگ ایک عجیب کیفیت سے دو چار ہو گئے لگتا تھا۔ ”مرد دوسری جانب کی بے حسی تمام جذبول کو سرور کزدانی تھی۔“

اس پر بھنبلا ہٹ دینے زاری حملہ آور ہوئی جارحی تھی حرا بیک کے ہاں جس بیک کے ساتھ اس کا دل ننگہ ہو رہا تھا اور دن سے وہ نہ ہڑتا رہا۔ ”کمرے میں بند رہی تھی حسن صاحب سے کسی کھانے پر سرسری سی ملاقات ہو رہی تھی حسن بیک اس کے مزاج کے تمام ہموں سے آگاہ تھے وہ کچھ مجھے تھے وہ آج کل تنہائی چاہ رہی ہے اور حسب عادت انہوں نے اس کی تنہائی میں مداخلت نہ کی تھی۔“

حرا جو اس کی عادت و مزاج سے نا آشنا تھیں اس کی رودن کی غیر حاضری پر وہ ہلکائی گھبرائی پریشان دی و یں چلی آئیں۔

”اسلام علیکم“ بیک صاحب! ان کی پہلی فہمیدہ لاؤنج میں بیٹھے حسن صاحب سے ہوئی تو انہوں نے خاصے تکلف زدہ انداز میں سلام کیا۔

”علیکم السلام“ آئے بیٹھیں۔ وہ حرا اٹھ کھڑے ہو کر گواہ ہوئے۔

”مشعل کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ میں دودن سے ڈراما کو بچ رہی ہوں تو وہ اسے بھی واپس بھیج رہی ہیں اور نہ کال ایڈز کر رہی ہیں میں نے سوچا جیسا کہ کڑاں کیا تھا ہے۔“ ان کے انداز میں از حد گرمندی تھیں۔

”اگر اندازہ، وہ بالکل خیریت سے ہے۔ بچا پر پریشان مت ہوں آج کل اس کا موڈ تنہائی چاہ رہا ہے اور حسب ایسا ہوتا ہے تو میں بھی بالکل ڈسٹرب نہیں کرتا اسے جب تک اس کا موڈ بحال نہ ہو جائے۔“

”لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے تو نا دل روئیں نہیں۔“

”وہ بچپن سے کچھ بار ناپائیدگی کا شکار رہی ہے۔ شاہی سے قبل وہ بہت زیادہ ایسی حرکتیں کرتی تھیں، اس کے مزاج میں غصہ، ضد، ہٹ دھرمی اور خود دوسری بہت زیادہ تھی وہ کسی کو کوئی ویلو دینے کو تیار نہ تھی اب شادی کے کئی ماہ بعد اس کا موڈ خراب ہوا ہے۔“

”کوئی ویلو ہو؟ آپ سے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی آپ کو معلوم کرنا چاہیے تھا۔“

”میں نے بھی بھی اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کی ہے۔ ہمیشہ اسے اس کی مرضی کرنے دی ہے شاہی اب میری مداخلت وہ برداشت نہ کر پائے میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ مگر اس کی ناراضگی برداشت نہیں ہوئی اور اس خوف سے میں نے اسے اس کی مرضی پر چھوڑا ہے۔“

”ختم ہوتے تو وہ بھی اسی طرح اپنی بی بی پر جان لانا۔“ بی بی کی خوشی ان کی خوشی ہوتی، دکھ اس کے وہ سارے لیے، میری بی بی خوش نصیب ہے باپ میں ملائم کنیشن شفقتیں اسی انداز میں ملی ہیں۔“ حسن بیک گفتگو میں مصروف تھے اور حرا کا ہنسنے میں چوٹی کی پروازیں بھر رہا تھا۔

”میں مشعل کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں کچھ عرصے کے لیے شہر سے باہر کسی پر فضا مقام پر اگر آپ کی اجازت ہے تو۔“

”آپ لے جاسکتی ہیں شاہ ویز کو لے میں ایک ماہ کا عرصہ باقی ہے اور تب تک میں جانتا ہوں آپ اس کے ساتھ کوئی تڑا سکتی ہیں۔ پھر شاہ ویز جا میں گئے تو وہ اپنی میرا مطلب ہے ان کے ساتھ چل جائے گی پھر شاید وہ مجھے یا آپ کو اتنا نام نہ نہ پائے۔“

”ملازمہ کو کالی لے کا تڑا زور ہے کہ حسن بیک صاحب کو گفتگو تھے۔“

”اُدھو! وہ تو یہ یاد ہی نہیں ہے کہ مشعل شادی شدہ ہیں بلکہ ان کے کسی عمل سے ظاہر بھی نہیں ہوتا کہ وہ شادی شدہ ہیں عجیب غیر دل جیسا! اجنبیت بھرا ان کا رویہ ہوتا ہے کئی بار میری موجودگی میں مشعل نے شاہ ویز کی کالز ایڈز کی ہیں اور ان کی گفتگو میں پھر تکلف زدہ ہوتی ہے کئی میں سمجھتی ہوں اس گفتگو سے بہتر گفتگو ابھی لوگ آپس میں کر لیتے ہیں۔ معاملہ کیا ہے مجھے سمجھ نہیں آتا۔“

ان کی گفتگو میں متنا کی تھوڑی سی پریشانی فکرمندی موجود تھی حسن بیک۔ ”مہم مسکرا کر رہ گئے۔“

”پہلے میں نے سوچا تھا شاید مشعل اس شادی سے خوش نہیں ہے لیکن اس خیال کو ذہن سے دور کر دیا تھا، شاہ ویز جیسا خوب اور بہتر بیویوں سمی یا کر کوئی لڑکی ہوگی جو خوش نہیں ہوگی شاہی ان کے درمیان تکلف کی دیوار ابھی حائل ہے یا پھر ایسی کوئی بات ایسا کوئی جواز ضرور ہے جس نے انہیں تکلف کے رشتوں میں مقید کر رکھا ہے۔“

”مجھے بارہا اس امر کا شکت سے احساس ہوا ہے میں ہر گز ان کو شس کے باوجود ماں کا فرض یا باپ کی تہمت متھی کو نہ دے گا۔ سب اسے کڑوری کا زلزلہ ہے۔“ انہوں نے حسب عادت فرغندی سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا بالکل اس معاملے میں وہ بے قصور تھے۔“

”یہاں آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔ اس کی پرورش آپ نے جس طرح کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ہر کوئی آپ جیسا نہیں ہو سکتا۔ میری بی بی کی خوش بختی ہے۔“ ملازمہ کی آمد پر وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

سردیوں کی شام بڑی اداس ہوتی ہے کسی غریب کو عمر بھر کی یاد آئے گی کسی عجیب ہوئی کوئی رت بھیل رہی تھی۔

وہ لائن میں کم صم اور اس بیٹھی ہوئی طبیعت میں از حد اضطراب پھیلتا جا رہا تھا ہر شے سے وہ آکٹائی جاری تھی۔

کچھ دن حرا کے پاس اور کچھ دن حسن بیک کے ہاں گزارتے ہوئے اسے اس روئین سے تخت و دشت دیوریت محسوس ہونے لگی تھی۔

شاہ ویز کا ایک ماہ کا نو تین ماہ گزرنے کے باوجود مکمل نہیں ہو رہا تھا ہر شے وہ کسی دوسرے شہر یا ملک سے کال کرتا تھا۔

کالز اس کی برابر آ رہی تھیں مگر اس نے کبھی یہ بتانے کی زحمت گوارا نہ کی تھی کہ اس کی واپسی کب تک متوقع

ہے؟ اور وہ ہر بار یہ سوال کرتے کرتے رک جاتی، ایک جھجک، ایک حیا اس کا دامن گویا تمام لبتی تھی اور وہ اسی انتظار میں رہتی کہ وہ اب حال دل سنانے والا ہے کہ "میں اس تمہاری جدائی کا تحمل نہیں ہو سکتا اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی بہت سزا دے چکا میں آ رہا ہوں مزید جدائیوں کے بل عبور کرنے کی سکت پائی نہیں رہی۔" لیکن یہ خیال صرف خیال ہی رہتا تھا خیر خیر سے بات آگے نہ بڑھتی تھی اس کا انتظار اشتعال بن چکا تھا۔ جب انتظار کی طنائیں ٹوٹ جائیں اور ضبط کے حوصلے اپنا توازن کو بیٹھیں تو انتظار مانتظار نہیں رہتا تمام انگلیں سرخ شوق و زید وصال غم زریزہ ہریزہ ہو کر

نقرت بن جاتا ہے
غصہ بن جاتا ہے

وہ بھی تھرا و اشتعال کی آگ میں بھسم ہو رہی تھی۔
"بیٹا! اتنی غصہ میں بغیر سوکڑ اور شال کی ٹٹھی ہیں آپ اس طرح خشن لگ جائے گی آپ کو اور بیمار ہو جاؤ گی۔"
فرح اس پر گرم شال ڈالتے ہوئے غلامت سے گویا ہوئیں۔
"میں میں آگ میں جل رہی ہوں اس آگ میں برف بھی پائی بن کر بہہ جائے۔"
"کیا ہوا؟ کوسا جو رہی ہو کوئی پرانہ ہے؟" وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ٹھوکر سفید و سر ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر بولیں۔

"کوئی پرانہ نہیں ہے میں ٹھیک ہوں۔" اس نے جبرالب کشانی کی۔
"فکری ہو نہیں سکتی کی کوئی کوشش کر رہی ہو۔"
جواب وہ خاموشی سے سر ہٹا کر بیٹھ گئی۔
"کیا ہو گیا ہے جان؟" انہوں نے ہاتھ پھیلا کر اسے سینے سے لگالیا۔ "بالکل مردہ دل ہو گئی ہو ذرا اپنی شکل دیکھنا کتنے میں۔۔۔۔۔"
"میں کھنکھوں کے گرد چلتے چمگے ہیں رنگ زرد اور چہرہ مہرہا کر دیا ہے اس عمر میں آپ کا یہ حلیہ ہے جب ماں ہوگی تو پھر کیا ہوگا؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس کی آواز کی بے لطفوں کا ساتھ نہ دے رہی تھی۔
"شاہد پرکب آ رہے ہیں؟" انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے استفسار کیا۔
"مجھے نہیں معلوم؟"
"کیوں؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے آپ ان کی بیوی ہو۔"
"انہوں نے بتایا نہیں۔"
"آپ کو معلوم کر لیں۔"
"میں کیوں معلوم کر لیتی؟" وہ ان سے علیحدہ ہو کر بیٹھ گئی۔
"تم دو آف ہو شاہد پرکب کی حق ہے آپ کو معلوم کرنے کا۔"
"ان کا حق نہیں ہے بتانے کا؟ کیا ہمارے حقوق سارے فرائض صرف اور صرف بیوی کے ذمے تھے ہیں؟"
وہ برسرِ طرح چل پڑی تھی۔

"نہیں! میاں اور بیوی دونوں فرائض فرائض کے پاسز ہوتے ہیں کچھ فرائض بیوی کی ذمہ داری ہوتے ہیں تو کچھ حقوق ادا کرنے کی ذمہ داری میاں۔" سر پر بھی لاگو ہو رہی ہے۔ دونوں کی باہمی محبت اور دائرہ راسینڈنگ سے سرور لائف سدا رہتی ہے آپس میں جنسی محبت و خلوص ہوگا، رشتہ انتہائی مضبوط، پائیدار ہوتا ہے اس رشتے میں دونوں فریق سدا ہی حیثیت رکھتے ہیں۔" خرا اور فرح جو کوئی دنوں سے اس کی وجہ سے پریشان تھیں روز بروز اس کی گرتی صحت و خاموشی سے اور دوسری طرف شاہد ویز کا عجیب و غریب فتنی رویہ انہیں الجھائے ہوئے تھا۔ اکثر کٹر لڑ پر باتیں کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں انہوں نے اسے بھی نمونے کر دینے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اندازہ لگایا تھا ان کے درمیان کوئی بات، کوئی بخش کوئی اختلاف ہے ضرور شاید ان کا کوئی مسئلہ ہے اور دونوں ان سکول کو چھپائے اس طرح جن پاس کا شرعے ہیں۔

اب اس الجھن کی کرہیں ملتی ڈھیل پڑنا شروع ہوئی تھیں اور فرح اس الجھی ڈوری کے اصل سرے کو تھانے کا ارادہ کر چکی تھیں۔
"چائیز آنا! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ میں نہ معلوم کیا دل فول بک چکی ہوں جو ہو رہا ہے میرا نصیب ہے اس میں کسی کا کوئی دوش نہیں ہے۔" اس کے انداز میں اضطراب ہی اضطراب تھا۔ جو بدھائی میں منہ سے نکل چکا تھا قیاس پر نام نہ گویا۔

"میں انہوں کی بات ہے بلکہ شدید دکھ کی ہم آپ کو اپنے آپ میں سے ایک کھتے رہے اور آپ نے ہمیں آن واحد میں غرض سے غرض پر لا چکا" فتنی الجھنیت کس قدر رکھائی ہے آپ کے لیے جس ہم سے اپنی پرانی بھینڈ کرنے کے بجائے آپ دامن بھاری ہیں اس طرح مجھے ہم آپ کے کچھ نکتے نہیں ہیں۔" حراسے کہا جو نہ معلوم کس وقت ان کے پیچھے کھڑی ہوئی تھیں۔ مشعل کے پیچھے نہ رویے پر پڑ کر گویا ہوئیں۔ وہ دونوں بھی چونک کر پٹی تھیں۔

"مما! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کیوں ایسی باتوں کو اہمیت دے رہی ہیں؟ خدا کے لیے آپ برا مت بائیں۔" وہ بے اختیار آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئی اس کے انداز میں اتنی بے ساختگی و اہمیت تھی کہ حراسے اندر طمانیت تہہ در تہہ اترنے لگی۔

"میں اور آپ آپ کے لیے ایک جذبہ ایک احساس رکھتے ہیں آئندہ ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کیجئے گا۔ ہاں اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ آپ کے اور شاہد ویز کے درمیان بیگانگی اور رد سے ہی نظر آگئی جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مزید عیاں ہوئی آپ کو اور آپ کے بن بنائے ہی ہم بہت کچھ سمجھتے تھے۔ بہر حال اندازے اندازے ہی ہوتے ہیں ضرور کی نہیں حقیقت سے ہمیشہ قریب تر ہوں، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں جو کچھ سمجھتی ہیں وہ صرف دکھاوا ہوتا ہے شاہد ویز ہمیں غریبی کی دراما داس وقت تک غریب و قابل احترام رہتے ہیں جب تک جنیوں کی سرپرستی و محبت ان سے وابستہ رہتی ہیں وگرنہ ان میں اور کھوئے سکوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ آپ بلا کسی جھجک خوف کے بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے؟"

ان دونوں نے ل کر اس کی ہمت بندھائی اسے حوصلہ دیا اور دیا تو وہ کچھ بھی نہ چھپا سکی۔
شاہد ویز سے پہلی ملاقات سے خراب سب بتائی چلی گئی اور وہ دونوں دم بخود ہی رہی تھیں۔
"مجھے احترام ہے اپنی غلطی، ہر لفظ کا میں نے اسے بہت بے عزت کیا الزامات لگائے برا بھلا کہا اس کی زندگی ایک عرصے تک بنیم بنا کر رہی لیکن میں یہ سب اس وقت جواب مجھے اچھے مرے دوست دشمن کی پہچان

نہیں تھی۔ میرے شعور نے آگہی کے دروازے نہیں کھلے تھے، دانش مندی اور سمجھ بوجھ موقوف تھی۔ میں نے جو کچھ کیا وہ، نادانستی و سبے دہنی میں کیا تھا۔ اور جب میرا شعور بیدار ہوا، اور اک سے بندش توڑے تو میں نے اپنی غلطی ماننے میں کوئی لمحہ نہ لگا، باوری صداقت و کشادہ دہی سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا، لڑکی ہونے کے باوجود اعلیٰ رصیت میں خود پہل کی ہر ہر فعل چھوڑا جس سے اسے نفرت تھی، ہر وہ عمل اپنایا جس کو وہ پسند کرتا تھا، رہتا تھا اس کی خاطر میں نے خود کو سربا بدلیا۔

اپنی اپنی خودداری و نوابیت کو جھکا ڈالا، ریزہ ریزہ کر دیا اور خود کو مٹا کر کیا پایا؟

انتظار! انتظار! انتظار جس کی اذیت سے مجھے لگتا ہے۔ "فرح کا سوال تھا یہ خیر جو سیدہ حادل میں پیوست ہوا تھا اور وہ دروہ سے بلایا گیا تھا۔"

"میری اتنی ٹھن ریاقتوں کا یہ صلہ ہے؟"

"جہاں تم نے اتنی اذیتیں کیں ہیں وہاں ایک اور کئی شاہ ویز کو بھوہ واپس آ جائے۔" حرا کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

"پھر وہی بات؟ ہر بار میں ہی کیوں چھوکتی؟"

"اس لیے کہ محبت اور انانیت ایک ہی شے نہیں رہ سکتیں۔"

"مگر میں اب اس کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔"

"نہیں..... آپ اسے کوئی جلد واپس آئے، اسے سامنے بٹھا کر معاملہ سلجھایا جائے گا، آخر ہر کام ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے شادی کو دس ماہ ہو چکے ہیں اور یہاں وہی پہلا کا پہلا دن ہے۔"

حرا کا انداز اتنی قہارت کو شاہ ویز کا قونانہ تو وہ اس وقت تک موقوف کے سر پر سوار ہیں جب تک اس نے اسے واپس آئے گا کہا نہیں۔

"کہنا کہا ڈرا دہا رہانا؟" دوسری جانب سے انتظار! اپنا ڈاڑھیں اصرار ہوا۔

"آ..... آپ..... واپس..... آ جائیں۔" وہ مزید بول سکتی تھی۔

"اس قدر گھبرا کر کیوں بول رہی ہو؟ کوئی زبردستی کبھی ہوا تھا؟" وہ بھی ایک کائنات تھا اور اس کی چوری بکری تھی۔ جو اب اس سے کچھ کہانی نہیں کیا وہ حرا کو یورو پڑا کر مٹی کی۔



"وشعل! شاہ ویز کو واپس نہیں مانگ لگے گا، کام تو سلیٹ ہو چکا ہے وہ کچھ تفریح کی خاطر وہاں رک گئے ہیں، جی سے کل رابطہ ہوا تھا وہ کبہری تھیں انہیں واپس میں دیتے لگیں گے جج کے بعد وہ اپنے کسی عزیز کے ہاں رخصت طے گئے ہیں اور میں چاہتا ہوں آپ ان کی آمد سے قبل وہاں جا کر کھر کی صفائی وغیرہ کر دو، آج میں بلاں پورے گھر کی سیٹنگ کی تیاری کر دیک، ایک سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے گھر میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے ان کی آمد سے قبل چینگنگ ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"وہ رات حرا کے ہاں سے گھر آ گئی تھی۔ جج ناشتے کے بعد حسن بیک نے اس گھر کی چابی دیتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔

"اؤ کے پاپا؟" اس نے چابی تھامے ہوئے کہا۔

"جیس! میں آپ کو دہاں ڈراپ کرتا ہوا جاؤں گا اور آفس جا کر ڈرائیور کو واپس بھیج دوں گا۔ جو لانا چاہو کچھ کر لیں گے۔"

گھر میں قدم رکھتے ہی ماشی کی اذیتیں ایک ایک کر کے بچو کے لگنے لگی تھیں وہ شدید بوجھل پن و پڑھری میں کرنے لگی تھی۔

واپس خوشگوار ہوں تو طبیعت کو از سر نو تازہ و سرور کر رہی ہیں چرکیدار اپنی فطرت کے ساتھ ہاں در ہاں تھا اور باقی ہمیشہ پڑے تھے وہ لاؤنچ میں آ کر صوفے پر بیٹھیں اور ایک سے سرگراں کھینچیں موندیں رفتہ رفتہ اس کے اندر احساس اترنے لگا۔

سکون، سرور، راحت کا احساس بے خود کے ہوئے تھا، اسے محسوس ہوا تھا جتنا گھر کیا ہوتا ہے؟

وہ کی شناخت کیسا اعتماد، تو قیر غشی سے وہ کئی ماہ پہلے اپنی شناخت کھو بیٹھی تھی۔ ایک بستی ہوئی روح جن کی تھی اسے اچھی کی طرح جو اپنے آشنائے کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کی تمام رنجیدگی خاموشی و بیزاریت کی گہری کی طرح صاف ہو گئی وہ خود کو بالکل ہلکا پھلکا مسطر معطر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بھر پورانی لے کر کھڑی ہوئی۔

"میں معمولی سے فریج اور عام سے دروازہ اور پالے گھر نے مجھ پر کیا کچھ چھوڑا ہے میں جو گذشتہ کئی دنوں سے خود کو مل رہا ہوں محسوس کر رہی کی یکدم ہی گویا فانی روح میرے اندر ٹھونک دی گئی ہے۔ کیا وہ یہاں آنے کے لیے بے اور پریشان تھا جو یہاں کھوں میں میرے اندر توانائی و سرور کے پتھر بیٹھے ہیں، کیا وہ عایشان گھر مگر کی صورت شگفت میں کہیں بھی ایسی گمانیت دستر محسوس نہ ہوئی تھی جیسے ان کے احساسات سے یہاں آ کر پار ہوئی ہوں۔" میرا تصور بہت پہلے معلوم بہت پہلے اس کا تعلق کو قبول کر چکا تھا جس کا احساس مجھے یہاں آ کر ہوا تھا۔

"نہ..... ہر چیز کا بازہ ملتی ہوئی تھی، یہ سوچ ہی اس دوران چرکیدار کی بیوی کی طرح ملامت کرتی تھی۔ کروں کے فائنل پر دے سب ملے ہوئے تھے بعض کھروں کی کھرا اسکیم بھیج کرنے کی ضرورت تھی پھر اس نے مل لست بنائی تھی۔ کھرا اسکیم ایک نکتے میں پہنچ ہو گئی کی لاں کو۔ نئے سرے سے سنوارا گیا تھا تمام برائی چیزیں زموں میں اس نے بانٹ دی تھیں۔ پھر اس نے پردوں، قالین، کرا کر کی اور دوسرے آرائشی سامان کی خریداری

دع کر دی یہاں حسن بیک نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا اسے تم بغیر مانگنے لے جانی تھی ڈرائیور اور چرکیدار کی کی کے ہمراہ وہ خرید و فروخت میں مصروف تھی اور تیزی سے گھر کی حالت بدلتی جا رہی تھی وہ عام سا گھر اس کی ت اور زبردست جمالیاتی حس کے باعث اب شاندار شکل نظر آنے لگا تھا سب جگہ کی آرائش و زیبائش اس نے مدد بہتمام اور احتیاط سے کروائی تھی اور خصوصاً جی اور شاہ ویز کے بیڈرومز کے انتہام میں از حد احتیاط برتی گئی۔

جی کے بیڈروم کی کھرا اسکیم آف وائنٹ میں کروائی تھی اور اس کی مناسبت سے فریج پر رکھا تھا اور آرائش دہائی تھی ان کے فریج میں ایک خوبصورت چوکی کا اضافہ تھا جس پر اس نے بھاری سرخ سٹیل کی جانے نماز بنائی تھی جانے نماز پر خانہ کعبہ کی پرتو زریعہ و براں تھی۔ سب سے زیادہ محنت اس نے شاہ ویز کے بیڈروم پر کی تھی اور

پورے کچھ دنوں کا استعمال کیا تھا جو شاہ ویز کی طبیعت سے بچ کر تھے۔ ڈرائنگ روم اور لاؤنچ میں خوش گار کا استعمال کیا تھا اور اسی نسبت سے ڈیکوریشن بھی کی گئی تھی۔

سارا گھر سنور گیا تھا۔ فرش سے چھت تک ہر چیز پر جم کر رہی تھی۔ ہر کمرے میں خوبصورت پھول گل دانوں

ملنے لگی تھیں۔

ملنے لگی تھیں۔

ملنے لگی تھیں۔

ملنے لگی تھیں۔

ملنے لگی تھیں۔

ملنے لگی تھیں۔

میں سکر رہے تھے۔
سر دی شد بد ہو گئی تھی۔

وہ اب تھک چکی تھی، دس دنوں میں اس نے دن رات محنت کی تھی ایک دلولہ ایک عزم اسے ہمد وقت تر دتا اور رکھتا تھا تھکن اس کے قریب بھی نہ پہنچتی تھی۔
اب جب وہ اپنی خواہشوں کو مکمل طور پر دے چکی تھی اس کی محنت اور کوششیں بامآ وراثت ہوئیں تو ایک دم سے تھکن و سستی اس پر مار ہو چکی تھی ڈرا نیور کلاس نے وہاں پہنچ دیا تھا اس کا آج تک نہیں رکھنے کا ارادہ تھا۔
سر دیوں کی شاخیں بوجھل ہوئی ہیں اندھیرا جلد آ رہا ہے۔

اس روز بھی موسم اچھا لو تھا سر شام ہی رات کا گمان ہو رہا تھا۔ اس نے تمام کھڑکیوں دروازوں کو لاکھ کیا اور کھانا کھا کر شاہ ویز کے بیڈروم میں چلی آئی ابیز آن کر کے بیڈ پر دراز ہو گئی۔

رات
سر دی
تنبہائی

اس کے اندر کوئی ہولے ہولے ہوئے کھٹکے لگا۔
مہمان نے کہا تھا تو اسے لوٹ آنے کا بکھوڑہ لوٹ آئے گا اور اس کے دل میں بھی تو یہی خوش فہمی جاگ رہی تھی
خوش فہمی جنس فہمی رہی تھی۔ اس سمجھ کر کی یاد مویوں کی صورت آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر وہاں
بکھر نے تھی اس کی بکوں سے آگے نکلی تھی۔

تیری الفت میں قسم

دل نے بہت درد سے اور ہم چپ ہی رہے
بہت مرے بغل پر لیو پر سنا ہوا گیت اسے اپنے حسب حال ہی لگا تھا اور وہ پوری طرح افسردہ ہو گئی تھی
غم نہیں ٹوٹ گیا ہائے دل ٹوٹ گیا۔
پھر بھی آنسو نہ بنے اور ہم چپ ہی رہے
وہ بے چین ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی

تیری الفت میں قسم دل نے بہت درد سے

تیری الفت میں قسم دل نے بہت درد سے

وہ اندھ کر کمرے میں بیٹھ گئی۔

کمرے کی ایک ایک چیز کو یا اس کے ساتھ اشک بار ہو رہی تھی ہر ایک گوشے سے تنہائی وادائی گئی۔
اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے یہاں بٹھرنے کا ارادہ غلط کیا ہے یہاں کی تنہائی خاموشی کی آسپ کی طرح
حادی ہو رہی تھی۔

ہرگز نہ تھا اسے دشت زدہ کر رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی وہ پہلی مرتبہ تو اس طرح تنہا نہیں رہی تھی
پاپا کے بڑے نور کے باعث وہ پاپا کے ہاں کی ہفتوں تیار رہی تھی اور بھی تنہائی یا وحشت کا شکار نہ ہو
کا سابقہ اسے یہاں نہ تھا۔ شاید وہ پاپا کو کھڑا تھا اور یہ "بیا" کا وہاں وہ ہر طریقے سے رہنے کی عادی تھی
وہ جتنا عرصہ بھی رہی شاہ ویز ساتھ تھا۔ لوگ ان کے درمیان خوشگوار دوستانہ تعلقات ہرگز نہ تھے۔

لے ایک ہی بیڈروم میں ہوئے کو تو جیج دی تھی۔

اور لا شعوری طور پر وہ اس کے وجود کی عادی ہو چکی تھی اب اس کمرے میں وہ از حد بے چینی دینے لگی تھی
رہی تھی اس نے جو جانا زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔ وہ وہاں پاپا کے ہاں چلی جائے وہاں کم از کم تنہائی کا جان لیوا
سنا تو نہ ہوگا۔ ویسے بھی روزانہ آتی تھی اور کام کر دیا کہ تک لوٹ جاتی تھی نہ معلوم آج کیا ہوا تھا اسے جو
یہاں رکھنے کی بیوقوفی نہ رہی تھی۔

ابھی وہ اپنی سوچ کو مکمل طور پر چھوڑ چکی تھی کہ ایک دم لائٹ چلی گئی لائٹ چلی گئی اور ہر سو گہرا اندھیرا پھیل
وہ جہاں تھی وہیں ٹھہر گئی، کچھ دیر تک لائٹ نہ آئی تو اٹھ کر موسم ہی تلاش کرنے لگی کام کی مصروفیت کے باعث
بچ چار چھ نہ کر سکی تھی جو اس وقت شل تھی۔

موسم چلی اور لائٹ اسے دروازے سے مل گئے تھے اس نے جلا کر کار پر آویزاں کیڈنل اسٹینڈ پر ایک ساتھ کئی موسم
اس جلا کر رکھ دیں۔ دیواروں پر موسم تھیلوں کے سائے لڑ رہے تھے۔
اندھیرا اور روشنی ایک دوسرے کے سنگ جو خاص تھے تنہائی پہلے ہی اسے مکمل کے ہوئے تھے اب یہی اتفاقا اسے
بہت کیے ہوئے تھے موسم چلی کا پورا ریٹک جلا جانے کے باوجود روشنی کا نالی لگ رہی تھی اور اس کی پر چھائی کے
کمرے کی ہر شے کی چھائیاں نمایاں ہو کر دیواروں پر ڈال رہی تھیں۔

خوف سے اس کا نازک دل دھڑک دھڑک جا رہا تھا کالی دیر بعد جب خوف میں کمی واقع ہوئی تو اس نے
لی اسٹینڈ سے ایک موسم چلی نکالی اور ٹیبل پر شاہ ویز کا نام لکھنے لگی۔
فانچ کی ٹیبل کی شفاف سطح پر سرخ موسم سے جگہ جگہ ایک ہی نام لکھا تھا۔

شاہ ویز
شاہ ویز
شاہ ویز

اس نے شفاف پتھلی پھیلائی اور اس پر بھی لکھ دیا۔ اف گرم گرم قطرہ اس کی نازک پتھلی پر گر گیا جان ہی نکل
لگن اس اف ریت میں بھی ایک انوکھی لذت پہنچاں تھی۔

وہ کوئی انداز میں پتھلی جلاتی تھی جلاتی رہی جب چاہک بالکل اچانک دروازہ کھلا اور وہ موسم چلی سمیت لڑ کر
اسی کو اس کے ہاتھ میں کا پی اور وہ اس طرح کھڑی ہو گئی جیسے اس نے دروازے سے میں کوئی بھوت کھڑا کچھ لیا

بار
بار
بار
نے استیجاب یہ انداز میں پلکیں چپکائی تھیں اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ٹھنکی باندھ دیکھ
والے پر شاہ ویز کھڑا تھا۔

ہاں شاہ ویز..... وہی شاہ ویز جو اس کی دھڑکنوں میں بسا تھا جس کو اس نے پھٹلی پر بھایا تھا خیالوں میں تھا اس کو اپنی بصارت پر دھوکہ کھانا پور تھا۔

”ممكن ہے نہ یہ رب کو خیال ہو کہ وہ بھوکا ہو خواب ہو کوئی اور ہو نہیں وہ شاہ ویز ہی تھا۔ جو دروازے کے باہر بیٹھ کھڑا تھا شاہ ویز نے اسے دیکھ کر ہاتھ بڑاؤن کوٹ موٹ میں وہ پہلے سے بھی زیادہ صحت مند اور چاق و پختہ آ رہا تھا آنکھوں میں چمک تھی چہرے پر سرخی تھی۔ رنگ گل کر اور صاف ہو گیا تھا۔ ہونٹوں پر رولڈ ویز تھی۔ وہ ایک دوسرے کی جانب حمزہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔ شاہ ویز نے آنکھوں میں انوکھی چمک تھی۔ مشعل کی آنکھوں میں رخصت تھی خواب سے بیدار ہو جانے کی سراپائی تھی ہاتھ میں موسم کی تھر تھرائی تھی چلتا موسم اس کی پھٹلی میں جچ ہونے لگا تھا۔ دو پینڈھنوں سے دھلک کر کلائی پر گر گیا تھا وہ ابھی تک مقبوض ہے پھٹنی کے دورا ہے پر کھڑی تھی جب موسم ختم ہوئی پھلاسا ایک مشعل کی طرح بھڑکا اور شعلے نے اس کے دو بے کو لپیٹ میں لے لیا جو پھٹلی پر سرک آ گیا تھا۔

”ارے..... ارے..... آپ نے دو پینڈھن لایا۔“ وہ چیخا ہوا اس کی طرف لپکا اور دوپٹے کیچے کیچے پھینک دیا اپنے بھاری بوٹ مار مار کر دوپٹے کی آگ بجھائی تھی۔
”دو پٹے کی آگ تمہیں نظر آتی ہے میں چون من چلائے بیٹھی ہوں میری سرقتیں میری خواہش میری اتنا میرا کہ جس میں سب بدل کر خاستہ ہو گیا وہ کچھ نہیں نظر نہیں آتا؟“
”اوہ..... ہو گیا ہو گیا ہے گرم گرم موسم ہاتھ جلا رہا ہے۔“

شاہ ویز نے دوپٹے کی آگ بجھا کر اس کی طرف دیکھا قرب قرب آ کر اس کا لرزنا ہاتھ تمام لیا۔ اسی وقت لائٹ آگئی تمام روشنائی جل اٹھیں کرہ جگمگاتے لگے۔ سارے میں چکا چوند ہو گئی۔
اس نے ان موسم میں ان کی جانب دیکھا جو لائٹ آنے کے باعث ہوا کی دھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں اور بہت جھ لگ رہی تھیں۔ ہاتھ شروشینوں نے ان کی حیثیت زور کو دی کی۔ اسی وقت وہ بھی ان موسم میں ان کی طرف شاہ ویز کے سامنے ہاتھ حقیر و زور دگر رکھ رہی تھی۔ شاہ ویز نے اس کا ہاتھ تھا ہوا تھا۔ جس کی پھٹلی پر پھالوں کی صورت میں شاہ ویز لکھا ہوا تھا۔

اس کی نگاہ پھٹلی سے ہٹ کر نیپل کے شے پر پڑی تھی۔ جہاں سرخ موسیٰ نظر سے جگہ جگہ اس کے نام میں ڈھٹے ہوئے تھے اس کی نگاہ پلٹ کر آئی تو مشعل کے چہرے پر غمخیزی اس کا چہرہ گلی کتاب کی مانند تھا جس کا ہر لفظ محبت کی روشنائی سے تحریر تھا اس کے چہرے پر بچ تھا۔
اس نے بھی اپنی گلی آنکھیں اس کی آنکھوں میں اچھائی وہ اب کوئی حجاب کوئی مائل درمیان میں رکھنا چاہتی تھی۔ مگر ابھی شاید اس کی مناجات قبولیت کے درجے پر فائز نہ ہوئی تھیں جو اسی دم دروازہ کا نرک کے شہ ویز کا پھینکا کو لگ اندر آ گیا۔

”راہیں جا رہا ہوں آپ کا سامان ملازم سے اندر رکھوا دیا ہے۔“
مشعل کو سلام کر کے وہ اس سے مخاطب ہوا تھا سہیل کو دیکھتے ہی شاہ ویز نے مشعل کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور

تد رے پر بہت کیا تھا۔
”آپ صبح شام یہاں فون کے کے میرا دماغ کھاتے ہیں اور یہ اطلاع مجھ سے کیوں چھپاتی ہیں ڈر کا اجتنام کر لیتی ہیں نے دوپہر کے بچے ہوئے کھانے سے ڈر کیا تھا۔ اب کچھ تیار کی نہیں ہے۔“ وہ سہیل پر اپنی حیا

رے میں کا میاب ہو گئی تھی۔

”آہ تم سو..... سوری میڈم اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے کچھ دیر قبل سرنے مو بائل کے ذریعے اطلاع دی کہ ایئر پورٹ پر موجود ہیں جا کر ریسورکروں سو میں جا کر انہیں لے آیا سارا صاحب کتاب انہیں سے دریافت

کر لیں۔“ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔
”گوں کس جاکر آتا تو تم میرا اتنا شامدار استقبال کس طرح کرتیں؟“ اس کی آنکھوں میں اثرنی شکایت دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ ”میں ان لوگوں میں بہت بڑی خوشی سے فیض یاب ہوا ہوں۔“
مشعل کی شکایت از خود رفع ہو گئی تھی وہ اس سے نگاہ چرا کر آگے بڑھ گئی۔

”ذہنی فکر مت کرو میں کر کے آتا ہوں ہاں اگر کافی مل جائے تو عنایت ہوگی۔“ اس کا انداز شگفتہ و شوخ تھا۔
وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی بچن میں چلی آئی اور بڑی پاہ سے اس کے لیے کافی بنانے لگی تھی۔
اس کے لب خود بخود مسکراتے لگے تھے۔

روم دروسہ شادی و سرستی کی کیفیت میں جھونے لگا تھا۔

دل سرگوشیاں کر رہا تھا

دہا کیسا ہے ✓

تیرے من کا سبب!

تیرے خوابوں کی کبیر

تیرے من کی مراد

وہ من ہی من میں سرت سے جھومتی ہوئی چڑھتی ہوئی میں دوگ کافی کے لے کر وہاں چلی آئی سارا کرہ اس کے پر فیم کی دفتر بھیک سے مرکا ہوا تھا وہ بیڑ پر مکیوں کے سہارے..... دروازہ تھا۔

اس نے کوٹ آٹار دیا تھا آف دینٹ شرٹ کے پٹنڈا اور پیٹن کھلے تھے کہ بریان کی اوٹ سے سیاہ بال نظر آ رہے تھے آنکھیں گلی سرخ ہو رہی تھیں بال کچھ بکھر گئے اور ان بکھرے بالوں میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا ہیٹ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔

اس کا خوشی سے لڑتا دل اپنے بخت پر نازاں و فرماں تھا۔ اس نے بچکے سے ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی۔
کافی اور سیاہ کانٹن کے کر دیشے کے کدے وہ زیب و دک دلوٹے میں وہ بالکل عام حلیمے میں تھی۔

چہرہ ہر آرائش سے مبرا ہر چھایا ہوا۔

بالا سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں پیچھے ہوئے تھے جن سے کئی نکس نکس کر اس کے چہرے پر ناگوں کی طرح برائی تھیں۔

اس کی غیر موجودگی میں وہ ہنسنا سورا بھول چکی تھی اور گھر کی سیٹنگ کی تیاریوں کے دوران تو وہ خود سے زیادہ نافل ہو گئی تھی۔

کافی پینے کے دوران ان کے درمیان مکمل خاموشی رہی تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں سست۔

وہ خالی گک لے کر بچن میں آئی تو کچھ صفائی کرنے میں ناگم لگ گیا تھا اور وہ کمرے میں گئی تھی وہ اسی طرح نیم

دراز سورا تھا۔ پاؤں میں بوت اسی طرح سے اور چہرہ دروازے کی سمت گویا وہ اس کا انتظار کرتے کرتے نیند میں غوش میں پونچھ چکا تھا۔ وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی اس کی سمت چلی آئی اور پکائی نگاہوں سے اس کی جان دیکھنے لگی۔

”تمہاری ہونے کے لیے میں نے ہر قربانی دی ہے اور دیکھو..... آج تمہارے نام سے میرے ارد گرد ستر ستارے روشن ہو گئے ہیں۔ تم کہتے تھے ہوا عام مردوں سے بالکل منفرد و منفرد اور غافل بھی۔ تمہارے جیسے مرد کو غافل ہونا بھی چاہیے۔“

جوش اپنے آپ پر ظلم کر سکتا ہے۔ اپنے نفس پر جبر کر سکتا ہے۔ تمہارا یہ ظلم..... ظلم نہیں، مہربانی، ہوئی مجھ پر میں کبھی پہنچتی..... ان میں بہاؤ ہوں۔ وہ ہنک کر بوٹ کے سامنے پھوٹنے لگی۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ فوراً ہی بیدار ہو گیا تھا۔

”میں جو تے اتار رہی ہوں، آپ تنگ گئے ہیں۔ آرام سے سو جائیں۔“

”نو۔“ سنکس میں اٹھ رہا تھا، دراصل کئی راتوں سے سو پائیں ہوں تنگ طرح سے اس لیے ذرا سا آرام ملتے ہی نیند نے غلبہ پایا۔ اس نے اٹھ کر جوتے اور پیرائیں اتار لیں اور باہر دم کی طرف بڑھ گیا جتھے میں مستند کی اسے اس دوران ناخوش سوٹ دیا تھا آئی تھی وہ ڈریس پہنچ کر کتے کا توبہ جانی کی طرف بڑھتے ہوئے گویا ہوا۔

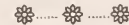
”میں سو رہا ہوں جب تک خود نہ اٹھوں۔“ جگائے گائیں بہت دیر لیکن اس کی نیند ابھی تازہ رہی ہے۔ اس نے بیڈ پر لیٹ کر لیٹ کر جوتے ہٹے ہٹے ہوئے کہا اور چہرے تک لیٹ کر کرکٹ لے لی تھیں۔ جتھے نے اٹھ کر لائٹس آف کر دیں اور نائٹ بلب جلا کر باہر نکل آئی۔ کچھ دیر تک وہ کھینچ بٹاش کر رہی۔

ایک دم ہی اسے اداس و دلگیر نظر آئے۔ کئی لمحے پہلی بار اس نے اس کا اہلانا انداز اور محبت و جاہت چھلکا کر دیا ہوں میں اپنا کس دیکھا تھا۔

آپ آنا دیکھا تھا اور کبھی جس کی خطائیں معاف ہو چکی ہیں اس کی سزا قسم کی جا چکی ہے وہ صرف اس کی خاطر آیا ہے اس کے لیے آیا ہے۔ لیکن وہ سب محض دل کی خوش فہمیاں دکن کے بہلاوے ثابت ہوئے تھے جبر فراق اس کے لیے بے معنی تھے۔

وہ صاف فری ما نندا یا تھا اور کھر کھرا سے کچھ کر بے خبر ہو گیا تھا۔

”یہ یاد تو جیتے ہیں اس کی طور کا بار نہ پاسکے کی اسی طرح توجہ ہوئی سکتی ہوئی مر جائے گی اور اس سنگدل کو تیری تہ پر پر پھول رکھنے کی بھی توقع نہ ہوگی۔“ اس نے آرزو سے سوچا اور اس کا لایا ہوا سامان اسنوروم میں رکھنے لگی۔



حرانے خاموش نگاہوں سے فرح کی جانب دیکھا جن کے چہرے پر غصہ و تاسو سرفی بن کر چھایا ہوا تھا۔ پیشانی پر شکلیں اور جڑے تیروں نے ان کی نرم و نازک شخصیت کو خاموشاں کر رکھا تھا۔

درمیان صوفے پر منصور کا درجمن تھا اور ان کا انداز ایسا تھا جیسے کسی پھانسی کی پانے والے جرم کا ہوتا ہے اسے دگر تہ وافر دہ۔

”تم مجھے معاف کرنے پر بالکل نہیں ہو؟“ ان کی دھیمی آواز بے جاں تھی۔

”خفاؤں کو جھکاؤں کو بار بار معاف کرنے والی فرح اسی وقت مر گئی تھی جب تم مجھے اپنی غرض پوری نہ ہونے پر سزا کے گئے تھے جھکاؤں سے ہی کئی میں نے خود کو دلایا ہے پہلے میں خود کو دیکھتی تھی اب میری بہادری پر گویں کو رشک آتا ہے۔ پہلے میں سہاروں کی محتاج تھی اب خود سہارا ہوں“ محافظ ہوں چٹان ہوں اب مجھ سے ہر کسی کے نام پر کسی کی غلامی ہو سکتی ہے کسی کی کینہیں ہو سکتی ہیں۔“

”پلیئر گزشتہ باتوں کو بھول جاؤ اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی مجھے میری زیادتیوں کی سزا مل چکی ہے میں تمہیں ٹھکر کر گیا تھا اور جو اقدار قدرت نے مجھے ایسی ٹھکر ماری ایک ہی ٹھکر کے مجھے اوقات یاد دلادی۔“ منصور کی تہی اپنی اسی دنیا و از میں بچھتاؤں کی لڑائی تھی۔

”جو مرنا حق موت کو زراش میں ڈالے ہیں وہ قدرت کی طرف سے خود آئے جاتے ہیں تم مرد لوگ کیا کہتے ہو واللہ صرف تمہارا ہے؟ وہ صرف تمہارا ہی ساتھ دے گا؟ جائزہ جائزہ پر کام میں اس کی رضا کہیں حاصل ہے؟ تم جب چاہو گے ٹھکر کر دو گے جب چاہو گے اپنا لوگے اور عورت۔“

”پلیئر آئی، پھوپھو بیات ختم کریں، دوہلا بھائی کو اپنی غلطیوں کا احساس ہے وہ معافی بھی مانگ رہے ہیں اب آپ کو ناراضگی ختم کر دینی چاہیے۔“

حرا کو دعا ملت کر پنی کی سکن فرح کسی طوفان کی طرح پھیری ہوئی تھیں جنہیں قابو کرنا ان کے بس کی بات تھی۔

”نہیں کر سکتی میں معاف؟..... کس طرح معاف کر دوں؟ زندگی شہید یا غم و خوف میں گزار کر اب جیسے کا حوصلہ ہوا ہے تو پھر کر دو ہونے کا وقت آ گیا میں سب کچھ کر سکتی ہوں مگر اپنی ذات کی کئی ہرگز کو اور نہیں۔“

وہ اٹھ کر تیز قدموں سے وہاں سے نکل گئیں۔

”میں آخری سانس تک منتظر رہوں گا۔ فرح کو باور کرا دیتا۔“ منصور مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے چلے گئے تھے۔

”آپ کو اپنا رویہ بدلنا ہو گا آئی! ارجمند میں ہر شے میں دو جاتی ہیں لوگ جیتے جی ایک دوسرے کو مرد و تصور کے تعلقات تو توڑ دیتے ہیں، کیا کچھ نہیں ہوتا ناراضگیوں کے دوران مگر جبر جبر غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں جن میں محبت میں ناراضگیاں خرابیوں میں بدل جاتی ہیں تو سب ایک ہو جاتے ہیں اور ایک ہونا بھی پڑتا ہے معاشرے میں وہی رنگ عزت و توقدظ پاتے ہیں جو مضبوط رشتے اور مہر بھر د رکھتے ہوں۔“ منصور کے جانے کے بعد وہ فرح کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

”حرا!..... جرات میں جانتیں کسی کو معاف کر دینا آسان نہیں ہوتا۔“

”اوہ..... کیا آپ مجھے سے کہہ رہی ہیں۔“ وہ دھجھے انداز میں سکرانی۔

”اوہ..... سواری..... سواری حرا! میری جان۔“ انہوں نے بڑھ کر اسے پلناتے ہوئے شرمندگی سے کہا۔

”اس شخص نے آکر میرا دماغ کھما یا مجھے میں نہیں آ رہا کہ کیا کر رہی ہوں۔“

”آپ نے مجھ سے کہا تھا معاف کرنے والا دل لینے والے سے زیادہ افضل ہوتا ہے آئی آپ بھی انہیں معاف کر دیں آپ کا بدلتو خود اندامیاں نے لے لیا۔ جاتے وقت کتنا غلط غرور تھا خدا نے اب وہ اپنی میں تمام شکایات جا کر آئے ہیں پہلے انہوں نے آپ کو کوکرائی بنا کر رکھا تھا اب مہارانی بنا کر رکھیں گے یہ میرا دعویٰ ہے آپ کو انہیں معاف کرنا ہی، جو میری خاطر ہی تھی۔“ حرا کے لہجے میں اطمینان کا مان و فخر تھا۔

منصور نے میرے ساتھ ہی نہیں تمہارے ساتھ بھی بہت زیادتی کی ہے کیا تم معاف کر سکتی ہو اس کو؟
 کے دل کی بات یوں پتا نہ گئی۔

”انہوں نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی اور میں نے تہہ دل سے انہیں معاف بھی کر دیا تھا اور کیسے نہ کرتی رہا ہوا اس میں میرے قیص کا دوش تھا پھر ان کا رویہ میرے ساتھ ہمیشہ بڑے بھائیوں جیسا رہا ہے میرے دل میں ان کے لیے کبھی بھی احترام تھا آج بھی میں ان کی از حد عزت کرتی ہوں۔“

”کل شاہہ بڑے چلنے والے رہی ہوں؟“ انہوں نے سرعت سے موضوع چھیڑ کر کیا تھا۔
 ”ہاں ضرور چلیں سر، لیکن ہم نے زیادتی نہیں کی مشکل سے ان کی آٹھ چھپا کر حالانکہ ہم سب ہی واقف تھے مشکل کو حلیم ہو گا تو وہ ہو گا۔“

”جو جوش اسے شاہہ بڑے پر کو دیکھ کر ہوئی ہوگی وہ معفر ہونے کے بعد تھوڑی ہوئی حسن صاحب تو راضی نہ تھے بڑی مشکل سے راضی کیا تھا۔ میں نے انہیں مشکل کو کچھ نہ بتانا اور بدل چھوڑنے پر۔“ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔
 ”شاہہ ویز کی والدہ فرانی ڈے کا آ رہی ہیں۔ ان کے لیے بھی شاپنگ کرنی ہے شادی میں ہماری طرف سے انہیں کچھ نہیں ملنا تھا۔ کراہٹ ہم کوئی کسر نہ چھوڑیں گے شاہہ ویز اور مشکل کے لیے شاپنگ مکمل ہوئی فرانی ڈے سے مل جل ان کی شاپنگ بھی مکمل کرنا ہے۔“

”جی میڈم“ مجھے سب یاد ہے اور آپ چالاکی کے موضوع بدلنے کی کوشش نہ کر میں منصور بھائی کو ڈون کرنے جاری ہو کر جاں گھر کے دروازے تو پہلے ہی دے دیتے اب دل کے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔“
 نے ہنستے ہوئے فون اسٹینڈر کی طرف قدم بڑھایا تھا۔
 ”حرا! بات سنو۔ بات سنو! مجھے نہیں روکو۔“ فرح نے بولکھا کرا سے روکنا چاہا تھا حرا نے پھرتی سے نمبر مٹا ڈالے تھے۔



سامان رکھنے کے بعد وہ کمرے میں نہیں گئی لاؤنج میں پیچھے سر می کا ہارٹ پر رکھے کفنزر کے سہارے بیٹھ کر آکھوں سے سینہ غائب تھی تو دل سے سکون و قرا بھی رخصت ہو چکا تھا سوچوں کا اثر وہام تھا جو اسے دے دے دے رہا تھا اور وہ ان سوچوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ جس نے اس کے کمزور ناک دل پر خراشیں ڈال دی تھیں خواہشوں اور کشاؤں کو بولہ بان کر ڈالا تھا اور اس کی روح کو نکلنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

سوچوں سے دامن نہ چھڑا پاتی تھی کہ نوسنیں بلائے سہما ہوں کی طرح دار ہونے لگے تھے وہ دانتیں جانتی تھی سوچنا نہیں جانتی تھی لیکن کسی پر بھی اس کا اختیار نہ رہا تھا بد دل پر بھی بس نہ چلتا تھا تو پھر ہر جذبہ خود ہوتا جاگم تھا نہ معلوم کئی دیر پر درگاہ چلا کر دروازے پر آٹھ ہوئی تھی۔ سامنے سینے پر ہاتھ باندھے ٹائٹ سوٹ میں بال بکھرے شاہہ ویز کھڑا انجیدی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”آپ..... کی چیز کی ضرورت ہے؟“ وہ خفیفی اسٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ تمہاری۔“

”تھک..... کیا مطلب؟“ اس کے اندر رانچل ہوئی تھی۔

”تم نے پانی نہیں رکھا تھا مجھے عادت ہے پانی پینے کی“ اس کی آنکھیں کچھ اور کبھری تھی لہجہ کچھ اور اس کی نگاہوں کی زبان پر اسے اعتبار نہیں تھا۔ وہ دودھ پینے سے چہرہ صاف کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم نے کہا تھا واپس آ جاؤ اور میں واپس آ گیا“ تم مجھے وہاں چھوڑ کر یہاں میرے آئے کا سوگ منا رہی ہو میں خوش تھا کہ میری کہیںوں کی در بدری نے کام تو دکھایا میرے نصیبوں پر بھی برف پھیل گئی ہے میری زندگی میں بھی کیف و نشاط کی بہاریں ڈرنی ہیں مگر کتنا ہے تم ابھی تک مجھے قبول نہ کر پاتی ہو اور مجھے محبت کا احساس پہنچ کر لایا ہے چند بدل سے مجبور ہو کر میں آ یا ہوں اس سے بڑھ کر اور کیا حیثیت ہو سکتی ہے میں اپنے پیچھے سب دروازے بند کر کے آ گیا ہوں۔ صرف دو دفاتر کا رونا دکھلا ہے۔ جاہت کا گھر یا کر کے کی خاطر محبت کا جہاں بسا نے کی خاطر میں بہت تھک گیا ہوں آج آخری بار اپنا خوددار اور خودری و دوسری کر یاہر یہ کر کے ان کرچوں پر چل کر آ یا ہوں۔“ وہ کبھر اٹھا آخر وہاں اظہار محبت کر رہا تھا۔

اس کے لیے میں سچائی کی اس کی آنکھوں میں سچائی تھی اس کی باتوں میں سچائی تھی وہ سراپا سچائی بنا ہوا تھا۔
 ”مجھے اس طرح بے یقین نظروں سے نہیں دیکھو۔“ وہ اس کے کمر پر چلا آیا تھا اس کے سارک و صامت کھڑے جو دو کمرے اشتقاق سے بازوؤں میں لپٹے ہوئے وہ بارہ گویا ہوا تھا۔

”مجھے اعزاز نہیں تھا مجھے جیسے فولادی حوصلے اور چٹائی جذبات رکھنے والے شخص کو کم یوں موم کی طرح کھینچا دوگی“ تم سے وہ دور کر دیا جانا کہ تمہاری قوت کے بغیر زندگی ممکن نہیں ہے میرے پاس نہ ہوتے ہوئے بھی تم میرے پاس ہوتی تھیں..... ہاں میں ہوتے ہوئے بھی موجود نہ تھا۔ تم مجھے مجھ سے چڑا کر لے گئیں میرے پاس کچھ نہ چھوڑا مجھے دل کی بے ایمانی اور اپنی دیوانگی کا احساس ہوا تو پہلی تو یقین تھیں آ یا کہ میں ایک یا پل کی منت کھٹ بدلتی رز کی کے شوق میں گرفتار ہو سکتا ہوں۔ جس کی پرچھا نہیں ہے بھی پرچھا اس کا اسیر ہو سکتا ہوں خود کو آ زمانے کے لیے اپنے جذبول کی آزمائش کے لیے میں از خود اتنا نام لگا کر کیا جب مجھے اپنے جذبول کی صداقت پر یقین کامل ہو گیا تو احساس ہوا میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہیں قدم قدم پر تمہاری خود داری اتنا سوائت کی تو یقین کی ہے تم نے خود کو بدل لیا اس سائے میں وصل نہیں میں نے جس میں ڈالنا چاہا بیٹھو تھا تمہاری محبت کا بولٹ ہے غرض مجھے بے انتہا محبت کا جس نے مجھے مجھے کھنڈی خود پسند بلکہ میں ہر کوئی جھٹکنے پر مجبور کر ڈالا۔“ وہ دھمکے سے سنا تھا تھی خوبصورت تھی اس کی نمی طنز و سخر سے پاک معطر دھکی ہوئی مشکل کے ہر سورگ رفتی اور خوشبوؤں کی بارش ہونے لگی۔ کچھ کل اس کے سر دھریگے نے رویوں پر رو رہی تھی اور اب اس کے مکتبے بازوؤں کے حصار میں اسے ڈھیر دل شرم رہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آتا آپ بدل کتے ہیں شاید یہ بھی کوئی ستانے کا نایا عذاب ہو اب اور بعد میں مجھ پر ہنسنے اور مٹھکی مارنے کا موقع مل جائے۔“ مشکل کے ذہن میں برقی رقار دی سے خیال آیا تھا اور وہ کسمکرا اس کے بازوؤں سے نکل آئی تھی۔

”تمہاری محبت نے مجھے بدل دیا ہے میں تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں“ اگر تم مجھے فون پر واپس لوٹ آئے کا نہ کہیں تو میرا بھرم ٹوٹ جاتا میرا ان بکھر جاتا اور خدا عمر تمام ہو جاتی میں لوٹ کر آئے والے دلائل تھا تمہارے بلا دے کو تمہاری محبت کے اظہار سے شرط سمجھا تھا تم نے بلا میں تو مطلب تمہاری غفلت کا اظہار تھا تمہارے بلا دے سے تمام راز ہیں ہوا کر ڈالی ہیں۔

”مجھے یقین نہیں آتا آپ اور مجھ سے محبت نہ ہو سکتا ہے بات۔“

”مجھے معلوم تھا تم اتنی آسانی سے مجھ پر یقین نہیں کر دو گی۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور اسے بھی کھینچ کر اپنے قریب زبردستی بیٹھا تھا۔

”محبوبوں میں خطائیں تو ہو جاتی ہیں
محبوبوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا“

وہ خوشی سے لگتا تھا۔

”تم نے درکار حال زار کیا اور میں نہیں کر سکتی ہوں۔ وہاں عشق ساٹھ گائیں ہیں۔ نہیں کہوں گا تم مجھے پہلی نظر میں اچھی لگتی اور میں تم پر فدا ہو بیٹھا ہوں ہرگز نہیں ہے پہلی نظر کا معاملہ۔ ہرگز نہ تھا۔ تم تو میرے دھیرے آئے۔ جیسا کہ اس نئی کی مانند میرے رگ دے دیں میں اتنی کیل جس سے چمکدار احاطات نامکن ہوتا ہے انسان زندگی کو ادا کر لگانے کو تیار ہوتا ہے اس سے بڑی کیل نہیں ہوتی۔ میرا اور تمہارا تعلق بھی کچھ ایسا ہی ہے۔“ اس کی آواز سرگوشی بن گئی چہرے پر بڑی دوکھ روشنی اس کی قربت سے اس کی الفت سے وہ ہچکچ رہی تھی مسد رہی تھی وہ حادی ہوتا جا رہا تھا۔

”تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی ہر گھڑی ہر ساعت بڑی کھنسن آواز ہائوں سے گزرا ہوں۔ اپنے آپ کو بڑی مشکلوں سے قابو کیا ہے۔ میری سبقت تمہارے حسن کی نگاہوں نے میرا صبر قرار ڈال دیا ہے مگر ہر بار اپنے ملازول جذبے کی بچائی کو دیکھنے کے لیے خود پر جبر و ستم کرتا رہا۔ یہ محسوس کرنے کے لیے کہ دونوں طرف محبت کا رنگ ایک سا ہے یا نہیں۔ اگر محبت ضرورت ہا یوں بن جائے تو اس میں باکس کی نہیں رہتی محبت ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے یہ سن کر میں جو چہرے اور اتر جائے۔ نہ ہی بھول ہے جو صبح کھلے اور شام کو سر جھائے جائے یہ وقت کے ساتھ ساتھ شدید سے شدید تر ہو جائے والا جذبہ ہے۔

میں نہیں ہمیشہ اپنے دل کے قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔ ”احیات“ آخری سانس تک یہ تمہاری قربتوں کا صلہ ہے جو آج ہم ایک ہیں میں نہیں اسی صورت میں دیکھ رہا ہوں جس میں دیکھنے کا خواہشمند تھا اب تم پہلے سے زیادہ خوبصورت اور دلکش ہو گئی ہو ان کی کدول کہتا ہے سنو کہ اب گلاب دیں گے گلاب لیں گے محبتوں میں کوئی خسار نہیں چلے گا۔“ وہ اس کے کانپنے ہاتھ کو ان کی آنکھوں سے لگا کر کھینچنے لگے۔

مشعل کی آنکھوں سے پھر آنسو اُٹھنے لگے تھے گریہ آنسو درد کے نہیں تھے تڑپ کے نہیں تھے دکھ کے نہیں تھے۔

”یہ آنسو تیرے دکھ کی آواز ہے۔“

”خمسندی دیکھ کر کیسے سوئے۔“
”میں..... بہت قیمتی آنسو خراج کر چکی ہوں اب کبھی یہ خزانہ نہ لٹا دے نہ دیکھوں۔“ اس نے بڑے پریم سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔

”فرمانی ڈے کوئے جی خالد زینہ! اصغر اور فرید بھی ابھی واپس آ رہی ہیں ان کے آنے کے کچھ عرصے بعد ہم ورلڈ ٹور پر چلیں گے ایک ایک جہل ایک ایک ساعت ایک ایک لمحے سے سرت و زندگی کشید کریں گے جتنی بے رنجی و بے اعتنائی کی آزیت نہیں دی ہے سب کا انداز کروں گا۔“ اس کا انداز پوری شدت لیے ہوئے تھا وہ کسمپاس کے بازوؤں سے لٹک آئی اور درد مٹ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کے اس انداز پر شاید وہ نہ سرت سے چمکتے چہرے پر یکدم ہی تاریک سایہ لہرا اٹھا تھا وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔

”کیا تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟“ کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوا۔

”یہ بات نہیں ہے مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے بہت عرصے قبل میں ایسی تکلیف دہ باتوں کو بھول چکی تھی۔ ایک مسئلہ ہے جس نے مجھے از حد فکر مند و پریشان کر رکھا ہے۔“
”کیا ہوا ہے جو مجھ پر ایسا ہے مجھ سے شہر کر گئی ہو۔“

”پہلے مجھے بابا کی تنہائی کی فکر تھی اب میں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہوں بابا اور ماما۔ بابا تنہا ہیں اور ماما بھی فی الحال تو فرح آئی کی موجودگی کی وجہ سے تنہا تو ہیں میں مکمل وہ بھی تنہا ہو جاؤں گی۔“ کیونکہ منصور انکل ساؤتھ افریقہ میں سیٹل ہو چکے ہیں ان کا بڑا بیٹا وہاں کامیابی سے چل رہا ہے وہ یہاں صرف فرح آئی کی گونا گئے کی وجہ سے رہے ہوئے ہیں ان کی کاروائی رتنی رتنی ہو کر ابھی آئی کی کاروائی دور میں ہوئی ہے لیکن کب تک؟ بہت جلد ان کا ہتھیار ڈال دیا جائے گا۔ عورت مرے سے شہر توڑ گئی ہے مگر بیوی خاوند کو نہیں چھوڑ سکتی ان کی منزل وہی ہیں پھر وہ ان کے ساتھ چلی جائیں گی اور ساتھ ماما بھی لے کر جانا چاہیں گی کیونکہ تنہا کے صورت انہیں نہیں چھوڑ کر جائیں گی اور میں ماما کی طبیعت کو کبھی طرح جان چکی ہوں وہ جس قدر ریوت ہیں اتنی ہی خود دار و غیور ہیں وہ ان کے ساتھ ہیں نہیں جائیں گی اور نہ ہی اس بات پر راضی ہوں گی کہ ہمارے ساتھ رہے لیکن اور اس طرح رشتوں میں توازن نہیں رہے گا۔ اور ہوت ہوئے کے بعد میں نے یہ ترکیب سوچی ہے۔“

وہ کچھ ہچکچ کر چپ ہو گئی تھی۔
”ہاں! اب کوڑک بھول گئی؟“ وہ ہر مرن گوش تھا۔

”میں نے سوچا ہے کہ بابا بھی تنہا ہیں اور ماما بھی تنہا ہیں کیوں نہ نہیں میرا مطلب ہے ان کی میرنج ہو جائے تو ان کی تنہائی دور ہو جائے گی دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا مل جائے گا آئی کی بھی سکون سے منصور انکل کے ساتھ رہ سکیں گی اور سب سے بہتر یہ ہوگا کہ میں سے لگے ہو جاؤں گی ورنہ ان دونوں کا خیال مجھے سرقتوں میں رنجیدہ کرے گا میں جانے کے باوجود جس ذرا پاؤں کی“ ایسی بات کہہ کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

”گڈ ویر! گڈ لٹفنا سبک! عید ایسا ہے پھر وہ دونوں ہی اور اور انہیں لگتے ان کی کل سوار اور ورنہ فرس ہوگا۔“ اس نے کھلے دل سے اس کی تجویز کو سراہا تو اس کے چہرے پر بڑی انوکھی روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آ کر پر جوش لگے میں چلی۔

”میرا آئیڈیل اچھا ہے نا اس طرح ہم سب کے مسائل حل ہو جائیں گے ہمارا خاندان ایک ہو جائے گا۔“
”یہ پروپوزل لے کر ان جانے گا؟“

”میں بابا پر راضی کروں گی مجھے یقین ہے وہ کچھ نام نہ نہیں لے کر میں اسے طے پتے سے انہیں رضامند کر کے ہی رہوں گی اور آپ آئی کو پہلے ساتھ ملا لیں پھر دونوں ل کر ماما کو راضی کریں۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر نام نہ نہیں ہے۔“ وہ از حد خوش تھی۔

”اوکے..... مجھ کو کام ہو گیا تمہارا میکہ ایک گھر میں مٹ گیا ہے ان کی تنہائیاں قربتوں میں بدل جائیں گی اب مجھ غریب کی تنہائی کا بھی خیال کرو نہیں سب کی فکر ہے مجھ پر بھاری نگاہیں جانی؟ مجھ پر نہیں آتا؟“
اس نے خوشی سے کہتے ہوئے مشعل کی طرف قدم بڑھا دیا تھا اس نے شرمناک کردن جھکا دی تھی۔





فیو سٹوڈنٹ لائبریری
ہسپتال روڈ صادق آباد
وٹ کتب کے اوپر لکھنا منع ہے۔ کتاب ہائی
۴۹۹ اس عراب ہو ورنہ کتاب کی قیمت
ہستہ جلد کرناہ وصول کیا جائیگا
لون نمبر 74367

عفت سحر پاشا

کہا اس نے مناسب ہے محبت کا سفر کرو
کہا میں نے تمہیں چاہا مری چاہت آمر کرو
کہا اس نے محبت کا سفر کرنا ضروری ہے؟
کہا میں نے ضروری ہے ذرا سی اک نظر کرو

میں بچھلے ڈیزہ کھنے سے عمر کو اپنا ہنسی الضمیر
سجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی موٹی عقل میں
میری باتیں نہیں ساری تھیں۔ وہ بدستور ایک نئی بات پر
آڑا ہوا تھا اور مجھے اسی بات پر زیادہ غصہ رہا تھا کہ وہ اپنی
بات کو درست بھی سمجھ رہا تھا میں نے بہت آکٹا کر اسے
بکواس بند کرنے کو کہا تو وہ میرے غصے پر توجہ دے بغیر
یونہی مجھے قائل کرنے کے انداز میں بولا۔
”تم اگر اپنی جذبائیت کو ایک سائینڈ پر رکھ کر سوچو
گے تو تمہیں احساس ہوگا کہ تم ایک بے وفائے فیصلے پر عمل
درآمد کرنے سے متعلق سوچ رہے ہو۔ اگر تو کروں کے
سر پر بچوں کی قابل اعتماد پرورش ہونے لگے تو بیویوں
سے آکٹائے ہوئے شوہر حضرات کیلئے فرصت میں
بیویوں کو قانع کر کے نوکر رکھ لیں۔“
”اب اگر تم نے ایک لفظ بھی مزید کہا تو میں اس
ائش ٹرے سے تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔“ میں نے ایٹش
میں دھنکی ہیں۔“

”اوکے میں کہ دوں گا۔“ وہ قدرے مطمئن ہوا تھا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”اتنے اچھے فیصلے کے بعد تو تم پر بھروسہ کیا ہے۔“

حالانکہ اس فیصلے کے بعد میرے دل و دماغ کثیف ہو رہے تھے مگر میں اپنے بوجھل پن سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ کھڑا ہوا۔ میں جانتا تھا کہ تباہی پھر سے اپنا فیصلہ تبدیل کر دے گی۔

”تمہیں ہر بات میں کھانا ہی سوجھتا ہے۔“ میں نے طنز کیا اور ہنسنے لگا۔

”رات کو نینا آ پا کی طرف سے بھی ڈر کا انویٹیشن تھا۔ تمہارے مان جانے کی صورت میں اب وہ بھی پکا ہے۔“

دل میں اٹھتے طوفان کو دبانے میں بظاہر بہت مسکرتا ہوا ہوں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ نصف بھائی آج کل کیسے کی گئی ہیں اس لیے عمر آوارہ گردیوں کے لیے بالکل فارغ تھا۔

میری رضامندی بات ہی نینا آ پانے کو چار اچ کے جن کی ہی پھرتی دکھائی فقط ذرا بڑھ گئے ہیں میں انہوں نے اپنی دولت میں ایک بہترین ٹی وی ڈسٹو بندھی تھی۔ میری فرمائش کے مطابق ٹی وی کی اس مینجی کو اولیت دی گئی تھی کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ٹی وی فقط ماں باپ کے دباؤ میں آ کر شادی کے لیے رضامند ہو۔

کسی بھی شوق شراپے اور ہنگامے کے بغیر چند معززین کی موجودگی میں بہت سادگی کے ساتھ کھانا کھا کر فرینڈز اور اہل گھر کی حق میری مرضی کے مطابق دس لاکھ روپے کھانا کھانا تھا۔ پھر کوئی خوش اور مطمئن تھا کہ میرے اندر ایک اچھل پھل پھٹی ہوئی تھی۔ چاہے کسی کو یاد ہو یا نہیں مگر مجھے بہت اچھی طرح یاد تھا کہ آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے اسی تاریخ کو شہلا میری عروسی بن کر میری زندگی میں داخل ہوئی تھی۔

میں بے اعزازہ خوش تھا۔ تب چڑیا میں ایک شوریدہ سری کی تھی ایک بے تابی کی تھی کہ کب دوست

جاتے ہیں میں جن کرسس میں گھر نے دلا تھا وہ میں بھی بخوبی جانتا تھا مگر شہلا سے بے وفائی کا خیال مجھے بچوں کی طرف دیکھنے ہی نہیں دیتا تھا۔ پانچ سال کی رفاقت میں وہ میری بیوی کے زیادہ بوجہ پر رہی تھی۔ اس کی ایک ایک ادب جان دار تھا اور اب جب کہ وہ مجھ پر جان دار کی تھی تو زندگی مجھے اس موڑ پر لے آئی تھی کہ اس سے بے وفائی کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا مگر اتنی کی دیر میں میں بہت کچھ سوچ چکا تھا جو شاید پچھلے تمام دنوں میں سب کے سمجھانے کے نتیجے میں میرے خاندان لاشعور میں پلان کی صورت میں ہوتا رہا تھا اب جب کہ میں مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق زور کا یہ ٹھونٹ پینے پر راضی ہوا تھا تو ایک دم سے تمام لاکھ لاکھ لاکھ تیرپ

پاکیا۔ ”اوکے۔“ گہری سانس لے کر بہت بوجھل انداز میں میں نے سر نہڑ دیا تو عمر نے جوش میں آ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دیا۔

”نیا درگت تیری۔۔۔۔۔ مجھے تم سے ایسے ہی فیصلے کی توقع تھی۔ میں جانتا تھا کہ شہلا بھائی سے محبت اپنی جگہ مکہ بچوں میں بھی تمہاری جان بند ہے۔“

”مگر اس کے لیے میری کچھ میمانڈ رہی ہیں۔“ میں نے حد تک سچی بات بولا تو اس نے مجھے حوصلہ دینے والا انداز اپنایا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ ”لو کی کہیں کسی غریب گھرانے سے ہونا چاہیے۔ آئی کی یہ میرے لکڑی بڑس کے لیے خواب ہو۔“ میں نے کہا تو وہ تھیرے سمجھے سمجھے لگا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“ ”بس تم میری میمانڈ نینا آ پانے سے ضرور کہو۔ میں اس کے علاوہ مجھے کسی بھی چیز سے غرض نہیں۔ مجھے بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی عورت کی ضرورت ہے تاکہ کسی باؤل گرل کی۔ ایڈز آئی تھیں کہ ایسی لڑکیاں بڈل یا لوزر کلاس ہی میں دستیاب ہوتی ہیں۔“

شہلا انہیں ملازموں کے ہاتھوں میں مت دینا کیوں نہ وہ بچوں کی تربیت بھی اپنے ذہنی رجحان کے مطابق کریں گے۔ جب کہ تمہارے بچوں کو ایک ماں کی ضرورت ہے سمجھو۔ صرف ایک ماں کی جودن رات ان کی دیکھ بھال کرنے ان کی ضروریات پوری کرے۔ جس کی توجہ پر ایل ائی کے لیے ہو۔“

دو دیر اجگر ہی پارتھاس کی اور میری دوست انوٹ تھی۔ میں اس کی بے غرض اور بے لوث دوستی کا مستحق بھی تھا۔ اب بھی وہ نہایت عاجزی سے بولا تو میں اس نے دیکھنے لگا۔

”تم جانتے ہو عمر سگی ماں ہی اصل ماں ہوتی ہے۔ تم فقط خیالی باتیں کر رہے ہو۔“ میں اگر چاہ بھی ماں نہیں تھا کہ وہ میری اچھی ہی توجہ پر ہی بچوں کو میرے پاس لے بیٹھا۔

”کہاں لکھا ہے بار سگی ماں میں اپنے بچوں کے ساتھ ایسا ایسا سلوک کرتی ہیں کہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔“

”میں اس سارے مسئلے کو اچھی طرح سمجھتا ہوں مگر۔۔۔۔۔ میرے بات مکمل کرنے سے پہلے یہ وہ مجھے ٹوک گیا۔

”کسی بھی فیصلے سے پہلے یہ یاد رکھنا کہ تمہاری ساس صاحبہ تمہارے شادی نہ کرنے کی صورت میں دونوں بچوں کو اپنے ساتھ ناروے لے جانے کا اپنی میسر ہے چکا ہیں۔“

”وہ میرے بیٹے ہیں۔ نذر و نیاز نہیں جو میں بانٹا پھروں۔“ میں سکا تو اس نے کہا۔

”تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ نینا آ پانے کے جانے کے بعد تم کیا کرو گے تو آج کے بعد میں سچی تم سے اس ٹاپک پر بات نہیں کروں گا۔“

کتنی ہی دیر میں خاموش بیٹھا رہا تھا اور وہ اتنی د نہایت میرے سر سے فیصلے کا انتظار کرتا رہا۔

اس کی ایک ایک بات دست تھی۔ نینا آ پانے کے

”کھینچ پوسٹر لبرل۔۔۔۔۔ اگر گھر میں فقط ایک بیس سال کا مرد رہتا ہو تو پھر وہ اپنے ہی گھر میں رہتی ہیں۔“ اس کے طنز سے جتانے پر میں اسے ٹھورنے لگا تو وہ بے حد تنگی سے بولا۔

”شہلا تم جتنے چاہے بڑے روزدار نماز میں میری باتوں کی نفی کرو مگر میں جانتا ہوں کہ تم بھی ان باتوں کو سمجھتے ہو۔ شہلا بھائی سے محبت اپنی جگہ میرے ایک اہل حقیقت ہے مگر نے والوں کے ساتھ مائیں جاسکا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ غنا آ پانے جانے میں صرف دو ہفتے رہ گئے ہیں۔ یہ جو تمہاری بے فکری ہے سب اڑن چھو ہو جانے لے۔ ابھی تو بچوں کو انہوں نے سنبھال رکھا ہے اس لیے کیا کرو گے؟ سعد کو تو سنبھال لیو گے مگر رات کے وقت تباہ کو سنبھالنا اور فقط ڈھانکی ماوی پکی کو سنبھالنا اس قدر مشکل کام ہے۔ یہ شاید تم نے سمجھ سچا چاہی نہیں ہے۔“

”میں شہلا سے بے وفائی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہم ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے یہ سب جانتے ہیں۔ اس نے مجھے اولاد دینے سے نوازا میری بی اولاد کو قسم دیتے ہوئے بھی دیکھ چکے ہیں اس سے بے وفائی کی جان؟“ ”میرے بچے جس کی سگنے کی تو وہ بھی اتنی قدر غصے سے بولا۔

”بی پر ٹیکل شہلا۔ شہلا بھائی سے تمہاری محبت بچوں کی پرورش میں اگر مدد سے سکتی ہے تو تم بھلا شوق یوکی ساری عمر گزار دو۔“

اور یہ سب تو مجھے سب نے شہلا کے جالیوں کے اگلے روز ہی سے سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ شروع شروع میں تو میں اس قدر شش میں آ کر اپنے چنے چلانے لگا کہ مگر اب جوں جوں نینا آ پانے کا دہس جرتی جانے کے دن قریب آ رہے تھے میری فکر میں بھی زور پکڑنے لگی تھیں مگر میرے دل و دماغ نے اس فیصلے کو بھرا کھی قبول نہیں کیا تھا۔ ”اگر تمہیں اپنے بچوں سے ذرا بھی محبت ہے تو پلینز

جان چھوڑیں اور میں اس کے مقابل پہنچوں اور آج.....

”کب سے چاری رات سا کیٹھی ہے۔ میں دودھ رکھنے تو نہ دیکھا کہ دن موجود اور دلہا غائب ہے۔“

میں ان کی طرف پلٹ کر تیز لپکے میں بولا۔
”کیا مطلب.....؟ وہ میرے بیٹرم میں کمری ہے۔ اسے تو بچوں کے درم میں ہونا چاہئے۔“
میرے لب و لہجے پر وہ ششدری مجھے دیکھنے لگیں پھر جیسے کھنکھاندا ہوا آواز میں بولیں۔
”دراغ تو ٹھیک ہے تمہارا وہ بیوی ہے تمہاری۔“

ان کے اس طرح سے جملانے پر میری کپٹیاں شلگ اٹھیں۔ پہلے یہ سب لوگ مجھے ہر وقت اپنی احساس دلانے پر کمر بستہ رہتے تھے کہ میرے بچوں کو ایک اس کی ضرورت ہے اور جب کہ میں نے دل کو مارا ان کی یہ فرمائش پوری کر دی تھی تو اسے میرے بیٹرم میں بٹھا کر کہا چارہ تھا کہ وہ میری بیوی ہے۔
”ہائیں بوا آپ مجھے بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی کی ضرورت تھی تاکہ اپنے لیے بیوی نہ ملے۔ وہ جس فرض کو نبانے کے لیے آئی ہے اسے دے دی جائے دیں۔“
میرا یہ انداز آپا کے لیے بہت غیر متوقع تھا سی لیے وہ گڑبڑائیں۔
”آہستہ بولو وہ ساتھ ہی بیٹھی ہے۔“
”سو اد.....؟“ میں چھلایا بوا سی لب و لہجے اور زور دم کے ساتھ بول رہا تھا۔ ”اسے خود غلط ہونا چاہئے کہ مجھے بیوی کی نہیں بلکہ بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی کی ضرورت ہے۔ یہ کام میں کسی کو کرنا بھی کرواسکا تھا لیکن اس مقصد کے لیے اسے بیاہ کر لایا گیا ہے کہ وہ دن رات میرے بچوں کی دیکھ بھال کرے اور اس لیے میں آپ سے کسی غریب گھرانے کی لڑکی کی بات نہ کر۔ وہ بچے کی میری پاس کی نہیں گھر بنے گاڑی ہے اس کی ہر خواہش پوری ہوئی مگر اسے میرے بچوں کو بھر پور توجہ دینی ہوگی۔“

”یہ کیا بکواس ہے شیریں؟“ آپا صدمے کا شکار تھیں۔ ”میں تو بے جبری میں ہی اس معصوم کی زندگی برباد کر بیٹھی۔ مجھے تمہارے ان بیروزہ خیالات کا علم ہوتا تو میں کبھی بھی یہ شادی نہ ہونے دیتی۔ چاروں بچوں کو سنبھالنا دیتا تو خود بخود مختل ٹھکانے کا جانی تمہاری۔ ان کی آواز تجھ کی تو میں زنج آ گیا۔“
”آپا! میں تجھ پر کیا ہے آپ جانتی ہیں کہ میں شہلا سے کسی صورت میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔“
آپا رونا بھول کر تھیرے مجھ کو دیکھنے لگیں۔
”ایک مرے ہوئے انسان کے پیچھے تم ایک زندہ انسان کو جیتے جاگتے مار رہے ہو؟“
میں نے اسی طرح اٹھائی سے کہا۔
”اگر وہ شادی پر رضامند ہوتی ہے تو یقیناً جاتی ہوگی کہ اسے یہاں دو بچوں کو سنبھالنا ہے۔ اس نے مہربان کچھ سوچ کر ہی کہہ دیا تو کیا ہوگا۔ اور پھر وہ جس حال میں آئی ہے وہاں اس نے اپنی سب کچھ اور پیش و آرام دے رکھا ہوگا۔ آپ خود دیکھ لیجئے گا کہ وہ ان سب فکروں سے کتنا مطمئن ہوتی ہے۔“

”بکواس نہیں کرو شرام۔“ انہوں نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ ”تم گھر میں فل نام کا ملازمہ نہیں لائے۔ تمہاری بیوی سے وہ۔“
”آپ کا جو کام تھا وہ آپ نے کر دیا۔ اب آپ بے فکر ہو جائیں میں خود ساری ایڈمنسٹریشن کروں گا۔“ میں نے ان کے شتانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے رساں سے کہا تو انہوں نے میرا ہاتھ تھمک دیا۔
”بات بھی مت کرنا میرے ساتھ۔ بہت گھٹیا پن دکھا رہے ہو۔“
”میں بالکل ٹھیک کر رہا ہوں آپا۔ شہلا کی جگہ کوئی نہیں بگاڑ سکتا۔“ میں نے تنبیہ کی گے کہا تو دل میں ایک ٹیس بھی اٹھی کہ شروعات تو میں کر ہی چکا تھا۔
”کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا شیریں۔ ہر ایک کا اپنا مقام ہوتا ہے اور اگر تم محبت کی بات کرتے ہو تو وہ تو

ساتھ چلتے رہنے سے ایک دوسرے کا احساس کرنے سے ہو ہی جاتی ہے۔“ انہوں نے مجھے قائل کرنے کی آخری کوشش بھی کر لی مگر میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”میں تو اس معصوم کو مت دکھانے کے لائق بھی نہیں رہی۔ خدا ہی ہے جو مجھے معاف کرے۔ وہ ایک عظیم ذمہ داری تمہارے کے لیے اس گھر میں آئی ہے مگر کرتے اس کا مقام بہت غلط رکھا ہے۔ میں نے اس کا بہت حوصلہ بوجھا تھا۔ اب خدا ہی سے مجھے معاف کرنے کا حق ایک ہے کہ انکا اور معصوم پر غم ظلم کرنے سے جلے۔“
وہ بھرائے ہوئے لپکے میں جاتی پھر کر تھیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کمری سانس لے کر خود کو کمری پر کر دیا۔

ذاتی پرانگیں اپنی جگہ مگر آپا سے یہ جنگ جیت کر میں خود بہت راکا چھٹا محسوس کر رہا تھا۔
تھالی پاتے ہی ایک مرتبہ پھر شہلا کی یاد پوری شدت سے میری سوچوں پر حاوی ہوئی۔ میں نے خود کو اس کی تصویرانی انہوں میں چھپایا اور سسکی اٹھ لیں۔
”موندیں۔“
دیسے کی تقریب بھی ہے جد سادگی سے ذرا رنگ دم ہی میں نہٹ گئی۔ اس سے اگلے روز آپا کی جڑنی کے لیے فلائٹ تھی۔ وہ سامان سمیت کپچوں سمیت جانے کو تیار تھیں۔
”شرام! بے وفائی مت کرنا رات بہت اچھی لڑکی ہے۔ عازر بکواس سے بہت مختلف ہے۔ اسے اس سمت کرنا لائق خیالات اور مفرضات کے نکلنے سے نکل کر دیکھو اسے رکھو۔ اسے اپنی بیوی سمجھو کہ تو ہی وہ تمہارے بچوں کی بہترین ماں بن کے دکھائے گی کہ وہ تو تو کمری کی بچوں کو تو جدہ سے کہتے ہیں۔ اسے کوئی مان تو وہ ملازم تو سمجھو۔ وہ تو بچے دے کر باتا میں خریدی جاسکتی۔ ہر کوئی کہنے کو تائیں بیٹھا ہوتا۔“
ڈیپا چار میں جانے تک وہ بھی آواز میں مجھے سمجھاتی رہی تھیں۔

”تم یہاں ہو شیریں اور میں تمہیں وہاں سارے گھر میں ڈھونڈ رہی ہوں۔“
”معدودا شہلا کہاں ہیں؟“ میں نے ان کی توجہ ثنائی چاہی۔
”وہ تو کب سے سو بھی چکے۔“ انہوں نے بہت اطمینان سے کہا اور پھر مجھے کہنے لگیں۔ ”اور تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔“
”خوشا ہے بیٹرم میں چلو۔“
میں کمری سانس لے کر اٹھا مگر ابھی میرا ہاتھ دروازے کی تاب پر ہی تھا کہ ان کا اٹھا جملہ میرے قدم

”آپا تو بس جیتش کی جذباتی ہیں بھلا لڑکی ہوگی جو اتنے عیش و آرام کو چھوڑ کر دوسری فضولیات پر دھیان دے گی۔ یہ سب روپے کا کمال ہے۔“ میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے بے پروائی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے رائیو کو دیکھا تھا۔ تیس چوبیس سال کی اچھی شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ بظاہر تو مجھے اس میں کوئی خاص نظر نہیں آتی تھی کہ وہ مجھ جیسے شادی شدہ دو بچوں کے باپ سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاتی تو پھر یہ بالکل سامنے کی بات کی کہ میرا دو بیٹا اور اپنی کلکٹریز ہی اس کے اس فیصلے کا سبب تھیں۔ اس کے گھر والوں سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی اس کے والد رفیق احمد ایک پرائیوٹ فرم میں نچلی پوسٹ پر چاب کرتے تھے۔ رائیو کے علاوہ اس کی چار بیٹیاں تھیں رائیو سب میں بڑی تھی۔ اپنی معمولی تنخواہ میں رفیق احمد مشکل اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے تھے۔

چونکہ رائیو نے گتے کھلا تو میں گاڑی پورچ تک لے آیا۔ میں اندر داخل ہوا تو سعد دوڑتا ہوا ڈائریکٹر کی ناگوں سے لپٹ گیا۔ چار سالہ سعد کو میں نے جھک کر اٹھاتے ہوئے اچھالا اور پھر بائیں میں بھریا مکروہ منہ بسورتے ہوئے چہرہ میری کروں میں گھسیڑتے ہوئے بولے۔

”پاپا! یہ کتنی گندی ہے۔ کون ہے؟“

اس کے اس طرح کہنے پر میں نے دیکھا اس کے پیچھے رائیو ہاتھ میں چلتا تھا شاید اس کے کھیلنے کے پتھر تھیں۔

”بہت بری بات ہے سعد بڑوں سے یوں بات کرتے ہیں؟“ میں نے فوراً سعد کو سرزنش کی تو وہ معصومیت سے بولا۔

”سوری پاپا۔۔۔“

میں اسے لیے صوفے میں دھنس گیا۔ رائیو پلیٹ سینئر ٹیبل پر رکھ کر اندر چلی گئی تو میں نے دیکھا اس میں چاکلیٹ کسٹڑ تھا۔ میں سعد کی طرف متوجہ ہوا جو بڑے مہن انداز میں میری ریسٹ وائچ سے کھیل رہا تھا۔

”سعد! یہ کسٹڑ اچھا نہیں ہے کیا؟“

”تو چھوڑے پاپا۔۔۔“

”تو پھر کھالیں نہیں رہے؟“

”میں ماما کے ہاتھ سے کھاؤں گا۔“ وہ اطمینان سے بولا تو میں بے اطمینان ہونے لگا۔ میں نے اس کے بالوں کو چومتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”مگر بیٹا! ماما کی بات نہیں ہے نا۔“

”ماما کب نہیں گے؟“

”آج ماما کی میری جان۔“

”کوئی نہیں آئی بھی یہی کہتی تھیں۔“ وہ تدریسے خفا ہوا تو میں بے بسی ہونے لگا۔ ابھی تو میں شال کی غیر موجودگی کا غامدی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو پھر چوتیس گھنٹے اس کے سر کا تھکا رہا تھا۔

”اگر میں یہ کسٹڑ کھاؤں تو ماما آج ماما کی؟“ وہ اپنی سیاہ ذہن آنکھیں میرے چہرے پر جمائے ہوئے چہرہ رہا تھا۔ اس کے انداز پر مجھے پھر سے ماضی کی یاد سامانے لگی۔ یونیٹک ایک بار سعد! نے سیدھے سوال کر کے شال کو زنج کیے جا رہا تھا تو اس نے ٹھک آ کر سعد کو ڈانٹ دیا۔ میرے سچ کرنے پر وہ بولی۔

”ایمان! سے شہرام! اتنے سوال کرتا ہے کہ میں عاجز آ جاتی ہوں۔“

”یہ بھی بچوں کی ذہانت کی نشانی ہے۔ چاہے یہ سو سوال پوچھتے نہیں ضرور جواب دینے چاہئیں۔“ میری تسلی پر وہ پیچھے گھومنے لگی تھی مگر اسی رات والٹڈ لائف سے شائق ایک فلم دیکھتے ہوئے جب سعد میری گود میں تھا اور ہم بہت مگن ہو کر لڑکھچکے تھے۔

”پاپا یہ کیا ہے؟“ سعد نے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ایکٹ ہے۔“

”یہ کیا کر رہا ہے؟“

”یاد رہا ہے میری جان۔“

”پاپ! یہ دوڑتا کیوں نہیں ہے؟“ سعد کا ایک

ادرسوال تیار تھا۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”خاموشی سے فلم دیکھو سعد۔“

چند منٹ تک سکون فلم دیکھنے کے بعد وہ پھر سے اپنا سوال تیار کر لیا۔

”پاپا یہ کیا ہے؟“

”یہ شال پھر سے بیٹا۔“

”یہ آڑا کیوں نہیں ہے؟“

”کیوں کہ اس کے پڑ نہیں ہوتے۔“ میں نے جھل سے کہا تو وہ دھیمی سے بولا۔

”کیوں نہیں ہوتے؟“

میں گہری سانس لے کر بے بسی سے شال کو دیکھنے لگا جو میری حالت پر بس رہی تھی۔ جبر تھانے والے انداز میں بولی۔

”اگر یہ سو سوال بھی پوچھتے تو تمہیں جواب دینے ہوں گے۔ یہ تمہارے لٹ جھک کر ذہانت کا معاملہ ہے۔“ اور میں بے اختیار دیا رہا تھا۔ سعد کی آواز مجھے حال میں پہنچ لائی۔

”پاپا! یہ کیوں ہے؟“ وہ بہت مشکل سوال پوچھ رہا تھا جس کا جواب دیتے ہوئے میرا دل جیسے ٹپٹپٹ کی گرفت میں آ گیا۔

”یہ۔۔۔ یہ تمہاری ماما ہے۔“

”نہیں تو۔۔۔ اس نے پڑ کر انداز میں سر کو دائیں بائیں ہلایا تھا۔“ ماما یہ تھوڑی ہیں۔“

”میں کہہ رہا ہوں۔ یہ ماما ہے۔“

”صوبت ماما کی تصویریں تو ہمارے بیڈروم میں لگی ہیں۔“ وہ بے حد بے اعتماد بچہ تھا اور اسے سمجھنا نا ممکن تھا۔

”تھا۔ یہ بھی میں جانتا تھا۔“

”یہ تمہاری دوسری ماما ہیں۔“

”میری ماما کہاں ہیں؟“ وہ کہہ رہی تھیں کہ گڑیا کو لے کر آج ماما کی۔“ اس کے معصومانہ سوال میرے اندر آگ لگا رہے تھے۔

”وہ بھی آج ماما کی مگر بیٹا پہلے آپ کو اس والی ماما سے دوستی کرنا پڑے گی۔“ میں اسے تو سمجھا رہا تھا مگر خود کو سمجھا نایک بہت دقت طلب کام محسوس ہوتا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا سب کچھ چھوڑ کر کہیں دیرانے میں نکل جاؤں۔

”پاپا!۔۔۔ میں بھی ماما کے پاس جاؤں گا۔“

اس نے کہا تو میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں نے اسے چوم لیا۔

”نہیں میری جان۔ ماما خود آئے گی یہاں۔“ میں نے اسے بہلایا چار سال کا دھیان بنانے لگا۔ شال کہاں ہے؟

”اسے ماما نے سٹلا دیا ہے۔“

”بہنا اچھی ہے نا؟“ میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا۔

”لیکن وہ گندی بھی ہے پاپا روتی ہے۔“

”نیچھے اس کے انداز پر بے اختیار بیٹا گیا۔ یہی نیچھے دیکھتے کا بہانہ بن جاتے ہیں۔“

”وہ میرے ٹائزر کے ساتھ جلتی بھی نہیں ہے۔“ سعد نے شکاری انداز میں کہا تو میں نے اسے سمجھایا۔

”ابھی تو بہنا چھوٹی ہے بیٹا۔“ پھر میں نے پوچھا۔

”یہ سو روک کیا ہے پاپا؟“

اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”کیوں نہیں کیا؟“

”ماما نہیں اور آتی بھی نہیں ہیں۔“ وہ بھیدگی سے بولا تو میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”میں ہوں نا میری جان۔ میں اپنے بیٹے کو خود پڑھاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو گیا تو میں نے کسٹڑ والی پلیٹ اٹھائی۔

”پلو! یہ کسٹڑ دھکم کھوکھ۔“

سعد نے اب اسے کسٹڑ کھا لیا تھا۔

”کھانا گنایا ہے میں نے نہیں پڑ لگا دیا ہے۔“ وہ شاکا فیزر ہاتھ میں تھا سے ذرا کی ذرا ڈنگ کر بولی اور پھر

تھی۔ ثنائی خاموشی سے اپنی پرام میں لیٹتی تھی مگر سعد اور رائے کے درمیان کوئی کھٹ پھٹ نہ ہوتی تھی۔
 ”کیا بات ہے سعد؟“ میں تشویش سے کہتا کرسی
 گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گیا تو رائے قدرے جھلا کر
 بولی۔

”آج اسکول نہیں جانا چاہا رہا۔“ اس کی براہ راست میرے ساتھ پہلی کھینچوٹی میں اچھتی نگاہ اس پر ڈالنا سحر کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیوں بیٹا..... اسکول کیوں نہیں جانا؟“

”بابا! میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ دم بسور کر بولا تھا۔

”مکرتھتے بچے تو اسکول جاتے ہیں۔“ میں نے اسے بھلا یا مکر وہ راسخی نہیں ہوا تھا۔

”مکرتھیا کیوں نہیں جانا؟“

”بابا! اچھا نہیں لگتا۔“ وہ یوں بولا جیسے میں اسے جھٹی کر دیاں لوں گا۔ میں نے اپنا رخ راسخ کی طرف کیا

جواب میں نافذ دوسرے ہی گئی۔
 ”کاؤس یور یوٹی پیوں کے تمام معاملات تمہیں
 دیکھنے ہیں۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم انہیں کیسے
 پینڈل کرتی ہو۔“ وہ میری تقریر کے دوران بے تاثر
 چہرے کے ساتھ شاہ کے ساتھ مصروف رہی۔ سعد کا
 رونے کا پکا پکا دمکراں دیکھ کر مجھے اسے پہنچی کی اجازت
 دینی پڑی۔ میں خاموشی سے اپنے لیے کپ کا شل
 چاہنے لگی تھی۔
 اگلے چند روز میرے لیے کافی اطمینان بخش تھے۔
 سعد اب رائے سے بہت حد تک فری ہو چکا تھا۔ میں

آفس سے آیا تو بی دلاؤ کچھ میں وہ بیٹھا رائے سے پڑھا رہا تھا۔ میرے دل میں اطمینان بھر گیا۔
 ”السلام علیکم یابا۔“ مجھے دیکھتے ہی سعد نے سلام کیا تو مجھے بہت خوش کن حیرانی نہ گھیر لیا۔ میں نے دوڑ محبت سے اسے خود سے لپٹا لیا۔
 ”وعلیکم السلام میری جان..... کیا ہو رہا ہے؟“
 ”میں ہوم ورک کر رہا ہوں یابا۔ پھر اس کے بعد ماں

”آئی ایم سوری۔ میں ذرا شک کو دیکھ لوں۔“ وہ
پُر سکون انداز میں کہتی کتاب نیل پر رکھ کر چلی گئی تو میں
چند سیکنڈ تک اسی پوزیشن میں بیٹھا رہ گیا۔ اس کا یہ رویہ
اور انداز میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

نی وی دیکھتے ہوئے میں نے ایک نضر امل کا لاکر
ڈالی جہاں سویاں پونے دس بھاری تھیں اور ابھی تک
میں بھوکا بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے زیادہ سے زیادہ سو
نو بجے تک میں کھانے سے فارغ ہو چکا ہوتا تھا۔ بھوک
کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے میں نی وی آف کر کے
اٹھا تو سیدھا رانہ کے پتھروں کی طرف گیا۔ دروازہ
کھٹکھٹانے پر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے
تاب گھما کر دروازہ کھولا ناٹ بلب کی روشنی میں وہ مجھے
بجوں کے ساتھ خوش خواب دکھائی دی۔ لب بچنے ہوئے
میں نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے غصے کو دبا تا جہن میں
آ گیا۔ اس تک میں بڑے بہتوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا
کہ وہ خود کھانا کھا کر سوئی تھی۔ غصے میں اس سیدھا کھانا
گرم کر کے کھا دیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ خالی بستر
دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ سعیدؒ نے رانہ کے پیٹنے سے تائب
دیکھ کر اس کی عادت سی ہو گئی تھی اس لیے پیٹنے آتے تھے
بھی ایک ہی رنگا۔ سو تے ہوئے بھی میں نے یہی سوچا

”میرے کپڑے کہاں ہیں؟“ میرے تیز لہجے پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔ پھر بہت عام سے انداز میں بولی۔

”تھیں نہیں۔“
”تھیں..... تمہیں کیوں پتہ نہیں؟“ مجھے اس کے انداز پر شدید غصہ آٹھان۔ ”میری داؤد روپ کا حال دیکھا ہے تم نے؟“ ایک بھی پڑا“ ٹھکانے کے پر نہیں ہے۔“
”میری بات کن کر لفظ در لفظ خاموشی سے سعد کی طرف دیکھتی رہی جو میرے تیرے لیے سے خائف سا ہو گیا تھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کمال رساتنی سے بولی۔
”میں صرف بچوں کی گورنری ہوں۔“
اس کی بات میں جتنا کہ کو بہت کچھ تھا۔ اول رات کو نینا آئی ہے بولا گیا تمام مکالمہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔
”تم اس گھر میں ایک حیثیت سے رہتی ہو۔“ میں بے شکل اپنا غصہ کنٹرول کر رہا تھا۔
”ایم ایچ یوسر..... میں اس حیثیت کی تمام ذمہ داریاں نبھاتی ہوں۔“ وہ ہے حد اعتماد سے کتنی میرا سکون غارت کر گئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اور مڈل

کلاس کی لڑکی مجھ جیسے بندے کو یوں منوں بلکہ سیکڑوں میں آڑا سکتی ہے۔ وہ بڑے آرام سے مجھے جتا کھینچ کر وہ اس گھر میں صرف بچوں کے لیے لائی گئی ہے تو کام بھی صرف انہی کے کرے گی۔ بے حد سہولت کی نگاہ اس پر ڈال کر میں کرے میں آؤں شہر فیضی کے عالم میں کل والی شہر سی بہن کر بال بنا کر چلا آئی۔

”چلو سعد.....“ میں نے سعد سے کہا وہ اس کالج باکس بیک میں رکھی اسے بچ بیک میں بیچ کر دے تاکہ کرنی مجھے ضرور سے بھی لڑی کوئی چیز کی۔ مجھے اس کی سعد اور شہر سے محبت ایک کامیاب ڈرامہ لگ رہی تھی۔ میں نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی اسی نے تیار کیا تھا۔ سعد مجھ سے پہلے باہر کھانا تو میں نے جاتے ہوئے رک کر رات پر پڑ گیا۔

”یہ میری جگہ کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔“ وہ چائے کا کپ ساسر میں رکھتے ہوئے آرام سے بولی۔

”آئی ایم سوری مگر یہ مجبوری ہے کیوں کہ میں بھوک نہیں رہ سکتی۔ اس میں ایٹھنٹی آپ کے لیے تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس کا یہی اطمینان اور اعتماد سے بھرا انداز میری رگوں میں انگارے دوڑا دیتا تھا۔

میں اس کو غریب گھرانے کی دہائی لڑکی سمجھتا رہا تھا جسے میں اپنی مرضی کے مطابق ٹریٹ کر چاہتا تھا مگر وہ لٹل بے لٹل مجھے حیران کرنی چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنے اور جواب دینے میں لٹل بھڑک رہی تھی چنگچاتی تھی۔

لب پہنچنے میں نے کہیں باہر نکل آئی۔

”پاپا! پاپا! ماما سے لڑ رہے تھے؟“ سعد نے گانڈی میں بیٹھے بی سوال کیا تو میں فوراً کر گیا۔

”پہنچیں تو.....“

”آپ زور سے بول رہے تھے۔“ وہ بھینٹا میرے انداز سے خوف زدہ ہوا تھا۔ میں نے گھر میں بھی اتنا

غصہ کیا ہی کب تھا۔ میں نے اس کے سنجیدہ سے چہرے پر ایک نظروں لگا کر پھر بلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

”وہ تو میں تمہاری ماما کو ڈرامہ تھا۔“ میری بات سن کر سعد نے غی میں سر ہلایا پھر بولا۔

”ماما کہتی ہیں وہ کسی سے نہیں ڈرتیں! بس اللہ میاں سے ڈرتی ہیں۔“ وہ مجھے بھی کہتیں ہیں کہ اللہ میاں سے ہی ڈرتا جائے۔“

چندویں دنوں میں اس سے بچ پر رات کا اتنا گہرا اثر دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہو رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سعد بہت شارب انٹرنڈ ڈیج تھا مگر یہ بھی دکھائی دے رہا تھا کہ رات اس پر پوری توجہ دے رہی تھی۔

”آپ ماما کو بت ڈرایا کریں۔“ وہ بہت اچھی ہیں وہ مجھے بہت سی اسٹوری پر بھی سناتی ہیں۔“

وہ مجھے کو کیا حسیہ کر رہا تھا اور چاہے وہ سعد پر کتنی ہی توجہ کیوں نہ دے رہی تھی مجھے سعد کا یوں اس کی تعریف کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا مگر میں سعد کا شک ڈور کرنے کے لیے خوش دلی سے بولا۔

”اوکے ہاس.....“

”پاپا! میں آپ کو وولف اینڈ لیب کی اسٹوری سناؤں؟“ اس نے فوراً ہائش کی تو میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس کے بعد جب تک اسکول نہیں آ گیا میں سعد کی خوب صورت اور مصوفاً ننگو سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اترتے ہوئے اس نے مجھے کسی کی تو میں نے اسے انہوں میں بیچ لیا۔

”آئی لوو ماما مانی کالڈ۔“ میں خود اتر کر اسے اسکول گیٹ تک چھوڑ کر آیا تو میری نگاہ وہ نہلائے لگی تھی۔

”ہلو ماما ہو تیت تو.....“

بے اختیار میرے دل میں خواہش ابھری تو میں دروازہ کھول کر ڈرامہ ٹیگ سیٹ پر گر سکیا۔ مجھے مجھے انداز میں میں نے انٹیں میں چابی تھما لی تھی۔

”مگر تم ہو تیت تب نا۔“ میرے دل کا آسان ابرا لود

ہوئے لگا۔

رات کو اس گھر میں آئے فقط ڈھائی ماہ ہوا تھا اور میں محسوس کرنے لگا تھا کہ سعد مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

سب دوست احباب اور شہر دار خوش تھے رات رات میرے بچوں کو اصل میں جیسی محبت سے رام کر لیا ہے مگر میرے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے دل دیان وہ میرے بچوں پر اپنا بھتیجا جیانی چارٹی ہوا اور مجھے بچا لگا نا چاہا رہی ہو۔

تین ماہ حسیہ میں نے ناشتا آفس میں کیا اور بچ اور ڈرامہ ہول میں کر لیا مگر عادت نہ ہونے کی وجہ سے سعد ڈرامہ رہنے لگا تو میں خاموشی سے وہی کھانے لگا جو وہ قبول لے رہے تھے۔ کچل کھی کر وہ میرے لیے کھانا نہیں کھا لیتی۔

”سعد! تم آج میرے پاس سو گے۔“

وہ سعد کو بلایا پھر اسکول کر دوڑ دھک پلانے کے جتن کر رہی تھی جب میں نے سعد سے کہا تو وہ فوراً دوڑ دھک لگا گاس پڑتے ہوئے بولا۔

”دیکھیں! میں ماما کے ساتھ سوؤں گا۔“ میں سر د تاثرات سے کھڑے رہا جب تک کہ سعد نے دوڑ ختم نہیں کر لیا۔

”چلو سعد۔“ میں نے اس کا بازو دیکھا تو وہ چل گیا۔

”دیکھیں! پاپا.....“

”خود میں گھر سعد.....“ میں نے اسے کو دیکھا تھا لیکن اس کا احتجاج ختم نہیں ہوا تھا۔

”ماما! اس نے بسوئی آواز میں رات کو پکارا تو وہ خاموشی سے ہمیں دیکھنے لگی۔

”میں پاپا کے پاس نہیں سوؤں گا۔“

سعد جتنا میرے پاس سوئے اسے انگار کر رہا تھا اتنی ہی مجھے بدور تھی۔ اس کا رات کے پاس سونا رہا تھا ہار گیا۔ کم از کم آج رات۔“

”خود میں چاہا تو رہے دیں۔“

اس کا کہنا نہیں جیسا گیا۔

”میں تمہارا معاملہ نہیں ہے۔“ میں بہت سرد لہجہ میں کہتا تھا اور اپنے کمرے میں لے آیا اب اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔

”کیوں رو رہے ہو یا ر؟“ میں نے اسے انہوں میں بھیجنا تھا۔

”میں ماما کے پاس.....“ اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں پر دیکھ کر مجھے اس پر پتا نہ لگا۔

”میرے پاس کیوں نہیں؟“

”آپ مجھے کوئی اسٹوری نہیں سناتے۔“

”پراس! آج میں اپنے بیٹے کو بہت سی اسٹوری سناؤں گا۔“ میں نے وعدہ کیا تو اسے جب جا کر کہیں اطمینان ہوا۔

”اپنا بیٹا ہلا دی گئی وولف اینڈ لیب ڈو وائیڈل اور ایٹس ان وڈر لینڈ۔“ ایک ہی سانس میں اس نے مجھے ڈھیروں عنوان بتا دیے تو میں مسکرا کر بغیر نہ رہ سکا۔ اسے انہوں میں بھر کر لیتے ہوئے آج اتنے دنوں کے بعد مجھے بے حد سکون اور طمانیت کا احساس ہوا تھا۔

”پاپا! اسٹوری سنا میں نا۔“ وہ بے چین ہوا تو میں نے سٹرڈل کی کہانی ناشر شروع کر دی کہ کہانی کے معاملے میں میں بالکل کو تھا۔ یہ شاید واحد کہانی تھی جو سعد کے بتائے گئے ”عنوانات“ میں سے تھی کچھ کچھ سنا سکتا تھی۔

”پاپا! سنا میں نا۔“ میری آواز مدھم پڑتی تھی۔ سعد نے منہ اٹھا کر مجھے دیکھا تو میں بند ہوئی آنکھوں اور غصہ آواز کے ساتھ پھر سے کہانی سنانے لگا۔

”جادو کرنے کی اپنی چمڑی تھما لی اور.....“

”پاپا وہ جادو کرنے نہیں تھی۔“ سعد نے مجھے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

”تو پھر جادو کر دو گا۔“ مجھے بھی اپنی یادداشت پر رشک سا ہوا تو میں نے سعد کی حسب خواہش ترمیم کر دی مگر وہ اب بھی اختلاف کر رہا تھا۔ بہت ڈانٹ سے بولا۔

”وہ فیروز کا دم نہیں۔“

”اب سو جاوے۔ صبح اسکو مل بھی جائے۔“

”کل سنا ہے ہے پایا۔ اسواری سنا گیا۔“ وہ سخت مدح و ہجو رہا تھا مگر مجھے سوئے میں ہونے کی عادت نہیں تھی اس لیے میرا کہانی سنانے کو ذرا سا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے رات پر غصے لگا کہ جس نے سعد کو یہ بُری بات ڈال دی۔

”سعد سو جاوے! مجھے نیندا رہی ہے۔“

میں نے قدر سے سخت لہجے میں کہا تو وہ جب ہو گیا۔ میں نے بھی اطمینان سے آنکھیں بند کر کے خود کو نیند کے دھاروں پر چھوڑ دیا مگر تھوڑی دیر کے بعد مجھے بلی بلی سکسوں نے ڈسرب کر دیا۔ کسی خیال کے تحت کہ میں نے سعد کو خود سے الگ کیا تو وہ رو رہا تھا۔ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔

”کیا ہوا سعد۔“

”میں اما کے پاس جاؤں گا۔“

میں لب بلبھج کر رہ گیا مگر دوسرے ہی پل میں نے مسکرا کر اسے اجازت دے دی۔

”اوکے بنا، کر مبلے چپ کرو۔“ ناصواف کرو۔“ اس نے فوراً آہستہ بیویں سے آنکھوں کو گڑوا لیا تو میں نے اس کی پیشانی چوم لی۔

”پاپا! میں جاؤں؟“

”جہاں بیٹا۔“ میرے اندر سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش خوشی اتر کر کرے سے ہر پھل گیا تھا۔ سعد کے روئے نے ایک بار پھر مجھے بہت شہت سے احساس دلایا کہ بچے مجھ سے ڈور ہو رہے تھے اور اس کی وجہ صرف اور صرف رات تھی۔ وہ اس طرح شاید بلکہ یقیناً میرے روئے کا بدلہ لے رہی تھی جو میں نے اوّل روز سے اس کے ساتھ رد کر رکھا تھا۔

اگلے روز چوتھی تھی۔ میں بھی معمول سے ذرا لیت ہی بیدار ہوا۔ ابھی میں فریش ہو کر پاپا یا رہا تھا کہ رات بکری والدہ اور دونوں بیٹیں چل آئیں۔

”السلام علیکم۔“ میں اس کی امی کے سامنے قدر سے جھکا تو انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ پھیرے ہوئے مجھے دعا دی۔ رات میرے چھوٹی حرا اور رات میں اور جہاں تک میں نے اندازہ لگایا تھا دونوں ہی بہت شوخ اور چلیبی تھیں۔

”کیسے ہیں بھائی جان آپ؟“ حرا میری طرف متوجہ تھی میں کس کمرادی۔

”تمہاری کیوت ہوگی ہے نای۔“ حنا نے فوراً شکوہ کو گود میں لے لیا تھا۔

”جیہ۔“ حنا درازا تھوڑو تو اسے فیڈر تو پی لینے دو۔“ رات بھر چلتا ہی تھی۔

”اڈو بائی۔۔۔۔۔ لاکھیں میں پلا دیتی ہوں نا۔“ اس نے رات کے ہاتھ سے فیڈر لے لیا تھا۔ ”ایک تو یہ ہماری بائی جو ہیں نا یہ جتنی ہیں کہ میں اس ایک ہی ہیں بچوں سے محبت کرنے والی۔“ وہ ہنستے ہوئے مجھے بتا رہی تھی۔

”بانا ناشتہ لے۔“

میں نے بہت وقت پر تھکنا۔ انداز میں کہا تو وہ میرا انداز سمجھ کر کھانے کی پھر سانس سے بولی۔

”یو لگو تو ناشتہ کر کے ہیں کیوں ای جی۔“ ”ہاں بیٹا۔ اب تو کافی دیر ہو رہی ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا تو میں بولا۔

”مگر میں تو ابھی تھاہوں۔“

”تو بیٹا آپ ناشتہ کرو۔“ انہوں نے کہا تو میں نے دیکھا کہ رات کے نظر انعام کیے حنا سے باتوں میں مصروف تھی۔

”بھائی جان اگر آپ پر بندش تو میں آج آپ کو ناشتا بنا دوں؟“ حرا کی پیشکش مجھے نہیں لگی کیوں ابھی رات کے ہاتھ سے بنا کچھ کھانے سے بہتر تھا کہ کہیں اور سے کھالیا جائے۔

”سعد کہاں ہے؟“ اس کی امی نے پوچھا تو وہ بولی۔ ”وہ ابھی سو رہا ہے۔ میں نے بھی نہیں اٹھایا کتا جی۔“

پھٹی کا دل ہے۔“

ذرا سی دیر میں حرا میرے لیے گرم گرم پراٹھا اور خوشبو دارا پیٹ لیے حاضر تھی۔ ساتھ ہی گرم چائے کا کپ۔

اتنے دنوں کے بعد اس پر کھٹک سے ناشتے نے میری ساری کلفت و زوری کر دی۔ ہر لوہے پر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں مدتوں سے اس ڈانکے کو ترس رہا تھا۔ جنسی توانہ اور پراٹھا بھی مجھے بہت ”کھٹک“ لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں سعد بھی اٹھ کر رات کو ڈھونڈتا ہوا ہاں آ گیا تو مجھے شہت سے احساس ہوا کہ اب سعد نے میری پر دیا کرنا بہت کم کر دی تھی۔ رات میں اس کے سامنے ہونی پاپا میں وہ وقت مانا مانی لگے لگے رکھا تھا۔ اپنی باں اور بچوں کے جانے کے بعد سعد کو لے کر بچن میں کھس گئی جب کہ شاو اور میر سے قریب پرام میں لٹی بیچنا ہاتھ میں تھا ہے ہاتھ پاؤں مارنی خود ہی خوش ہو رہی تھی۔ کافی دیر تک میں اس کی تقاریر میں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

اسی انا میں کھانے کی پُر اشتہا بھی خوشبو پورے گھر کو معطر کرنے لگی۔ جانے وہ کیا بنا رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی سعد سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اپنی چنی چیری باتوں سے تو اس نے سعد کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ میں کس کر رہ گیا۔ میں اس کی زوردار چیخ نے میرے تمام حواس کو چوٹا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سعد نے روئے کی آواز کو بھی تو میں سمجھنے کے ہزاروں ہی سے میں آتا ہوا جن میں پہنچ گیا۔

”کیا ہوا۔ کیا ہوا ہے سعد کو؟“ میں متحش تھا۔ کوئنگ رنچ کے چولے کے بالکل ساتھ جن کا ڈنپر پر بیٹھے سعد کو میں نے چھٹ کر اٹھا لیا وہ بدستور در ہاتھ۔ اس دوران میں نے رات پر ہاں لگ ہی تو چپکس دی تھی جس کی رنگت زور پر ہی تھی۔

”کیا ہوا سعد۔؟“ میں نے سعد کو پچکارا تو وہ

آنکھیں ملتا ہوا معصومیت سے بولا۔

”ماما جی میں پاپا۔“

میں نے ہاتھ چوٹ کر اس کی طرف پلٹا وہ سب کا تل کو لے پانی کے نیچے ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

میں نے اس سے کوئی ہمدردی جتانے بغیر کراہی میں براؤں ہوتی پھٹی کا آپس پیچھے میں اٹھا کر پیٹ میں رکھا اور برزاف کر دیا۔

”انسان اس کام میں ہاتھ ہی کیوں ڈالے جو کرنا نہ آتا ہو۔ اور پیچھے آئی کو اس کی نیت کی جزا اور سزا ملتی ہے۔“

میں نے با آواز بلند کہا تو سعد کی مسکریاں پھر سے بلند ہونے لگیں۔ وہ یقیناً رات ہوا تھا۔

”پاپا آپ مجھے ماریں گے؟“

”میری میری جان! آپ نے بھلا کیا کیا ہے۔“ میں اسے پچکارنے ہوئے جہاں سے نکلے لگا تو وہ اسی انداز میں بولا۔

”پاپا میں نے ماما کے ہاتھ پر پچھڑکھا تو وہ گرم تھا۔“

جہاں کی چوٹ پر ہی میرے قدم جم گئے تھے۔ میں بلا ارادہ ہی واہیں گھوم کر رات کو دیکھنے لگا جو رات میں سے برتاں نکال کر اپنے ہاتھ تاشا سرخ ہوتے ہاتھ کی پشت پر لگا رہی تھی۔

”تو یقیناً آپ کی ”لما“ نے آپ کو مارا ہوگا۔“ میں نے چاچا کر خوف ادا کیے تھے جہاں وہ چوٹ کر مجھے دیکھنے کی وہیں سعد نے روئی آواز میں بتایا۔ ”میں پاپا مانا نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔“ میں درد ہوا تو میں ڈر گیا تھا۔

کھوڑا ہوا نکلا چہا کے صدق میں نکل سا ہو کر سعد کو لے بچن سے نکل آیا۔

”آپس دیری بیڈ سعد۔ اتنی ہی حرکت کی ہے تم نے۔“ میں نے سعد کو زور دیا کہ وہ پھر سے رونے والا ہو گیا۔

”میں کامو ماری بولوں دوں گا۔“

مجھے تو قسم تھی کہ وہ میری اس وقت مجھے ضرور دے گا وہ
 گی مگر میری بھول تھی شاید بہت بڑی غلط تھی۔
 ایک نہایت کرخت بلکہ کروڑی آواز مجھے گہری نیند

”میں نے تم سے کہا تھا کآج مجھے جلدی آفس جانا ہے اور اس

جہوں ہے اپنی۔ یہ دس لاکھ لے کر مہر کا مال
ہے اور اس گھر کا جس میں رہنے کا وہ صرف خواب ہی

دیکھ سکتی تھی۔ میں نے بھی لپٹا رکھے بغیر کھدیا تو جوا بغیا آپا نے مجھے خوب ہڑا بھلا کہہ کر میری ایک بھی بات سڑے سے بغیر فون بند کر دیا تو میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

○.....○

”میں کچھ نہیں جانتا تم ہر حال میں بھابھی اور بچوں کو لے کر افطار پکڑ رہے ہو بصورت دیگر فضا کو جانتے ہو تم۔“

عمر مجھے فون پر دھمکا رہا تھا مگر میں کسی طور پر ہائی ممبر نے کوئی اثر نہیں کیا۔ بھلا میں اس غرو میں بڑو لڑکی کو کہیں کیسے لے جا سکتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ کس حیثیت سے؟ جب کہ یہ دعوت نامہ مسٹر اینڈ مسز شہرام کے نام تھا۔

”کیا بے یار و مرہم پتہ بارہ روزے کی حالت میں میرا کہیں آنے جانے کوئی نہیں چاہتا۔“ میں نے پودا سا بہانہ بنایا جسے وہ بہت غصے سے رد کر گیا۔

”بہت غصیٹ ہے تو؟ اور روزے میں میری زبان گندی مت کرو۔“ پہلے تو مجھے بھی تمہارے ساتھ افطار کیا ہی نہیں تھا۔“

مجھے یاد آیا کہ پچھلے سال کتنے ہی روزے میں نے شہلا کے ساتھ اسی کی طرف افطار کیے تھے۔

”اوکے..... میری تو رعب میں آئی نہیں سارا غبار لے کے مجھ پر نکال دیا تو اسے میں تم شام میں۔“ میں نے اسے پیچھے کرتے ہوئے کہا تو اس کا موڈ ٹھیک ہونے میں بھی دو تین گھنٹے

وہ لاؤنچ میں بیٹھی سعد کو تیرا کلمہ یاد کروا رہی تھی۔

”پاپا! میں آپ کو نماز سناؤں؟“ مجھے دیکھتے ہی سعد نے بڑے قافری سے کہا تو میں خبر میں جھٹکا ہونے لگا۔

وہ ناشاء اللہ سے چار سال کا ہو چکا تھا اور کافی سے زیادہ ذہین تھی تھا مگر میری خیال نہیں تھا کہ اسے زبانی نماز کا کلام یاد ہو سکا مگر اگلے چل میرے اس خیال کی نفی ہو گئی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹے غور و تمرین کے بعد

”پاپا! میں آپ کو نماز سناؤں؟“ مجھے دیکھتے ہی سعد نے بڑے قافری سے کہا تو میں خبر میں جھٹکا ہونے لگا۔

وہ ناشاء اللہ سے چار سال کا ہو چکا تھا اور کافی سے زیادہ ذہین تھی تھا مگر میری خیال نہیں تھا کہ اسے زبانی نماز کا کلام یاد ہو سکا مگر اگلے چل میرے اس خیال کی نفی ہو گئی۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹے غور و تمرین کے بعد

اندازہ نہیں ہو پایا۔ وہ شام کو میری گود میں دے فضا بھابھی کے ساتھ دوستی چاہتے تھے جن میں صحنی ان کی مدد کر رہی تھی۔ اور جتنا اس کا سب پر اچھا امپریشن پڑ رہا تھا اتنی ہی میں اس سے بچتا جا رہا تھا۔ یہ لڑکی شہلا کو مسلسل بیک کر اوٹ میں ویلن کر سب کی نظروں میں اپنی پوزیشن بنانے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کی صورت نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

”پاپا! رو میری کی شہر۔ تمہاری ہوی ایک مستور لک بھی ہے منوں میں اس نے کتنی ہی بی چیزیں تیار کی ہیں۔“ فضا بھابھی بہت پر جوش تھیں۔

”یہ دیکھنی بڑی چیز ہے۔“ میں کہو تو میں پایا مگر بظاہر مسکراتے ہوئے اندر ہی اندر سوچ رہا تھا۔

افطار کے بعد کھانے کے دوران وہ شام اور سعد کو اتنے اپنی انداز میں سنیاں لگتی تھی جیسے وہی ان کی ماں ہو اور انہیں ہمیشہ سے سنبھالنے کی عادی ہو اپنے دو بچوں سے تنگہ کی فضا بھابھی اسے رشک دے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی یہ آؤ بھگت اور واہ وہوئی دیکھنا اب میرے بس نہیں رہا تھا۔ اس دلچسپ محفل سے میرا دل اٹھتا نہ لگا تو پھر میں عمر اور فضا کے بے حد صراحوں پر بھی نہیں ڈکا۔

”سبح آج جانا ہے بچوں کو بھی فیضانِ ربی ہے تھک گئے ہیں۔“ میرا ایک ہی بہانہ تھا جو قدرے حق بھی تھا۔ فون بچکے تھے شام تو ابھی تک ریلی تھی مگر سعد کی آنکھیں بند سے بند ہو رہی تھیں۔ سو ان لوگوں کو اجازت دیتے ہی بنی۔

”کیا ضرورت تھی اتنا فانی ہونے کی۔ جیسے اپنے گھر میں پھر رہی ہیں۔“ میں نے گاڑی کے میں رنڈ پر مڑتے ہی اتنی سے کہا تو گود میں لیے سعد کو بھتیجے وہ تیرے مجھے دیکھنے کی گرج بوند وہ تو ابی تو اس کا انداز یاد کر سکتا تھا۔

”آپ مجھ پر کوئی دغ نہیں لگائے ماسوائے بچوں کی ذمہ داری کے۔“

”ہاں..... بچوں کی ذمہ داری۔“ میں نے تسخیرانہ

”مجھے بھی وہ کہ حیثیت سے؟“ مجھے اس کی حیرت میں چھاپڑ صاف محسوس ہو گیا تھا۔

”فصل باتیں مت کرو اور ساڑھے چار بجے تک تیار ہو جانا۔“ بچے بھی جا میں گئے۔“ میں جتنی سے کہتا واپس پلٹ گیا۔ مجھے پتہ تھا کہ زنی دکھانے پر وہ مزید فضا کے تیر چلانے سے باز نہیں آئے گی۔

نتیجہ سب توقع رہا۔ وہ پورے وقت پر بچوں سمیت بالکل تیار تھی۔ صاف تھرا سا مسعد بالوں کو سلپٹے سے سنوارے مجھے بہت سکون پہنچا رہا تھا۔ بھئی وہ شاکا بانہوں میں سنبھاتی تھی اندر سے براہ مدہوی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت سن پرست رہا ہوں، مجھ جیسے لا آہالی کو پہلے پہل شہلا کے حسن نے اور بعد میں اس کی محبت نے اپنا سیر کیا تھا۔ اور اس وقت جو میں راند کو دیکھ کر ٹھکا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ سرخ و سفید استراحت کے لباس میں ہلکی پھلکی جیولری اور صرف اپ اسٹاک کے ہیکلے سے کوٹ ہی نے اس کی عام سی شکل و صورت کو دیکھنے کے قابل بنادیا تھا۔ سو میں بلا ارادہ دے اختیار اسے دیکھ گیا۔ فضا وہ میری گہری نظروں کے ارتکاز ہی سے کسمپاشی تھی۔

”جھپٹیں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا تو میں جیسے کسی گہرے خواب سے بے دار وہ اور پھر اپنی اس بے اختیار پری میں سارے راستے دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتا رہا۔

عمر اور فضا بھابھی نے ہمارا بہت گرم جوش سے استقبال کیا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ دونوں مجھ سے زیادہ راز کو اہمیت دے رہے تھے۔

”مجھی راند یہ دونوں شہری سے زیادہ تمہارے بچے لگتے گئے ہیں۔“ فضا بھابھی نے مسعد اور شاکا کی اس سے اتنی منٹ دیکھ کر کٹاڑ ہوئے ہوئے کہا تھا۔

”اس سے اچھا کوئی فیصلہ نہ زندگی میں نہیں کر پاؤ گے شیری۔“

عمر مجھے سہرا رہا تھا یا راند کو مجھے ٹھیک طرح سے

انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔ ”اور جنہیں شاید یہ سن کر بالکل بھی خوش نہیں ہوگی کہ اس میں بھی تم کچھ خاص کارگزاری نہیں دکھلا رہے۔“ ماسوائے میرے بچوں کو مجھ سے ڈر کرنے کے۔“

اس بار میں اسے ساکنڈ کرنے کا کام با رہا تھا۔ وہ حیرت سے پوری آنکھیں کھولے مجھے دیکھنے کی کمریہ صرف چند لمحوں ہی کی بات تھی پھر اس کی حیرت پر تاسف غالب آ گیا۔

”میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ مجھ کو آپ کی سوچ پر بہت آفس ہے۔“ وہ حد تک شہرے سے بولی تو میں اس پر ایک خضر عمر کی نگاہ ڈال کر دھڑکنے کے بارے میں لگا۔ اس وقت مجھے ایک لمبے لوہی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ میرے دونوں بچوں کو اپنی گود میں بیٹھ لی تھی۔ اگلے ہی دن بہت جلدی سے گزر گئے۔

اور پھر شاید قدرت نے مجھے اس کا اصل روپ دیکھنے کا موقع دے ہی دیا۔

طبیعت میں پھر بھول بن محسوس کرتے ہوئے میں آفس سے بہت جلدی آگے آیا تھا۔ کوئی دیر دوں داخل ہوئے ہی مجھے داؤغ کے سرے پر ایک ناقابل یقین منظر دکھائی دیا۔

وہ بے حد غصے میں سعد کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔

”انتہائی گندے بچے ہو تم، جن والے کمرے میں بند کروں گی تمہیں بلکہ لاہر والے مسور دم میں۔“ اسے مسلسل سوری کہتے ہوئے سعد کو پکڑا بھرنے ہوئے رو رہا تھا مگر اس ظالم کو اس معصوم بچے پر ذرا بھی ترس نہیں آ رہا تھا۔

میں جیسے آڑا ہوا اس تک پہنچا۔ اس کا زود تمام کر ایک جھٹکے سے سعد کو اس کی گرفت سے ڈاڑا لیا۔ وہ مجھے غیر متوجع طور پر سامنے پا کر یقیناً ششدر رہ گئی تھی۔

مگر میں شدید مشتعل تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اس کے

بطن میں بہت جگہ لگا کر کئی قدم پیچھے ہٹ چکی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بچے سے ایسا گھناؤنا سلوک کرنے کی۔“ میں غرا تھا۔

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی لیے اس کے لب کچھ کہنے کی کوشش میں خرقہ اڑے مگر پھر وہ کچھ گنہگار بن گئی۔

”میں اسے کمرے میں لائی تھی۔ میں اسے اپنے دام و باز پر قابو پا سکتا دیکھنے سے لگائے پکڑا کر لگا مگر اس ظالم حکومت نے جانے اسے اتنا نارنج کیا تھا کہ وہ روئے جا رہا تھا۔

میں تھوڑی دیر بولی اسے پیار سے سہلا تا اور جھپٹا کر اس کے بعد اسے ساتھ لے کر سے نکال آیا۔ جی جی تھا اسے پہلے میں درمیں لگی تھی۔ غریبی پارک میں آ کر کریم والا اسے چھو لے کر بٹھایا تو وہ سب کچھ بھول کر دوسرے بچوں کی طرح کھل کھلائے لگا۔ اسے چھو لے چھوڑ کر میں سامنے ایستادہ سنگی تخت پر جا بیٹھا۔ ایک طبیعت پہلے ہی ہاش کر رہی تھی اوپر سے رائے کی حقیقت نے مزید بدتر کی پیدا کر کے میں زور شروع کر دیا تھا۔ سعد کا روئے اس کی سرخ ہوئی آنکھیں زائمرے بار بار سوری کہتا کچھ بھی تو مجھے یقین لینے نہیں دے رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا میں جا کر رائے کو کھٹ کر دوں۔

کس قدر زارم باز عورت تھی وہ۔ اتنی کامیابی سے سب پر اپنا جت جانتے ہوئے تھی۔

مگر اب بات تو غلطی کے جس کی طور بھی اسے اپنے گھر میں رہنے والا نہیں تھا۔ یہ نیک سلی بھی تھی کہ جلد ہی اس کی پول کلنگی کی دولت تو شاید وہ میرے بچوں کو کوئی مریض بناتی تھی۔

میں نے رست واضح پر قائم دیکھا۔ انتظار میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ میں سعد کو گیسٹر نوٹ میں چلا آیا۔

میں مسلسل اسے باتوں میں لگائے ہوئے تھا۔ وہ بہت ذہین اور باتوں پر تھا اس کے لیے کسی بھی بات کو بھولنا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا اور میں اسے رائے کا تار روہ بھلائے تھی سہی مسلسل میں مصروف تھا۔ انتظار کے

میرے بے زار کن انداز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے خونخوار انداز میں مجھ پر جڑھائی کر دی۔

”شکر ادا کر خدا کا جس نے اتنی اچھی بیوی دے دی ہے جسے ایسی دلکش فری چھڑے ہو۔“

”ہاں آپ تو ایک ہی بار شکر ادا کر لیں کہ کوئی نفل پر حوصلے میں نہ رہے۔ آپ کو ایک ہی نگاہ ڈالنی تھی۔“

”جھٹکے پاس۔“ وہ سعد کو اپنے پاس بلاری تھی مگر میں اسے شانوں سے تھامے اپنے گھٹوں سے لگائے کھڑا رہا۔

”جو سلوک آج تم نے اس کے ساتھ کیا ہے اس کے بعد تم اسے قابل نہیں رہیں گے میرے کوئی رشتہ رکھے۔“

میں عمو اور فندہ بھائی سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہ رہا تھا۔

”یہ عمری تھا جو“ فرضی مائیں کے قصے سن کر مجھے اس معصیت میں پھنسنے پر مجبور کر گیا تھا۔

اسے بھی تو یہ چلا کہ اس کی منطق کتنی غلطی اور کچھ مجھے بننا آئی کہ خیال تھا بغیر گواہ کے تو وہ کبھی بھی رائے کے گناہ کو تسلیم نہ کریں۔ اچھا ہی تھا کہ ساری بات عمر کے سامنے ہی نکلی۔

”شکر.....“ عمر نے ناگواری سے مجھے پکارا تھا۔

”تم نہیں جانتے عمر نے بے حد چال باز عورت ہے۔“

”جیسے کی لاٹ میں شادی کر کے اس گھر میں آؤ تو کسی بے عمر اصلیت یہ ہے کہ بے اول روز سے میرے بچوں کو تار پھرنے لگی۔ آج بھی.....“ میں نے عمر کی طرف ہلکتے ہوئے بے حد بددیہان انداز میں کہا تو وہ مجھ سے بھی اونچی آواز میں میری بات کاتے ہوئے بولا۔

”آج بھی کیا آج بھی؟“ یہی نا کہ انہوں نے تمہاری بیٹی کو میرے سے بچالیا۔ پانی سے میرے منہ میں ڈب دہکی گئی وہ چار ماہ کی بچی۔ مجھے لگا بلکھتی ہی میرا دل ہوا گیا ہو۔

”یہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ پھر جیسے میرا داغ اٹ گیا۔ میں بے حد مشتعل اس رائے کی طرف بڑھا تو عروج میں آ گیا۔

خاص جگہ بنا گئی تھی اس لیے میں بہت مبصر سے اس کے اچنی طرف لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔
مگر چاند رات تک یہ صبر بھی جواب دے گیا۔
”ماما بابا کہہ رہے ہیں باہر طیلن“ سعد اس کے سر

پر کھڑا میرا بڑھایا ہوا بچہ دہرا رہا تھا۔
”بچہ نہیں چلتا۔“ مجھے نہیں جانا۔ ”وہ زری سے بولی۔

اس کی یہ کواٹھی بھی مجھے سے حد پسند کی کہ ہمارے آپس زبانی کوسعد کے سامنے بالکل بھی نہیں لاتی تھی۔

میں مسکراتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا جو شاء کو سامنے کے بعد اب شاید خود بھی لینے کی تیاریوں میں تھی۔

”کیوں نہیں جانا۔ آج چاند رات ہے ہم سب جائیں گے ہمدن کی گھونٹے چوڑیاں پہننے۔“ کیوں سعد؟

میں نے بہت دوستانہ انداز میں کہنے ہوئی سعد کی تائید چاہی مگر میری نظر رامت پر ہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر کھٹکتی رہی تھی۔

”پاپا! اب بھی چوڑیاں پہنیں گے؟“ سعد نے شکر اراں انداز میں پوچھا تو میں ہنس دیا۔

”جیسا؟“ کام آپ کی ماما کا ہے۔ کیوں رامت؟ میں یوں پوڑ کر رہا تھا جسے ہم دونوں کے مابین جانے لگتی محبت ہو۔ وہ ایک تیز نگاہ مجھ پر ڈالتی کھڑی تھی۔

”چلو سعد اب چلا جاؤ ورنہ آج کٹھن میں کھلے گی۔“
”کوئی نہیں لینے کا بلکہ ہم سب ماما کیٹ جائیں گے۔“

میں نے اعلان کیا تو سعد پھر نہ جوش سا اٹھ کھڑا ہوا۔

”جیسے جانا ہے وہ چلا جائے۔“ وہ ٹک کر کہتی کمرے سے باہر نکلنے لگی کہ میں نے ملا مارا وہ اس کا ہاتھ تمام کر اسے روک لیا۔

”تم چلو تو ہی چاند رات ہو گئی تھی۔“
جانے میرے کسی زبان بچل نہیں تھی۔ وہ ششدری مجھ دیکھنے لگی۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا سرکرایا۔

وہ میرا ہاتھ جھٹکتی پھر سے ہنسنے پر جاتی تھی مگر اب اس نے ہر انداز سے اضطراب ظاہر کر رکھا۔

میرے بدلے انداز یقیناً اس کے احساسات کو بھی جھنجھوڑتے تھے۔
”آپ رامت باب تو ہر بات ختم ہو چکی ہے۔ میں سو رہی تھی کہہ چکا ہوں۔“ میں نے اسے منانے کی کوشش کی۔

”پاپا چلیں ناں۔“ سعد نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔
”شہر و یاد تمہاری ماما کو تو منائیں تبھی عید منائیں گے۔“ میں نے خوش گوار لہجے میں کہا تو اس نے مجھ پر

ایک نظر تیز ڈال کر چہرہ پھیر لیا۔
”ماما آپ سے ناراض ہیں آپ نے ماما کو تھپسرا رہا تھا نا۔“ سعد کی یادداشت نے بہت لمبے وقت پر ساتھ دیا تھا۔ میں ٹھل سال سے کھورنے لگا۔

”اب اٹھ جاؤ رامت۔“
”میں نے کہا نا نہیں تو میں نہیں۔“ وہ اب کچھ تھکی ہوئی مگر اس کے انکار میں وہ شدت نہیں لے کر بیٹھے

برادری۔ ”پہلے میرے مقام کا تعین کر لیں۔“ وہ کئی سے کہہ رہی تھی میں اب آگے بڑھا۔
”تو تب کروں جب تم تعاون کرو۔ کب سے

منابا ہوں تو مجھ جاؤ نا کہ یہ یوں والے ٹکڑے دیکھ رہا ہوں۔“
”پاپا چلیں ناں۔“

سعد کچھ زیادہ ہی جلدی تھی مگر میں اس وقت رامت کی طرف متوجہ تھا جس کی ہر بات میرے احساسات کی ٹوکھیز کر رہی تھی۔

”جب ٹکڑے اٹھانے کے دن تھے تب تو اٹھائے نہیں اب بھی بے پروا بنے رہیں“ میں کوئی ٹکڑہ نہیں کروں گی۔“ وہ ہنسنے لگی۔

سعد نے پھر میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

”کیا ہے باز وہ دھن تو صبر کرو۔“ کوئی ایک تو رامت نے نہیں مان رہی تھی اوپر سے سعد نے میرے انداز سے گہرا کر دنا شروع کر دیا۔

رامت مسافانہ نظروں سے مجھے دیکھتی اسے چپ لرائے لگی۔
”ہم سر کر نہیں جائیں گے پاپا گندے ہیں۔“

”کیا کیا جائے مینا اب بندہ خدا سے تو نہیں لڑ سکتا نا۔“ وہ کھنکھاتی نظر مجھ پر ڈالتی کہہ رہی تھی۔ میں سر کھینچ کر رہ گیا۔

”میں بابا سے نہیں بولوں گا۔“ سعد کو مجھ پر کچھ زیادہ ہی غصہ تھا۔ میں نے رامت کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کی گردن دیکھ کر سعد سے معذرت کرنے کی کوشش کی تو وہ ہنسنے لگا۔

”میں آپ سے ناراض ہوں۔“
”ہم اپنے بچے کو منائیں گے ابھی۔“ میں نے جھک کر اس کے دونوں رخسار چومے تو وہ پھول کی طرح حل

افلا۔
”اب ہم باہر جائیں گے نا؟“
”ہاں بیٹا ضرور جائیں گے۔ اگر آپ کی ماما اپنی

ہار اسٹیج پر کھڑی ہو تو۔“ میں نے گہری سانس بھر کر ہونے اس کی پرکشش صورت دیکھی تھی۔
”تو آپ ماما کو بھی منائیں ناں۔“

سعد نے بیڑا دیا تو میں بے ساختہ تہہ لگا کر بولا۔
”میں تو تیار ہوں یا نا اگر ان کی اجازت ہو تو۔“

وہ جو پہلے ہی میرے سامنے پاس آ بیٹھنے پر تھی اب بھی میری بے باکی پر سر ہنسی ہوئی۔ سعد کو گدے اتار لی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اس کے فرار کا ارادہ دیکھ کر اس کی راہ

بٹس لگایا۔
”کیا چاہتی ہو رامت دست بستہ تم سے معافی مانگوں؟“ میں بالکل سنجیدہ تھا وہ دوس ہوئے لگی۔

”میں نے یہ نہیں کہا۔“
”تو پھر میری ذرا سی بھول کی اتنی لمبی سزا تو مت

دو۔“ میں ہر قیمت پر اس سے نہ چاہتا تھا۔
میں جوب نہ جھٹکتا تھا کہ شہلا کے بعد میں کسی سے محبت

کر ہی نہیں سکتا تو میری یہ منطق کھونا سکی ہی ثابت ہوئی تھی۔ ہر محبت کا اپنا انداز اور اپنا مقام ہوتا ہے یہ بات میری سمجھ میں بہت اچھی طرح آ گئی تھی۔

”آپ نے میرے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔“
غلط فہمی تو مجھے ہی غلط فہمی واسب کے بیچ میں نے تو آپ سے کبھی کبھی ڈیمانڈ نہیں کیا تھا۔ نیک مہر اور نہ ہی

یہ تمام گھڑاؤ۔ صرف عزت ہی وے دیتے تو میں خوش ہو جاتی۔“
وہ ٹکڑہ کھان لہجے میں بولی تو میں نے اس کے

دونوں ہاتھ تمام کر اپنے سینے پر رکھتے ہوئے یہ یقین انداز میں کہا۔
”لیکن اب میں تمہارے ساتھ ہوں اچھا کرنا چاہتا

ہوں۔ عزت ہی نہیں محبت بھی دوں گا کیوں کہ تم نے میری ہر سوچ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر مدھمی مسکراہٹ پھیل کر مجھے ہلکا ہچکا کر گئی۔
”پھر بھی اگر تم جاؤ تو میں تمہیں مہاسکنا ہوں۔“

میں نے اس کی طرف جھٹکتے ہوئے شرارت سے کہا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ سعد کو اٹھا کر ہوا میں اچھالتے ہوئے میں نے اس کی گھبراہٹ پر قہر لگایا تو وہ مصروفی

غلطی سے مجھے گھورتی مسکراہٹ چھپائی واداروڈب کی طرف بڑھ گئی کیوں کہ ابھی میرے بعد ہمارا یہ

چھوٹی سی خوب صورت فیل چاند رات کا مزہ د اٹھانے جانے والی تھی۔

تم آئے تو آیا مجھے ہلکا جی میں آج چاند نکلا جانے لگتے دھوں کے بعد جی میں آج چاند نکلا

میں نکلتا ہا تھا اور سرور بھی تھا کہ وہ واقعی میرے آگن کا چاند ہی ثابت ہوئی کی۔

مسکراؤ کہ عید ہو جائے
تم جو آؤ تو عید ہو جائے
اپنا آچل اتار کر جانائے
رخ دکھاؤ تو عید ہو جائے

”طہاس! بھو! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟“
بھر پور فائدہ اٹھا کر وہ شوخ لہجے میں کہہ رہی تھی۔
”او کے ہولڈ آن۔“ ریسیدور سائیڈ پر رکھ کر وہ
جانے کب تک فون کو غضب ناک نظروں سے گھورتا
رہتا۔ بھی انہیاد قار کرے میں داخل ہوئی۔
”سالی جی کا فون ہے آپ کے لیے۔“ اس سرعت
سے رنگ بدلا کہ گرگٹ بھی حیران رہ گیا ہوگا۔ مسکرا کر
ہوئے انہیاد ریسیدور اٹھایا۔ ساتھ ہی بیٹھنے کے لیے
نظروں ہی نظروں میں جگہ دیکھنے لگی۔ اس کے انداز پر
ہیش کی طرح طہاس مسیر کا دل اٹھل پھیل ہو گیا۔
”بیڈ کے سرے پر لیٹا ہوا تھا۔ سرک کے پیچھے ہوا تو وہ
کنا بے رنگ ٹی۔“
”پھینکس۔“ اور وہ اس کی مسکراہٹ پر ہی سر ہلا۔
”میلو۔ السلام علیکم! کیسی ہیں سب؟“
”ناٹ بیڈ۔“ بھوکاک کا نغذہ شیل ہے۔“
”کب میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ طہاس مسیر جیسا
”اگر بلا دیں تو نوازش ہوگی۔“ سالی ہونے کا
جذباتی بندہ کیسے برداشت کرتا کہ اس کی ٹی ٹی جی حسین

”طہاس! بھو! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟“
ریسیدور کان سے لگائے طہاس مسیر کا منہ ایک دم سے
کڑوا ہو گیا۔
”علیکم السلام! اچھا ہوں تم سناؤ۔“ دل پر جگر کے
گویا ہوا۔ زبان کڑوی ہو رہی تھی مگر الفاظ تھکے ہی نکل
رہے تھے اور یہ سارا کمال طہاس مسیر کا ہی تھا۔
”میں تو بہت اچھی ہوں۔“ کھٹکھٹاتا ہوا جواب
تھا۔ منہ کا زادیہ بری طرح بکڑ گیا۔ اگر پاپس رشہ نہیں
ہوتا تو جی بھر کے بھڑاس نکالتا اور ریسیدور کریٹل پر شیخ
دیتا لیکن ٹی ٹی رشتے دار کی آڑ سے آ رہی تھی۔ موصوفہ
سالی کے ہمہ سہ پر تین ماہ پہلے فائز ہوئی تھیں۔
”انہی کو بلاؤں؟“ لہجے میں مٹھاس سو کر گویا ہوا۔
ساتھ ہی شکر ادا کیا کہ ابھی یہاں ویڈیو فون متعارف
نہیں ہوا۔ ورنہ وہ اس کے ماتھے کی لکیریں گننے لگتی تو
کتنی بھول جاتی۔
”اگر بلا دیں تو نوازش ہوگی۔“ سالی ہونے کا

جمل بیوی کی طرف متوجہ ہو۔ بڑے آرام سے ہاتھ بڑھا کر اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔ محرومل انگلیوں کو دھیرے دھیرے سہلوانے لگا۔ مقصد فقط اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنا تھا۔ جب کہ محبت کے اس عمل پر ایسا ہوتا تو اس نے اس کے خوب صورت چہرے پر ایک مشکرائی نظر ڈالی تھی۔

”جو کنگ ہتھے کو اسکل والے پکنک پر جا رہے ہیں۔ میری ساری فرینڈز جا رہی ہیں۔ میں نے مانا سے بات کی تو انہوں نے ہری چھٹی دکھا دی کہ میں خود ہا با سے بات کروں۔ جو بائیر آپ ہا با سے بات کریں نا یو لاسٹ ایئر بے اسکل کا۔“ ٹرین کا لالچہ انتہائی ہو گیا تھا۔

”اگے میں بات کروں گی ہا با سے۔“
 (تھینک یو سوچ بوجا پنا خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔“
 ٹرین کے خوش خوشیوں بند کر دیا۔ انہا دوارے ہا ہی بھری تو سمجھو کتنی پیچیدہ حاد میں ڈوب ہی نہیں سکتی۔
 طہماس میز کو یہ بات شادی کے نقطہ تین ماہ ہی سمجھ میں آئی تھی۔

طہماس میز کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں دوسروں کی نظروں میں خاص بننے کا شوق ہوتا ہے۔ چھ فٹ سے لگتا قد، سرخ و سپرد رنگت اور بچی ستواں نالغ ہے جب کہ دار کا لیٹھو آنکھیں برس نا ٹانگیوں شاہد اس میں وہ تمام خوبیاں بدرجہا موجود ہیں جو اس کا داغ عرش میں پر پٹچانے میں معاون تھیں۔ بلا کا خود کش اور دست بند تھا۔ چہاں اس نے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ نہ تھا۔ خود آگاہی کی وہ لوگوں نے بھی اسے آسمان پر چڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کی رائے پسند نا پسند سب کو مقدم رہتی تھی اور وہ اپنی اہمیت پر ہواؤں کے ہم قدم رہتا تھا۔ مگر شاید اور پادے کو اس کی اداز یاد نہ بھائی تھی وہ زندگی میں ایک بیچو بیچال سے جا مل گیا۔ اس کے دوست عثمان کی شادی تھی۔ وہ فوٹو گرافی بڑی شاندار کرتا تھا۔

(شاید یہ کوئی شیعہ ہو جس نے بغض تھا۔ لوگوں کی تعریف و توصیف نے اسے ہر میدان میں جھنڈ گاڑنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ وہ ٹرین مولا تھا کہ کوئی مقابلہ دور تک کیا تب دور تک نہ لے عثمان اور اس کی سزلی دو تین اسبپ اتار کر وہ ڈرا پیچھے ہوا تھا۔ ”اورا“ مشکبازی صدا نے اسے سرعت سے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ بے درہائی میں پیچھے ہٹنے کی وجہ سے اس نے بوٹ نے کسی کو دل پر کھینچ دیا تھا۔
 ”غلطی کی معذرت چاہتا ہوں۔“ وہ جوہل میز کے باعث شہرت رکھتا تھا اس وقت کیسے بے احتیاجی کر سکتا تھا۔ ایک سو کہ یہ اپنے پیر کا معائنہ کرتی لڑکی پر وقت بھرتی تھی۔ پکنک چہرے پر دو بے حد حسین بڑی بڑی آنکھیں اس کی طرف اٹھی تھیں۔ ان انہیں میں کوئی کی ماند چھلچھلے مکان دلیز عبور کر کے آنکھوں کے پیرے دار بن گئے تھے۔ طہماس میز کا سخت حافظی انتظام میں رکھا دل اس کی آنکھوں کے سامنے چوری ہو گیا۔ وہ جہاں کا تھاں رہ گیا۔ جو خود کو آڑن میں کہتا تھا اس نازک اندام لڑکی کے آگے موم کی طرح پھسل گیا۔

”راستہ دیں۔“ اس کی تجویز پر اس کی صبح پیشانی پر لمبی کی گلیاں مگر محروم ہوئی۔ اس کے خنک انداز پر وہ بڑبڑا گیا۔ سووی میز کے باعث جگہ چھوڑی تنگ تھی۔ بالیاں شانہ پیچھے کی طرف موڑ کر اسے نکلنے کا راستہ دیں۔
 اس کے سینے سے وہ خود ہو گیا۔ وہ سرعت سے بڑھ گئی مگر چہرے کی بدلتی رنگت اس کی زیرک نگاہوں نے سختی نہ دیکھی۔
 ”انہا“ آج پر موجود دلہن نے ہولے سے ہکارا تھا۔ اسے جاننے میں زرداری نہ کی کہ یہ نام اس حبس کا ہے جو ابھی ابھی اس کے دل پر اپنا نقش ثبت کر رہی ہے۔
 ”انی ہا۔“ اس کے لیوں نے زیر لب لفظوں کو چھو

ٹھا۔ پھر دو کشتی سے مسکرا دیا۔ پھر کوئی مشکل مشکل نہ رہی۔ دلہن بنی جا شستے اسے انہا کے متعلق تمام افشاریں اپنے دماغ کے کیسٹروں میں فیکر کر چکا تھا۔ وہ جارہیں اور ایک بھائی تھا۔ والدین حیات تھے۔ سب سے بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی۔ انہا کا دوسرا بھرتھا۔ جس نے ایم اے جازلم کیا تھا۔ بانی دو بہن اور بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ ابھی اس کی بھی منگنی ہوئی تھی۔ آخری انٹرمیڈیٹ طہماس میز کو مفروہ بنائی۔ ”ظاہر ہے اسے میرے سے اتارا گیا ہے۔“ اگلے روز وہ ماہ سے انہا کے متعلق بات کرنے ہی والا تھا جب اس کے لیے پھر کے متعلق بات کر دیا کہ انہوں نے اس کے لیے لڑکی کو عطا کی ہے۔ ”ماہ طہماس کا اور طہماس ہما کو قائل کرنے کی سر تو ڈکوش کر رہے تھے کہ ان کی منتخب کردہ لڑکی زیادہ اچھی ہے۔ عمار اور مومدہ دوپٹے سے بحث سن رہے تھے۔ بالآخر جب دونوں ہی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے رخ پھیر گئے تو پانے لے آؤ اس دی کر ”دونوں لڑکیاں دیکھ لیتے ہیں جس کو زیادہ دوست لے وہ ہماری ہو جائے گی۔“ چنانچہ دونوں فریقین کو ماننے ہی بنی۔

”دیکھیے گا پامیر یہ پسند ہیوٹ کی طرح اس بار بھی شاندار ہے۔ اور آپ سب کو ماننے ہی بنے گی۔“ وہ غریب کہہ رہا تھا۔
 ”جب کہ میرا خیال ہے اس بار ماما کی پسند آپ کو مات دے دے گی کیونکہ ماما کی منتخب کردہ لڑکی کو میں نے بھی دیکھ رکھا ہے اگر آپ سے دیکھتے ہی اپنی پسند کو نہ بھول جا میں گے۔“ مومدہ نے پہنچ کر دیا۔ پہلے تو وہ جیران رہ گیا کہ خراش کی کون ہی سہی ہے جسے دیکھتے ہی اس کی پسند آپکھیں بند کر کے قصیدہ پڑھنے والی بہن آج اسے پہنچ کر رہی ہے۔ ماما نے اپنی پسند کی ہوئی بیوی تصویر پر کھانسی تو پنا تصویر دیکھتے ہی دھمی مسکراہٹ لبوں پر سچا کے طہماس میز کو دیکھا۔ جو بے ہوش ہند بننا ہوتا تھا۔

”بیٹا میرا خیال ہے تم ہار جاؤ گے۔“ چپانے تصویر پر اٹھائی۔
 ”بھی نہیں بیٹا۔“ اس نے رعونت سے کہہ کر ایک نظر تصویر پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے اچھل پڑا۔ ”مانے گا زیو دیو لڑکی ہے جسے میں نے پسند کیا ہے۔ انہا نام سے نہ ماما کا؟“

”مانے سرائیات میں بلایا۔ سب ہی اس اتفاق پہ کافی محظوظ ہوئے۔ بالآخر تمام کارروائی سے گزر کر ”انہا طہماس میز کے آنکھ میں رونق بھیرنے چلی آئی۔ طہماس میز کو ان باتوں کا بھی خوش نہیں تھا۔ انہا کی زلفوں کے بیچ وٹم میں وہ ہری طرح اٹھتا چلا گیا۔ وہ بے خودی رہتا مگر بیٹی موم پر پڑے سے واپسی پر جب سب کے لیے لائے گئے فکس دونوں سب کو دے رہے تھے تب اسے پہلا جھٹکا لگا۔ شاپنگ میں کچھ چیزیں انہا اور کچھ اس نے پسند کی تھیں۔ اب اسے سکتہ ہو گیا تھا۔ سب اس کی پسند کو رنجیت کر کے انہا کی پسند کو سراہ رہے تھے۔ جو کان تعریف سننے کے عادی ہو گئے تھے۔ اب وہی اپنے فکس کو مومس کریم ہاگل ہو رہے تھے۔ پھر تو جیسے انہا اس کے گھر پر قابض ہو گئی۔ پہلے پر کام میں اس کی بات کو اولیت دی جاتی تھی اور انہا نے ایک جھٹکا اس کی بات کی جگہ بھجوائی۔ اب صبح دشا وہ ایک ہی نام کی کرا مختلف القابات مختلف حوالوں سے سننے کا تھا۔ ”بہو ان کیا کیے گا؟ ہو گھر پر فلاں پیٹ کسارے گا؟“ ”ہو مسز گھر اند کو شادی کا ساگر پر کیا گفٹ دیں؟“ بھائی میں تھر جگر چہن لوں اور تو نہیں لگا؟“ بھائی میں کون سے ہوٹک سے کپڑے خریدوں؟“ کپڑے روزی سے آپ کو سلوانے ہیں آپ کی لکیر اینڈی کمال کی ہوتی ہے۔ بھائی آج کل کون ہی فلم کی آئی ہے؟ میں بلیک جینز پر ریڈ شرٹ پہن لوں۔“ ”پھوور تو نہیں لوگوں کا؟“ ایسی اور اس جیسی بے شمار باتیں اس کے گناہ گار کان روزے روزے اور وہ اپنے گھر والوں کے اطوار دیکھ کر ہولے لگتا۔ صرف گھر

والے کیا رشتہ داروں اور اس کے حلقہ احباب تک نے انہا کو سراہا تھا۔ کل جو لوگ اس کی پرستاشی اس کی منفرد اور بیک اس کے اسٹائل دکھ رکھا۔ دو قار کو دیکس کرتے تھے اب انہی لوگوں پر انہا کا جادوسر جڑھ کے بول رہا تھا۔ اسی پر بس نہیں شاید ہی کوئی دن ایسا ان تین ماہ میں آتا تھا جب اس کے سینکے سے فون نہایا ہو چھوٹی سی بڑی بات تک کے لیے اس کی خدمت لی جاتی تھیں۔ جیسے ابھی چپک پر جانے کی اجازت گھر بیٹھے بابا سے لینے کی بجائے نرسن نے انہا کے ذمہ لگا دی۔ طہاس معیز کی جگہ کوئی اور ہوتا شاید انہی بیوی کی اس قدر قدردانی پر نازاں ہوتا مگر اسے لگ رہا تھا میرے دھیرے اس کی شخصیت پس منظر میں غائب ہو رہی ہے اور انہا غالباً آری ہے۔ وہ دیکھنے لگا تھا۔ حیدر لگے گا تھا۔ اشی شریک سرک سے کتنی مستمک خیز بات تھا؟ وہ چاہتا تھا جب کچھ دیا ہو جائے جیسا انہا کے آنے سے پہلے تھا۔ وہ بھول جائے کہ وہ انہا ہے۔ یاد سے تو صرف اتنا کہ مسز طہاس معیز ہے جس کی اپنی کوئی ذات نہیں ہے۔ شاید اس کا ذمہ تیار ہو گیا تھا۔ روز بروز وہ انہا دار سے متغیر ہو رہا تھا اس سے بچ رہا تھا مگر ان کی بات میں بھی انہا کی نگاہوں کی بجلی جس سے اس پر گری کہ وہ ساری مقابلہ بازی بھول جاتا۔ یاد رہتا تو صرف اتنا کہ وہ اس سے عشق کرتا ہے۔



”بابا جب حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی ہے تو بے نواہ کا منہ ہوتا ہے۔ لڑکیوں کو گھر کی چار دیواری میں رکھ کے لوگ بچتے ہیں کہ لڑکی ٹھیک ہے تو یہ سوچ غلط ہے۔ لڑکی اور اس پر گھس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسے چنی تیزی سے دیا ہے۔ وہ دنی و نغار سے اوپر آتی ہے۔ آج کے زمانے میں وہی لوگ کا سیاب ہیں جنہوں نے لڑکیوں پر اعتبار کیا۔ ان کا مان بڑھ کر ان پر اعتماد کیا۔ یہ کہنے کے بجائے کہ اگر ہماری عزت پر

ذرا بھی حرف آیا تو جان سے مار دیں گے۔ بڑوں کے زمانے کی اونچ نیچ سمجھا کر صرف اتنا کہنا چاہیے کہ ہر کام کر گھر جس سے ہماری اور تمہاری عزت جائے اس کام سے کوہوں دور رہو۔“ اور عورت تو صرف اتنا ہی چاہتی ہے کہ کوئی اس پر اعتبار اور اعتماد کی چادر اٹاے اور جب ایسا ہوتا ہے تو وہ اپنے کروار کی خود گناہ میں جاتی ہے اور میری بیٹیں ابھی محافظوں میں سے ہیں میں اور آپ انہیں بخوبی جانتے ہیں۔“ انہا دار کا ہا کہ قائل کر گئی۔ بابا نے ہائی بھر لی کہ نرسن کو بیک کی اجازت دے دیں گے۔ جب انہا دار کا ہا کو گھر جاسی تو یاس بھٹا طہاس دل ہی دل میں دعا کرتا تھا۔ ”اللہ کرے سر صاحب ان کا کردیں۔ ساتھ ہی انہا کو ڈانٹیں کہ بی بی شادی ہو گئی اب اپنے گھر کی فکر کرو۔ پھر بھول کا ان کی بی بی ٹوٹ جاتا مگر اس کی دعا کے برعکس بابا نے بخوبی جانے کی اجازت دے دی۔ اگر انہا کو خبر ہو جانی کہ اس کا محبوب شوہر اس کے بارے میں ایسی سوچ رکھتا ہے تو شاید اسے چھوٹا مونٹا ایک لپٹی تھا مگر کمال چالاکی سے اس سوچ کو طہاس معیز نے اپنی ذات کے ستون تک قید رکھا تھا۔ انہا بڑی بھلا اور بے حد سنجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اس کا خمیر محبت و خلوص سے گوندھا گیا تھا۔ محبت کرنا اور محبتیں بانٹنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اپنی خدمت پیش کرنے کو ہر وقت تیار رہتی تھی۔ وہ نصن اور بناوٹ سے ہموار تھی۔ طہاس معیز ہر فیملی میں ہر جگہ تھا تو وہ بھی کچھ کم نہیں۔ طہاس معیز خود پرستی میں نازاں رہتا تھا تو انہا دار اپنی صلاحیتوں سے آتی ہے یہ خبر نظر آتی تھی اور اسی بے خبری نے اس کی ذات میں مقناطیت بھری تھی۔ با شہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے سیر پہ سوا سیر تھے۔ مرنے فوس کر کے بھیجا تھا کہ ”موسم بدل رہا ہے کچھ شاپنگ کرلو۔“ اپنی پسند پر وہ اس کی رائے ضرور لیتی اور وہ دل میں زبردست کہہ لیتی میں سر بلا دیتا مگر ماتھے پر شمن لائے بنا وہ اگلے سوٹ کی طرف

بڑھ جاتی تھی۔ نو میدہ نے ہینڈ بیک کی فرمائش کی تھی۔ ”کیسا ہے یہ؟ نو میدہ کبھی سوڈی لڑکی کے لیے بیٹھ رہے گا کیوں؟“ بیک اور گھر سے کچھ کا دیدہ زیب ہینڈ بیک دکھا کے وہ اس کی رائے لے رہی تھی۔ ”میرا خیال ہے یہ بیٹھ ہے۔ دیکھو کوئی ابھی ہے۔“ جلدی سے ٹھیکٹ سے اس نے بلو کلر کا بیک اسے دکھایا۔

”ہوں ہے تو واقعی شاندار پھر کون سائیں۔“ وہ فطری سادگی سے گویا تھی۔ ”جی لے لو نو میدہ میری پسند آگے بند کر کے قبول کرتی ہے۔“ لہجہ قافز سے پر تھا۔ وہ دھیان نہ دے سکی۔ ”جی بہت حسین ہے بیک کی ضرورت تو پر تھی رہتی ہے۔ میں رکھ لوں گی۔“ اس نے مفاہمت کر لی۔ ”میں تو یہی لوں گی بھائی۔“ جب نو میدہ نے بیک دگرے بیک کو دوبار لیا تو طہاس کا چہرہ کبھی قدر چھپکا پڑ گیا۔

”کوئی بات نہیں یہ تم رکھ لو میں یہ لے لوں گی۔“ اس نے بلو بیک رکھا۔ ”بھائی! یہ آپ کی پسند کو کیا ہو گیا ڈوئس کتنے آؤٹ آف فیشن ہیں۔ یاد ہے پچھلے دنوں آپ نے کتنے یونیک ڈوئس مجھے دکھائے تھے؟ کیا اٹھا لائیں؟“ نو میدہ نے طہاس معیز کے لئے سوٹ پرے کر دیے۔ ”ان کپڑوں میں کون سا زندگی کا جائے گی؟“ ممانے سرزنش کی۔ ”جی بتائیں یہ آپ نے سلیکٹ کیے ہیں یا سیزمیں نے چڑا دیئے؟“ نو میدہ کو ابھی اور طہاس معیز کا زکی کی چابی اٹھا کے باہر نکل گیا۔



طہاس معیز کو بھٹا انہا دار کو بہت مشکل لگتا تھا۔ بل بھرمیں وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا تھا۔ اس کی

ذات کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں لگتا تھا جسے تمام کے وہ اس کے مزاج کے موسوں سے واقف ہوئی۔ بظاہر اس کے ساتھ پڑی محبت سے پیش آتا اور نگلی بڑی گر جوشی ہوتی تھی مگر پھر ایک دم سے کبھی کبھی اپنی بن جاتا۔

طہاس کے سر میں رد ہور ہا تھا۔ چن مکر لے کر وہ لیٹ گیا۔ اس کے منہ کرنے کے باوجود وہ جل ڈال کر اس کا سر دبا رہی تھی۔ نرم نرم انگلیوں کی گردش اسے بے حد لگی۔ اس کی کیف سا پھار ہا تھا۔

”اتنا کام مت کیا کریں آپ کی جسمانی تسکین میری روح کو کھٹا دیتی ہے۔“ دقتیں لہجے میں وہ امرت رس نکال رہی تھی۔ ”پر کھیں کھول کے اس نے انہو سے دیکھا تھا اور پھر بے خود ہوئے لگے۔ اس کی نگاہوں نے اسے جکڑ لیا تھا۔ ”جی بھئی میرا دل چاہتا ہے کہ میں انہا کے میں دنیا کے ایسے جزیرے میں سے جاؤں جہاں ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا نہ ہو یعنی میں اور تم۔۔۔۔۔ اسی اثناء میں فون کی بیل بج گئی۔ انہا زور سے ہنسی۔ ”سہیں آپ کا ریب تو نہیں؟“ سی ایل آئی پر فہر دیکھ کے اس کے دل سے بے ساختہ نکلا۔

”ہاں تمہارے گھر کا نمبر۔“ وہ خوش ہو رہا تھا کہ آج قضا ہو گیا تو اس کا خیال غلط ثابت ہو گیا۔ ”ہاتھ تو کتنے ہو رہے ہیں اب تک ان کر دیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اب تک ان کر دیا۔ کیا ایک ہی سر میں دردی میں تیز ہو گئیں۔ ”جو بس حطرہ بول رہی ہوں۔“ ”خبر تیرے؟“ اس کی غیر معمولی آواز پر وہ فگر مند ہو گئی۔ جب کہ اس کے کلب کچھ گئے۔ وہ فون کی طرف متوجہ تھی۔

”جو بزنس چپک پر گئی تھی اب تک اس کی واپسی نہیں ہوئی۔“ ”چپک میں درو پر تو ہو جاتی ہے۔“ سمجھایا۔

”لیکن امام بہت غصے میں ہیں زمین کی خبر نہیں۔“
 بلاشبہ بہنوں میں بہت محبت تھی۔
 ”تم ماما کو بلاؤ میں بات کرتی ہوں۔“
 ”اوکے ہو دلدادہ۔“

”اللہ کرے سامو جی خوب مرمت کریں زمین کی اور ہماری روجہ کو تو خوب کھری کھری سنائیں۔“ وہ حسب توفیق دعا گو تھا۔ چند باتوں کے بعد وہ اصل بات کی طرف آئی۔
 ”ماما! زمین کیلنی تو نہیں مگی ہے جو آپ پریشان ہو رہی ہیں۔ اسکول کے میل کی لیٹل پیچڑ اس کی فرینڈ ز اور سامنے والی صفی بھی تو اس کے ساتھ ہے پھر ایئر کنڈیشننگ کیس ہیں؟“
 ”مطرحہ اسے تقریباً فون میں کھس کے اطلاع دی۔ مقصد دوسری طرف موجود انہما کو سنا تھا اور وہی ہوا اس کا انداز ذرا بدل گیا اور بہنوں کی چالاکی پر طہاس مل کھائے گیا۔
 ”ماما! دیکھیے اسے ڈالنیے گا نہیں۔ اس کی خوشی ملیا میٹ مت پیچھے گا نہ سارا مزہ و کرا ہو جائے گا۔“
 ”سن لیا داؤی اماں فون رکھو۔“ خوشگوار موڈ کے ساتھ مامے فون رکھ دیا تو وہ بھی سانس بھر کر رہ گیا۔
 ”کاش سامو ماں آپ تو میری خواہش پوری کر دیتیں۔“ غمخیز دیر بعد زمین نے انہما کو ٹھیکس کہنے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ چٹکے کا حوالہ سنا ہی تھی اور طہاس سحر گرا ہم بتل کوکوں پر تھا۔



”یار! زندگی بہت یار ہو رہی ہے۔“ عباد نے بڑے مزے سے نکل اتاری۔
 ”تم از کم تم تو مت کہو۔“ نو میدہ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ چڑا ہوا ڈھٹائی سے سگرایا۔
 ”غیریت فارغ نظر آ رہے ہو کبھی تمہاری انیس اور موجودہ کرل فرینڈ ز نے تمہارے خلاف جلوس نہیں نکال لیا؟“

”نہیں ابھی پھر خیند نہیں آئے گی۔ تمہارا پروگرام رت چکے گا ہے؟“
 ”بس پرہی۔“ اسے ٹپلے ہو رہا تھا وہ اس سے باتیں کر کے نہ نکلتی ہے۔ انڈیا کا دل بنا کر بائیں تھلی پر ہلکے ہلکے راتے ہوئے اس نے ناز سڑو عباد کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ وہ مصنف نازک کی خیند ہی اڑانے کی صلاحیت رکھتا تھا اور پھر طہاس معز کا بھائی تھا۔
 ”عباد تمہارے دل میں میرے لیے کتنی عزت ہے؟“ تنہید باندا رہی تھی۔
 ”آپ کو چند ماہ ہوئے ہیں اس گھر میں آئے مگر آپ ہمارے گھر میں رہ چکے ہڈی کی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اس میں ناٹھنی مانن پرسنٹ آپ کا کمال ہے کہ آپ کبھی نہیں غبر کی رہی ہیں۔ رسی عزت کی بات تو طہاس بھائی کی بخشی عزت کرتا ہوں اس سے نہیں زیادہ عزت آپ کی میری نظروں میں ہے۔ میں نے آپ کو بھائی نہیں بڑی بہن اور اس کی نظر سے دیکھا ہے۔“ لہجہ سچائی سے لبریز تھا۔ چہرے کی ہلکی سرخی نے انہما کو کرل قدر مست دی۔
 ”ٹھیکس عباد تم میرے بارے میں اتنے خوب صورت انداز میں سوچتے ہو۔“ بہن کی نسبت سے اگر میں جھپیں کوئی مشورہ دل تو تم بائینڈ تو نہیں کرو گے؟ کیا میں تم سے چند سوالات پوچھ سکتی ہوں؟“
 ”آپ کو اجازت مانگنے کی ضرورت ہے بھائی آپ جو چاہیں پوچھ لیں جواب دینا مجھ پر فرض ہے۔“ اس کے اعکسار بھرے انداز پر عباد جذباتی ہو گیا۔
 ”سوالات پر مسئلہ بھی ہو سکتے ہیں۔“ وہ بات کرنے سے پہلے روار کر رہی تھی۔ کوکوں کے مزاج تو برسوں ساتھ رہنے پر سمجھ میں نہیں آتے وہ تو چند ماہ کی بیانی تھی۔ اسے یہ بھی ذرا تھا پر مسئلہ باتیں کرنا اگر وہ تنگ مزاجی کرکڑ تو اس کی اپنی ہی نظر میں کیا عزت رہ جاتی۔
 ”کوئی بات نہیں آپ کر سکتی ہیں۔“ عباد نے دل

ہی دل میں ڈرتے ہوئے آخری سب کے لے کر گگ سائیڈ پر رکھ دیا۔ پھر پوری دھجی سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”تم اپنی ان مصروفیات کے بارے میں بتاؤ گے؟“ اشارہ فون کی طرف تھا۔ عباد کے چہرے کا رنگ صفیر ہو گیا۔ اسنے اس کے یوں پر چٹکی لگی مسکراہٹ بنی۔ اسنے اس سے چھوٹی نو میدہ نہیں مگی جسے چڑا کر رکڑ جاتا۔ بلکہ سامنے وہ ہستی جس کی عزت وہ خود پر واجب سمجھتا تھا۔ اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہو گیا ہوئی۔
 ”تم اپنی اے کر چکے ہو! شاء اللہ خوب ہو اوپر کا اس سے تعلق رکھتے ہو۔ خاندان نام سب کچھ اے دن ہے۔ پھر تمہاری ہے بھائی تمہاری ذات پر بدنامی کی طرح ہے کیوں؟“
 ”بھائی! میں تو.....“

”میں جانتی ہوں لڑکیاں تمہاری طرف خود بڑھتی ہیں۔ میں نے دو پہر کو کہا تھا کہ لڑکیوں نے خود کو اور اڑاں کر لیا ہے تو بے جا نہیں کہا تھا۔ اچھا چلو یہ بتاؤ تم کسی بھی کرل فرینڈ کے ساتھ سیرس ہو؟ کیا تم ان میں سے کسی کو کبھی لائف پارٹنر کے لیے منتخب کر سکتے ہو؟“ وہ جانتی نظروں سے اس کی جھکی نگاہوں کو دیکھ رہی تھی۔
 ”یقیناً نہیں ڈونٹ مائنڈ کر مردوں کی نیچر ہے وہ لاکھ کرٹ ہونڈ شریک سفر کے لیے ان کا انتخاب ان چھوٹی کٹی ہی ہوتی ہے۔ جس پر نظر کی گرد بھی نہ پڑی ہو۔“ آتم روٹنگ۔
 ”نو! کیا کبھی تمہاری آواز نکلی۔“
 ”جتنی لڑکیوں سے تمہاری فرینڈ شپ ہے میں باقی ہوں زیادہ تر تمہاری طرح ناٹھ پاس کر رہی ہیں۔ لیکن کھیل ہی کھیل میں لڑکیاں سیرس ہو جاتی ہیں۔ لڑکی کسی بھی طبقے کی ہو بے باک ہو یا شرمیلی۔ اندر سے سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ جذباتی چاہے جانے کی خواہش مند۔ سراسر جانے کی آرزو مند ان سے نہیں

.....

کھینچے اپنی قتل عمد ہے۔ تم نے کبھی ان لڑکیوں کی طرف پلٹ کر دیکھا جو اب انیس کے خانے تک محدود ہو چکی ہیں۔ لڑکیاں ازل سے محبت نامی چیز سے ہارنی چلی آتی ہیں۔ لڑکیاں پلیٹ فارم کی مانند ہیں جس میں تم مرد بیل بھر بھر تے ہو اور ہرنگل جاتے ہو اور پلیٹ فارم اپنی جگہ موجود رہتا ہے تم نے کبھی سوچا کہ تمہاری پل بھر کی رفاقت نے کسی کی ساری حیات کو کھن لگا دیا؟“

عباد کی شرمسار نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اس کی انیس فریڈ نے کسی اور سے شادی کرنے سے انکار کر کے اس کا نام لیا تھا اور اس کے پیچھے بہت سے پراس نے سوسائٹی کی کوششیں کیں تھیں۔ صدمہ شکر کہ اس کی زندگی بچ گئی اور پھر وہ چلی گئی۔ عباد نے بھی سکون کا سانس لیا کیونکہ یہ تو بے تحاشہ کہ وہ ناٹم پاس کر رہا تھا اور اب انہما کی باتیں اس عرق نماست میں ڈھونڈ رہی تھیں۔ سرش تو اسے گھر میں سب ہی کرتے تھے مگر انہما دقار کے حکم لہجے میں نہ جانے کیا بات کہی کہ عبادت کی عقیقہ داد یوں میں اترنے لگا۔ ”ہم سب کو کتبہ تقدیر نے جوڑے کی شکل میں اتارا ہے۔ ہم امانت ہیں دنیا میں اک ان دیکھو ان جانے شخص کی تو کیا ہی اچھا ہو کہ ہم امانت دار کو امانت جوں کی توں پہنچائیں۔ اپنے جذبات و احساسات کے امین بن جائیں خائن نہ بنیں۔ اپنے لفظوں کی قبروں میں قید نہ کریں۔“ انہما دقار بیٹھا تو قطرہ قطرہ لفظ اس کی ساعت میں اترنے لگی تھی۔ ”اس دنیا کے کسی نہ کسی کو نے میں ایک لڑکی تمہارے نام پر پیشی ہے۔“ جو تمہاری ذات تمہاری محبت کی اصل تقدار ہے۔“

”پلیز بھائی لیواٹ۔“ عباد شرمسار سے ہاتھ مائل رہا تھا۔ ”میرا اعتقد تمہیں شرمسار کرنا نہیں تھا تو۔“ ”نہیں بھائی آپ نے تو میرے احساس کو بیدار کیا ہے۔ آپ نے مجھے بہت سے دلوں کی آہ سے بچا لیا۔ وہ انچھوٹا محزون تھا۔“ ”تھکنکس تم نے میری بات سمجھ لی۔“ انہما دقار نے چہرے پر سکون پھیل گیا۔ ”سزیا رات یہیں گزارنے کا ارادہ ہے۔“ طہماس میجر وہاں ہاٹ ٹائیٹ ڈریس میں چلا آیا۔ ”اے رات کو تم اپنی بھائی کو کون سی کہانی سنارہے ہو؟“ وہ عباد کی طرف مڑا۔ ”قسم لیں جو میں نے چند جملوں کے علاوہ کچھ کہا ہو۔ کہانی تو بھائی سنارہی تھیں وہ بھی سبق آموز کیونکہ جو ہے؟“ عباد خوشی سے گویا تھا۔ انہما کسراتے ہوئے سمجھنے سے انچھوٹا کھڑی ہوئی۔ ”اوکے گڈ ٹائیٹ۔“ عباد زینے کی طرف مڑ گیا تھا۔ ”تم خود چلو گی اٹھا کے چلو؟“ ”قرب آکر سرگوشی کی۔“ انداز بے حد شیر تھا۔ عبادی لبوں پر دلکش مسکراہٹ دھساں تھی۔ وہ حینپ کی۔ اس کے وجود کے گرد بازو پھیلائے وہ اسے لیے زینے کی طرف بڑھ گیا۔



اجتباب کر کے اس نے وہاں ساڑی زیب تن کی تھی۔ بازو بے ہاٹ نکوں اور ٹھنڈی سے بیوں کی دلکشی کو کبھی جان لگا دینے جتے۔ لائٹ بیگ میں وہ ہر ایک کی منظور نظر آ رہی تھی۔ اس کے اخلاقی دا طوار کی سب سے تعریف کر رہے تھے۔ وہ مردوں سے بھی گفتگو کر رہی تھیں لیکن ایک حد میں رہ کر اور اس کے گرد دائرے کو دیکھ کر مردی زیادہ سہارے رہتے۔ یوں بھی مردوں کو تو اب بھی چیزوں میں افریش محسوس ہوتی ہے جو نظر کے سامنے رہے بھی دور لگے۔ شوخی قسمت کر گیا کہ کوئی یونیورسٹی فیلو نہ کر گیا۔ انہما کی مزید مدد سرائی نے طہماس میجر کو اچھا خاصا چراغ یا کرو یا مگر اس کے چہرے سے کوئی اندازہ نہیں کیا سکتا تھا وہ رفاقت کے احساس سے رگد رہے۔ اسے کوفت کا سامنا تھا۔ آج تو اس کی دوستانی بھی مردوں کو چھوڑ گئی تھی۔ پر اس کی خبر تو ساتھ لکھی انہما کو بھی نہیں تھی۔

”آج کل کی پارٹیز میں تو آدھی رات بیت جاتی ہے۔“ طہماس میجر نے گردن موڑ کے اس کی طرف دیکھا۔ انکھیں موندھے سر سے لگنے کی مصدود کا شکار نظر آ رہی تھی۔ حسب معمول وہ حسن کی کلیوں میں گھر گیا۔

”آج بڑی تعریفیں سہی تم نے۔“ ”بجہ عام یہ تھا۔ صبح چہرے پر تھکنک کی بلی کی رقم اسے بے حد بھلی لگی۔ اس نے انکھیں کھول دیں اور سیدی ہو گئی۔ ”منتظر اللہ تا بحرم کے منہ سے تعریف تن کے احساس گماہ وہاں جاتا ہے۔ میرا تعریف تو وہی من کو بھاتی ہے جو لفظ عزم کے لبوں سے نکلیں۔ آپ کی تعریف میری روح کو شاد کر دیتی ہے۔“ اسے یہ غور دیکھتے وہ چمور لیے میں کہہ رہی تھی۔ طہماس میجر کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو بیوی کی اس سوچ پر غار ہو جاتا مگر اسے موازنے سے فرصت ملتی تھی۔ ”سب نے میری تعریف کی لیکن آپ نے نہیں کی۔“

”دروغ گوئی سے ذرا کم کام لو۔ تیار ہوئے۔“ بعد سب سے پہلے میں نے تمہاری تعریف کی تھی۔ اب بھوٹ بول کے احساس گماہ نہیں ہو رہا ہے؟“ ”جھوک دینے میں تو وہ ماہر ہو چکا تھا۔ وہ مسکرا دی۔“ ”تم جادو گر نی ہو پوری طرح قابو کر لیا ہے مجھے۔“ مقبوم ذوق تھا۔ اس کی چاہت میں شرمشاد دی۔



رمضان المبارک کا پرکٹ مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ زندگی عام ڈگر سے بہت چلی گئی۔ بحری افکار روزہ نماز تراویح۔ ان سب چیزوں نے زندگی میں ایک لہر دھا دی تھی۔ سمرال میں اس کا پہلا رمضان تھا گردہ یوں ہر کام کشائی جیسے برس ہا برس سے اس گھر کے امور سر انجام دے رہی آ رہی ہو۔ عید کی شاپنگ بھی دھڑا دھڑ ہو رہی تھی۔ انہما اور نویدہ ہمشاپک سے اومش تو سب کو شاپنگ دکھانے لگیں۔ ”تم نے اپنے لیے کچھ نہیں لیا؟“ ”وہ سب کے لیے کچھ نہ لکھا تھا انکھیں مگر اپنے لیے کچھ بھی نہیں لیا ہے۔“ طہماس میجر کا حیران ہونا بھانپا تھا۔ ”نہیں؟“ ”کیوں؟“

”کیونکہ آپ جو ہیں۔ میں عید کے دن وہی جوڑا پہنوں گی جو آپ خود میرے لیے لائیں گے۔“ ”اگر میں نہ لاؤں پھر؟“ محبت بھری فرمائش پر پیچھا۔ ”پھر بہت بری گز رہے گی آپ کی عید۔“ پیار بھری دھمکی تھی۔ اس کے دل پر بوجھ بھارتا ہوا تھا۔ وہ عبادت کو سرسجود ہوتا تو اسے لگتا اس کی عبادت بارگاہ الہی میں قبول نہیں ہوگی۔ وہ خود کو ذہنی طور پر تیار تصور کر رہا تھا۔ انہما کے دہانہ پن پر بھی کسی اسے بے حد نماست ہوئی تھی۔ اگر وہ جان جاتی کہ وہ اس کے بارے میں کس انداز میں سوچتا ہے تو کیا نہ گزرتی اس پر۔ انہی دنوں نویدہ کے لیے عیاض کا پر پوز ل آیا تھا۔

انہاں نے اتنا توصاف انکار کر دیا۔ طہاس معیرو تو گویا بھرا
 بیٹھا تھا۔ ضبط کی مٹائیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ
 چھوٹ گئیں۔
 ”جسہیں کیا حق پہنچتا ہے انکار کرنے کا؟“ اس کا
 ٹھنڈا ٹھار لہجہ انہاں کو جہاں کا تھاں کر گیا۔ سب اس کے
 انداز پر دگ رہ گئے۔ اس کا یہ انداز کبھی کسی نے نہیں
 دیکھا تھا۔ وہ بھی انہاں کے لیے۔ طہاس کو اس بات کی
 پروا نہیں تھی کہ عیاض اس کا دوست ہے۔ اس کے
 چرخ ہوا بنے کی وجہ اپنی بات رو ہوتی تھی۔ انہاں کی
 کشادہ آنکھیں مزید کشادہ ہو گئیں۔ اس نے بھی تہیہ کر
 رکھا تھا آج ان نگاہوں کے چال میں جھن کرے بس
 نہیں ہوگا۔ اس کے اندر کا خود مرست مرد کینہ تو ز
 نگاہوں سے انہاد واکے حیران پریشان چرے کو کھک
 رہا تھا۔

”برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے اس گھر میں
 رخصت ہو کر تم آئی ہو میں نہیں۔ میرے ماں باپ
 بہن بھائی سب نے ہتھیار لیے ملک ملک جو لوگ میری
 بات کو حرف آخر سمجھتے تھے آج ان نگاہوں میں تم نے
 میری بجائے بھائی۔ سیکے کے رابطہ سرال میں پیچہ کر
 مل کر گئی ہو جب اس گھر کے کاماٹے تمہارے بغیر
 نہیں چل رہے تھے تو نہیں شادی کی ضرورت ہی کیا
 تھی۔ سیکے میں بیٹھ کے مل کر گئی رہیں رابطہ۔ میری
 زندگی میں رابطہ کر لی ایٹ کرنے کی کیا ضرورت
 تھی۔ ذہنی سکون جیمن کیا میرا۔ تم نے تہیہ کر رکھا
 ہے میری مقابلہ بازی کا رابطہ کوئی یاد رکھو۔ کوئی کیا سپاٹ
 کوئی پر نجوم یا کوئی سوٹ نہیں ہے جس پر تمہارا مرضی
 چلے گی۔ نویدہ کی شادی عیاض سے ہی ہوئی۔ اگر تم
 ایسا نہیں چاہتیں تو شوق سے سیکے جاسکتی ہو۔“ لیے
 لیے ڈگ بھرتا وہ زینے کی طرف مڑ گیا۔ ماسا کے
 پیچھے کی جیمیں پھر کھیں نہیں تھیں۔ عباد اور نویدہ کے
 لیے بھی طہاس کا یہ روپ شاگ تک تھا۔ حیرت کو رخ
 دیکھ کر اس کی دجوبی کو وہ قریب آ گئے۔ پتلی پتلی

باعث بھائی ان حالوں کو نہیں۔ آپ کو عیاض بہت
 عزیز ہے تو آپ بھائی سے انکار کی وجہ تو پوچھ لیتے۔
 بھائی انکار نہ کرئی تو میں کروچی آپ سے کیوں لیا یہ
 سب؟“ نویدہ کی تیز آواز پر اس نے سر اٹھ کر دیکھا۔
 ”نہیں انہاں سے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا
 طہاس۔“ ماما فریدہ انداز میں گویا تھیں۔
 ”آپ سب اور آپ کی بہو ٹھیک ہے۔ میں ہی
 غلط ہوں۔“ وہ چڑ گیا۔
 ”ہاں۔“ نویدہ منڈرائنداز میں بولی۔
 ”فونی مت بھولو کہ تم اپنے بڑے بھائی سے
 مخاطب ہو۔“ اسے غصہ آ گیا۔
 ”نہیں پہلی آپ میرے بڑے بھائی۔ میرا بڑا
 بھائی جو تھا وہ تو کبھی آپ کو رہا۔ آپ تو رقابت کی آگ
 میں جلنے والے انسان ہیں۔ آپ میرے بڑے بھائی نہیں
 ہیں۔“ نویدہ کی حالت دیوانوں جیسی ہوئی۔ عباد نے
 اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔ وہ مسلسل روئے
 جا رہی تھی۔

”بھائی نے کیوں انکار کیا۔ جانا چاہیں گے
 آپ؟“ اس کے کب پیچ گئے۔ ”عیاض کا ہمارے کالج
 میں ان گنت لڑکیوں سے افیر چل رہا ہے۔ وہ دن
 اس گنگ اس کا سائبر بولس ہے۔ نت نئی لڑکیوں کو
 استعمال کرتا اس کا پیشہ ہے۔ کئی بار اس نے راسارت
 روکا میں چاہا اور آپ دونوں سے یہ بات شیئر نہ کر سکی کہ
 یقیناً خون خرابا ہوتا۔ میں نے بھائی سے شیئر کیا تو وہ
 میرے ساتھ کانٹا نہیں۔ انہوں نے عیاض کو کھینچا
 برا بھلا کہا مگر وہ مسلسل دھمکی دیتا رہا۔ کہیں وہ مجھے
 کڈ بیٹ نہ کرے اس خیال سے بھائی نے کہہ دیا کہ
 تاجا تو ذرا راج سے عورت کو حاصل کرنے والا مرد نہیں
 ہوتا۔ یہی بات باعث فائدہ بھی رہی اور نقصان بھی۔
 فائدہ یہ ہوا کہ اس نے مجھے کڈ نہیں کروایا۔ وہ مگر
 گرتا۔ ایک دن اس نے حد سے زیادہ ہڈ پڑی کی تو
 میں نے اسے پھڑوے مارا۔ تب اس نے دھمکی دی کہ

مجھ سے شادی کر کے وہ میری زندگی جہنم بنا دے گا۔
 بھائی نے چاہا کہ وہ آپ کو کھل کر سن کر میں نہیں
 روک دیا۔ میں نہیں جانتی تھی آپ لوگ حیرت میں
 آکر کچھ کہیں نہیں پھرا پھر ابھی ہو گئے اس کے ملے کا
 کوئی جانس نہیں تھا مگر اس نے جالاک سے آپ سے
 دوستی کی اور اب پر پوزل بیچ دیا۔ آپ بتائیں بھائی
 نے انکار کر کے غلط کیا؟ کیا اب بھی آپ میری شادی
 عیاض سے کریں گے؟“ دونوں حقیقت جان کے
 بھونچکے رہ گئے۔ اس کی شرمار نظرس جبک گئیں
 مٹھیاں بیچ گئیں۔
 ”خدا خواستہ تم کو کچھ ہو جاتا تو۔ کیوں چھپا میں تم
 نے ہم سے یہ باتیں؟“ عباد خفا ہوا۔
 ”ماسا کو کبھی؟“
 ”ان دونوں نے کل بتائی ہیں مجھے ساری باتیں۔“
 انکیشن کے زیر اثر وہ ابھی تک دنیا و مابینا سے
 غافل تھی۔ پتا سے سب نے اصل بات چھپائی۔ یہی
 بتایا گیا کہ کمزوری کے باعث پکڑا گیا تھا۔
 ”میں سمجھنے سے قاصر ہوں طہاس تمہیں اچانک
 ہو گیا کیا تھا؟“ معصوم پتلی پر تم نے کیسے کیسے بہتان
 لگائے تمہارے پتا بھی ایسی مل لکھوانے یا دوسرے
 کام کے لیے تمہارا انتظار کرتے تو انہاں آگے بڑھ کے
 وہ کام خود کر دیتی۔ یہ کہہ کر کہہ کر طہاس سمجھ گئے
 ہوں گے۔ وہ بیٹے ہیں تو میں آپ کی بہن ہوں لائیں
 میں کر دوں۔“ ایک بار میری دوا لی ناقص بھول گئے تو
 اس نے نہ کھم داری یہ کہہ کر اسے ذمہ لے لی کہ
 طہاس بڑس میں اٹھے رہتے ہیں۔ گھر بلو دم داریاں
 اٹھانے کے لیے میں ہوں نا۔“ تمہیں ریلیف دینے
 کے لیے اس نے ہر ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ میں
 سمجھتی تھی میرا بیٹا عام مردوں سے مختلف ہے مگر یہ میری
 بھول بھی تم بھی انہی مردوں میں سے ہو جو بیوی کی
 شخصیت کو کھل کے رکھ دینا چاہتے ہیں۔ کئی بے سوچا
 ہے کہ جس عورت سے اس کا نام نمود جیمن رہے ہو

اسی صورت کی کوکھ سے تمہاری نسل چلے گی؟ تمہارے بچے کی تربیت وہی ہے نام و نشان عورت کرے گی؟ جس عورت کے پاس اپنی ذات کا نام نہ ہو وہ عورت اپنے بچے کو دے ہی سکتی ہے۔ انفس کرم جیسے مرد سرچنے نہیں۔ انبیاء انھوں میں ایک ہے۔ ہمیں اس نے اونچی آواز میں بات نہیں کی ہر بار مجھ سے کہتی ہے۔ ”سامری کوئی بات آپ کو بری لگے تو مجھے فوراً ردش کر دیجیے گا۔ دل میں مت رکھیے گا۔ بات دل میں رکھنے سے دلوں میں دوری آ جاتی ہے۔ تم نے عینک کا طعنہ دیا ایک لڑکی خون رشتوں کی قربانی دے کر کرنی دیا میں قدم رکھتی ہے۔ پر اے کھ کو اپنے خون سے پیچتی ہے بجائے اس کے کرم اسے اتنی محبت دو کہ وہ خونی رشتوں کے لیے اوس نہ ہو تم مرد چاہے ہو کہ لڑکی بھول جائے کہ اس کا کوئی عینک ہے۔ اس کے بھی ماں باپ ہیں۔ کتنے خود غرض ہوتے ہو تم مرد۔ تمہاری بھی تو بہن ہے کل کو اس کی بھی شادی ہو جائے گی تو تم بھول جاؤ گے اسے؟ یا یہ نہیں فراموش کر دے گی؟ جس آئین میں گر کے چٹا سیکھا ہو اسے فراموش کرنا آسان نہیں ہوتا کرم مرد عورت کے جذبات سمجھنے کی کوشش کر جب نہ نا۔“ ممالفظوں کے جوئے تابڑ توڑ مار رہی تھیں۔ اس کی شرمسار نظرس اوپر اٹھ کر نہیں دے رہی تھیں۔

”کب تک بڑی رہے گی یہاں کرے میں لے جاؤ۔“ ماما کو ہمیں۔ اس کا غافل وجود ہانبوں میں سینے دو زینہ نہ کر رہا تھا۔ نری سے بند پر لٹایا۔ سیدھا ہوتے ہی نگاہ اس کے سفید چہرے پر جم گئیں۔ چند لمحوں ہی میں خون چہرے سے غائب ہو گیا تھا۔ ”اچھی لڑکی! ایش دانی خور پتی کا ارادہ انسان ہوں جو کبھی تمہاری دالہا نہ محبت کو کچھ نہ رکھا۔ ہمیشہ تم سے موازنہ کرتا رہا۔ مگر اب سب ٹھیک ہے تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ۔“ کمبوں کے بل اس کے وجود پر جھک آیا۔

تھوڑی دیر بعد سحر کی دقت ہو گیا تھا۔ روز کی گہا گہی مفقود تھی۔ سب نے بے دلی سے سحر کی۔ سب انہما کے وجود کے عادی ہو گئے تھے۔ وہ خود سب کی طبیعت بھری نہ تھی اور سب نرے کرتے تھے۔ اچھلی طہماس اور وہ چار بھری چھان پاتی تھی۔ آج وہ خالی پلٹ کر لوہا۔ با تھا اور اس کی شخصیت جو تیر کر۔ ”تم چمچ بچھ رہا تو قابض ہو گئی ہو بیٹی! میں نہیں رہ سکتا تمہارے بن۔ تم ہی تو ہو جس نے مجھے چاہے جانے کی لذت میں سر ہا بھگو دیا۔ تجویہ بیٹی بن جانی ہے مگر بیٹی تجویہ کسے کہتی ہے بیٹھے تم نے سکھا ہی۔“ میرا اناہاد وہ خود پاں پاں ہو گیا ہے۔ دراز تو تم پہلی ملاقات میں ہی قہقہے پائی تھی۔ مگر میں خود سے لاتار ہا خود کو چھلتا رہا۔ میں جو خود کو کش سمجھا تھا۔ جو اپنی محبت میں جھلتا تھا۔ خود سے اقرار کرتے ڈرتا تھا کرم مل کے میں نہیں رہا۔ پیچھے اپنی انا کی جیت مقصود کی۔ میں میں چاہتا تھا تم مقابلہ بازی نہ کرو کرم تو انجان میں تاب بھی انجان دیکھ تو لٹا اچھا ہوتا۔ کم از کم اس حالت کو تو نہ پہنچتیں۔“ بند پلکوں پر نظرس دے بجائے اس کی پٹیلی کو ہولے ہولے دباتے ہوئے وہ بے آواز لنگھ کر رہا تھا۔

راتوں رات ہی عباد عیاض سے ملنے کے لیے پرتول رہا تھا۔ اس کے گھر فخر کیا تو بڑی اچھی خبر ملی کہ بیرونی کی بڑی کیفی اسکل کرتے ہوئے وہ باگ باگ میں پکڑا گیا ہے۔ اس خبر سے سب ہی کو سرت ہوئی۔ طہماس میز کا بازو اس کے وجود پر دراز تھا۔ خود کی دنیا میں قدم رکھنے اسے سینے پر بھاری پن کا احساس ہوا۔ اس کے وجود کی موہم کی جنبش سے طہماس نے بازو ہٹا کر اتر نہر جازو لیا۔ ”پانی“ وہ غوغا کی میں بڑ بڑائی تھی۔ روم فرم سے جوں کا جب نکال لایا۔ گلاس میں جوس انڈیلا۔ گردن کے چپے ہاتھ دے کر اسے سہارا دے کر بٹھایا پھر گلاس اس کے

لبوں سے لگا دیا۔ ”سحر کی دقت نکل گیا؟“ خود گامی کے انداز میں بڑا دے وال کا ک کی طرف دیکھا۔ ”وقت نکل گیا ہے تم نے۔“ ”میں میں بنا سحر کے روز دھک لوں گی۔“ اس کا گلاس والا ہاتھ پرے کیا۔ ”روزے کے لیے ضروری ہے کہ بندہ تندرست ہو لی لوشا باش۔“ اس نے گلاس لبوں سے لگا دیا۔ ناک میں ڈالی گئی دوا کے باعث اسے حلق میں کڑواٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے میں بقیہ روزہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے جوس پی لئی۔ گلاس دوبارہ بھر کر طہماس نے اس کے لبوں سے لگا دیا۔ ”اور نہیں۔“ تیسرا گلاس تیار کرتے دیکھ کر ٹوکا۔ ”اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟“ بڑی اناہیت سے اس


کی طرف دیکھا۔ استفسار کر رہا تھا۔ آنکھوں میں شرمندگی ہلکے بے رہی تھی۔ بے ہوشی سے پہلے کا منظر یاد آیا تو اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ جوس پوری طرح بیدار ہو گئے تھے۔ آگ برساتا لہجہ دھیان میں آیا تو خاموشی سے اس کا بازو اپنی پشت سے ہٹائی۔ ”ہتی۔“ طہماس اس عذرت کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔ ”مجھے خیر دہی ہے۔“ سیات انداز میں گویا ہو کر رخ موڑے لیٹ گئی۔ رنگے انداز پر طہماس معیر ہاتھ ہٹا رہا گیا۔ سیمسوس کی شب سب نے عبادت میں گزاری۔ سب کے منع کرنے کے باوجود اس نے روزہ نہ رکھا۔ یہ یطمان دلا کر وہ بافت ہے۔ اس نے پچھلی شب کی بدھمی کو فراموش کر دیا تھا۔ سب سے پہلے کے انداز میں مخاطب تھی۔ علاوہ طہماس

بھروسے اپنی ناک کا آئینہ کرنا ہے پہلے

جدید ہومیو پیتھک انسٹی ٹیوٹ اور تجربے سے تیار کردہ انتہائی زود اثر دوا

Naricol Tablet

ایک آہستہ ضرور استعمال کر کے دیکھیں انشاء اللہ ضرور شفا ہوگی



نزلہ دماغی ہو یا الرجک یا موسمی تبدیلیوں سے ناک کی ہڈی یا گوشت کے بڑھنے سے ہو، سرد مستقل ہونا یا سانس لینے میں دشواری کیلئے مجرب دوا ہے۔

ایک ماہ کا کورس 220 روپے۔ گھر بیٹھے V.P پارسل منگوانے کیلئے خط لکھیں

مرض کی تشخیص و علاج ریڈ ویک پیوئر کی مدد سے (خون یا تھوک کے نمونے سے ٹیسٹ)

دیگر امراض کے لئے خط و کتابت یا شاف فلادات کے لئے کلینک پر رابطہ کیا جاسکتا ہے

ہومیو ڈاکٹر شوکت علی (پنٹل - ایشیہ - ڈبک - آف پاکستان)

مہر پاشن شاپ نمبر SC-19 ڈبک، گڑھ عالم، ہندوئی آفس سینٹرل کاربی۔ ٹیڈان نمبر: 6647312 فاکس: 0300-9229413

کلینک کے کالوٹ (سج 11 سے 14 شام 6 سے 10) E-mail: hdr_shoukatali@hotmail.com

دوا صرف کلینک پر ہی دستیاب ہے۔

معیز کے 'خود' سے تو اسے مخاطب کرتا چھوڑ دیتا تھا۔ وہ مخاطب کرتا تو جواب دے دیتی لیکن جہاں صفائی دینے کو پرتا وہ اجنبی بن جاتی۔ طہاس سخت مشکل میں قاسم کی ڈانٹ پینڈا کار پر سے انبیا کا اجنبی انداز اسے مشکل سے دوچار کر رہا تھا۔



سب سے چاند نظر آنے کا اعلان ہو گیا۔ نوی جلدی تیار ہو جاؤ ہم سب بازار چلیں گے۔ طہاس گویا تھا۔
 ”بھائی کبھی کیوں؟“
 بالکل اس کے بغیر کیا مزہ آئے گا۔ گلشی سے مسکرایا۔

”موری بھائی اس دن۔“ اس کی شرمسار نظریں زمین میں گڑی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے جھکے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”ڈونٹ دری سسٹر۔ بھائی کے لیے تمہارا جذباتی انداز مجھے اچھا لگا رہا ہے تو سوچتا تھا تم میری بیوی سے دن رات لڑو گی۔“

”اتنی اچھی بھائی سے بھلا میں کیوں لڑوں؟“
 ”میں خوشی سے بھائی کو آپ کے توسط سے ہمیں اتنی اچھی بھائی ملی۔ انہیں خوش رکھنے کا بھائی۔“
 ”بی ایچ ایل تو اسے بازار چلنے کے لیے رضی کر دے۔“
 ایک بھاس کے سپردی۔ اس کا موڈ قطعاً نہیں تھا مگر ہو کر آتی تو عباد اور مہدیہ چاروی چٹلی نشست سنبھال چکے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر طہاس میز کو دیکھ کے چٹلی نشست کی طرف بڑھی مگر عباد اور مہدیہ نے فرنت سیٹ پر دھکیل دیا۔ پیچھے لب کے ساتھ رخ موڑے وہ گلاس سے باہر دیکھ رہی تھی۔ لائق کے اظہار طہاس معیز کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
 اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور پیچھے دونوں شیطانوں کی دلی ہنسی انمور کے اسے نظر میں چلتے جھپٹے سائن بورڈ پر مرکوز کر دیں۔ اس نے جیسے نہ

”پیلے ڈنکے کی چوٹ پر سہرا باندھ کر آئیں پھر اجازت ملے گی۔“ وہ انہیا کے پیچھے ہو گئی اور عباد مسکرا کر انہیا کے کان میں کہہ رہا تھا۔
 ”بھائی! لگتا ہے سطرہ آپ کی دیواری بننے والی ہے۔“
 ”اے۔“ وہ حیران رہ گئی۔

”بھائی! کیسے ہم دونوں کی ڈولیاں اللہ نے ایک ہی گھر میں تو نہیں اتاریں؟“ اس نے طہاس میز کو بھی کھینٹ لیا۔
 ”تمہارے بارے میں مشکوک ہوں مگر اپنے بارے میں شکرم ہو چکا ہوں۔“ جو اب اس نے بھی شوشی کا مظاہرہ کیا۔ ان کے قبضوں سے انہیا اور سطرہ تو جھپٹ گئیں جب کہ مہدیہ اور زمین ایک دوسرے کی دھکیل دیکھنے لگیں۔ سطرہ اور زمین کے ساتھ سب اتر گئے۔

”اما ڈنر پر آپ سب مدعو ہیں۔“ اما کے قریب پیشا گویا تھا۔ بیٹھ ہی وہ اچھی طرح مخاطب ہوتا تھا۔ مگر آج انداز میں جو بے ساختگی اور محبت جھلک رہی تھی اسے حیرانی تھی۔ چائے پی کر سب اٹھ گئے۔ انبیا کے قدم بھاری ہو رہے تھے۔ اب تک ساری عید اس نے اس آٹن میں اپنے سب بھائیوں کے ساتھ منائی تھی۔ اب چلی عید اسے سرائیل میں منانی تھی۔ طہاس کی نظر میں اسی پر تھیں۔ اس کی دلی حالت سے وہ آگاہ ہو گیا تھا۔ ابھی اس کے وجود کو دھار میں لے کر قدم بڑھا دیا۔

سب نے لاؤنج میں ڈیرے جمائے تھے۔ عباد اور طہاس کی وی کھولے میز ویل ٹیبلر کھینچ رہے تھے۔ ماما ملازمہ سے کل کے لیے کام کر داری تھیں۔ وہ مہدیہ کو مہندی لگا رہی تھی۔ خود اس کا مہندی لگانے کا موڈ نہیں تھا مگر ماما کی ڈانٹ سن کر لگا کر پڑی۔ مہدیہ بہت رتی کہ میری مہندی سوکھ جائے تو میں لگا دوں گی مگر اسے ڈیرہاں مہندی پنڈت نہیں تھے۔ سو پھل کے پتے تاشا بنا

کر انگلیوں کے اوپر حصوں میں مہندی لگائی۔ جلدی بھی لگتا تھا اور خوب صورت بھی لگتا تھا۔ خود سے پیچھے سے ہاتھ پر مہندی نہیں کی تو وہ تھک کر کون پھینکنے لگی۔ سمجھ اس کے متاثر بیٹھے طہاس معیز نے کون کے ساتھ اس کی پھینکی بھی تقاضا لی۔ عباد اور مہدیہ کی موجودگی میں وہ عزامت نہ کر سکی۔ ایک بار ہاتھ کھینچا مگر تاشا کی ہوئی۔ اس نے دوسری تھیلی پر بھی تاشا بنا کر انگلیوں کے سروں میں مہندی لگا دی۔ تاشا کے گرد جڑے ہوئے دو چھوٹے چھوٹے سے دل بنا کر ایک کے اندر T اور دوسرے کے اندر N بنا کر اس کی پھینکی چھوڑ دی۔ پھر دونوں اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اس کے صبح کرنے کے باوجود مہدیہ نے زبردستی اس کے پیروں میں بھی مہندی لگا دی۔ دونوں پیر لگانے لگا کر سن ہو گئے تھے۔ تقریباً کبھی اپنے کمروں میں جانے کے سوا کچھ نہ تھا تھا۔ مہندی لگائی تو اس نے غصے سے صراحت کی۔
 ”بائے خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں سو گئی تھی۔ جن کی مدد کے کر وہ شلوار اٹھا کر چلی۔ سخت بے چارگی تھی۔ کس کے جیہڑے کا تین پر مارا۔ ابھی دو بازوؤں نے اس کے وجود کو اٹھالیا۔ اس اچانک افاد پر وہ بری طرح ہولکائی اور بری طرح ہولکائی۔ وہ بڑے سکون سے زینہ لے کر رہا تھی۔ اسے اپنے بڑے بھائی اور پھر خود بھی قریب بیٹھ گیا۔ وہ سر کے پیچھے بیٹھی۔

دوستی کرلو۔“
 ”مجھے نہیں کون دوستی۔“ بھئی۔
 ”آتم موری بار۔“
 ”مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔“ بیڑے اٹھنے لگی مگر اس کی پل اس کے مضبوط ہاتھ میں تھی۔
 ”کیوں نہیں سونگی؟“ تین دن سے انہی بنی پھر رہی ہو۔

”ہم جیسی ہی رہتے تو اچھا ہوتا۔“

”چھٹا رہی ہو؟“ انداز سنجیدہ تھا۔ اس کی لگائی

محسوس کر کے اس کا نازک وجود پتلیوں کی زد میں آ گیا۔ رخساروں پر آنسو لکیر بناتے چلے گئے۔ تمہاس نے نرمی سے اس کا سراپے شانے پر کھرا لیا۔ وہ اندر زور سے روئے گی۔

”بہی کرو بہی۔“ اس کی انگلیاں بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔ ”آتم سو رہی تھی۔ بدقسمتی سے میں ان مردوں میں سے ہوں جنہیں دلی دہائی بیوی اچھی لگتی ہے۔ جنہیں قابل بیوی بہتر نہیں ہوتی۔ پھر میں نے تو شروع سے سب کی غیر معمولی توجہ حاصل کی تھی اور تم نے ایک دم مجھ سے سب چھین لیا۔ مجھے تو کم از کم ایسا ہی لگا تھا۔ سب تمہیں سراپتے ہیں۔ تمہیں اولیت دینے لگے ہیں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا کیونکہ مجھے لگ رہا تھا میری پرستاشی میں بس پردہ ہوتا جا رہی ہے میں جان گیا ہوں کہ میں کتنی بے پشیمان ہوں۔“

”میں نے جب شعوری دنیا میں قدم رکھا تو مجھے یہی دیکھنے کو ملا کہ ہمارے گھر میں دادی کا حکم چلتا تھا۔ بابا دادی کی ہر بات پر گھر میں بند کر کے چلے تھے۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں بھی کسی ایسی بیوی کی پرستاشی میں تو بابا سے پہلے دادی انکار کر دیتی تھیں اور مجھے دل لیا رہتا پڑتا تھا۔ دادی پرانے خیالات کی مالک تھیں۔ غیر نصابی ایکنٹی وہ بنی سے ہٹ کر میں نے اسٹڈی کو اڑھانہ بچھوڑنا ہونا لیا۔ کیونکہ میرا تفریح و کراوی کی نظر میں اچھی لڑکیوں کا شیوہ نہیں تھا۔ رشتائے اسی سے دادی کا انتقال ہو گیا۔ دھیرے دھیرے مجھے گھر میں ایک اہم مقام حاصل ہوتا گیا۔ بہن بھائی مانا بابا سب مجھ سے زیادہ گورڈ ہو گئے۔ ہمارے خاندان میں تعلیم کا فقدان تھا جب کہ بابا چاہتے تھے کہ ان کے بچے سب میں آگے رہیں۔ اپنا نیا وجود کوشش کے اثر سے آگے بڑھ کر نہیں دیا۔ مگر میرا انٹرس تھا۔ بابا کو میری جگہ بابا اچھی لگتی تھیں۔ وہ ہر بات مجھ سے

ڈسکس کرتے۔ مجھ سے ایڈوائس لیتے کیونکہ ان کی نظر میں میں سمجھدار تھی۔ انہی باتوں نے مجھے بابا سے قریب کر لیا۔ سب بابا سے ڈرتے تھے مگر میں ان کا احترام کرتی تھی۔ وہی تفریح جن سے مجھے روک دیا گیا تھا۔ بابا سا بچہ چھوٹے بہن بھائی کے لیے میں انہی کی تفریح کے لیے قیامت کرتی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ جیسے میرا دل خراب ہوتا تھا ان کے بھی ہوں۔ چھوٹے بہن بھائی سے میں نے بڑی بہن کا نہیں دوست کا رشتہ رکھا تھا تا کہ وہ کوئی جی ذات میٹر کرتے ہوئے نہ جو جیکس۔ لڑکا جو بالی جڈ جڈی عمر میں میں ایک ایسے شخص کی خواہش ہوتی ہے جس سے دل کی باتیں کی جاسکیں۔ ماں ہمارے بہت قریب ہوتی ہے مگر کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ڈسکس کرنے میں نہیں چاہتا کہ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہن بھائی کو خوش دیکھ کر مجھے سکون ملتا تھا۔ پھر میری زندگی میں نیارنگ آیا اور میں آپ کی جیون سماجی بن گئی۔ مجھے سسرال کے گھر کیلئے بھجوا کر سے سخت نفرت تھی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں ایک مثالی بیوی اور بہو بنوں گی۔ پھر آپ محبت کے بیج بویں تو کاٹنے توکل ہی نہیں سکتے۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ایک آئیڈیل سسرال ملا۔ ماما پاپا عذاب تو میدہ آپ سب ہی نے مجھے محبت کی پھیواریں بھجو دیں۔ مجھے کبھی غل نہیں ہوا کہ میں اس گھر میں ہی ہوں۔ سب نے مجھ سے کبھی رائے مانگی تو مجھے لگتا کہ میرا گھر ہے اسے سنواریا۔ گھاسنا میرا کام ہے۔ پھر آپ کو کب لگتا تھا کہ میں آپ کو کیونٹ ڈاؤن کر رہی ہوں؟ میری اس گھر سے کب آپ کے دے لے۔ یہ پھر میں آپ کیونٹ ڈاؤن کیسے کر سکتی ہوں۔ سب کی نظر میں میری پنڈ میری خواہش کو اولیت سے تو میری نظر میں آپ اہم ہیں پھر..... اس کی آواز زندہ لگتی۔ تمہاس میں میری سرمنہ ہو گیا۔ کئی بیرے پیئیں لڑکی تھی اور وہ ہے پھر بھتسار۔ میں اس گھر کے کینن کا برا کب چاہ سکتی ہوں تمہاس؟ اس گھر

کے متغداد سے تو میرا مفاد وابستہ ہے نا؟ اور وہ محاض۔“

”بس خاموشی ہو جاؤ میں سب جان گیا ہوں۔ تم سے شرمندہ ہوں میں نے تم سے محبت تو کی مگر کبھی تمہیں مجھنے کی کوشش نہ کی۔ آتم سو رہی ڈیز۔“ اس نے بڑے بڑے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔ وہ ایک نلکہ اس کے بندے ہاتھ اور اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

”پلیز فریوٹی۔“ آٹھکوں اور چہرے پر ندامت و محبت کے رنگ گہرے تھے۔

”اے جیانی ہاتھوں سے اس کے بندے ہاتھ کھول دینے۔“ جیانی کی ہمہدلی سوکھ چکی تھی۔ وہ نرمی سے انہیں ہجواز رہا تھا۔

”تم نے کل کے لیے کیا خریداری کی؟“

”کچھ نہیں۔“

”مچھر کیا پہنوں گی؟“

”مما دمتین سوٹ لائی ہیں انہی میں سے کوئی بہن لوں گی۔“

”اے اکل نہیں۔“ اس نے سائیز پر رکھا ڈیبا اٹھا کر اس کی گود میں ڈال دیا۔

”تم نے کہا تھا وہی سوٹ پہنوں گی جو میں لاؤں گا۔“ یہ کھول کر اس کے سامنے کیا انداز کا پھر لگی ہے حد میں سڑی تھی۔ چیونگ چوڑی جوتوں سمیت ”کیسا ہے؟“

”آپ پیار سے ذہر بھی لے آئیں تو وہ بھی مجھے امرت لگے گا۔“

”تم پھر سے مجھے مغرور بننا رہی ہو۔“ شوشی سے گویا کا پر چڑیاں پہنا رہا تھا۔ چوڑیاں پہنا کر فرخنے سے مجھے نکال لایا۔

”مگر۔“ وہ بے طرح خوش ہوئی۔ جانتا تھا اسے ہوتا ہے کہوں سے عشق ہے۔

”سوکھ جائیں گے۔ صبح کو کپھن لوں گی۔“ وہ کلا نیوں میں جگر سے باندھ رہا تھا۔ جب وہ گویا ہوئی۔

”صبح کے لیے اور بڑے ہیں۔ یہ ابھی کے لیے ہے۔“ ڈشیں انداز اور آنکھوں کے خفیف اشارے پر جینپن گئی۔ ”آپ پھر مجھ سے کبھی بدگمان نہیں ہوں گے نا؟“ اپنی طرف سے اس کا دھیانا بنانے کو بولی۔

”سوچو گا۔“ شاہانہ جواب تھا۔ تپ کے وہ ہیڈ سے اٹھ گئی۔ اس نے حنا چوڑیوں اور سکرے والا ہاتھ

تھام لیا۔

”اب میں میری جان کیونکہ میں جان گیا ہوں کوئی کسی کی شخصیت پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ کوئی کی کی جگہ پر نہیں کر سکتا۔ ہر چیز کا تبادول ہے مگر انسان کا نہیں۔ ہر انسان اپنی ذات میں انجمن ہے۔ تمہاری تعریف میری تعریف ہے۔ ہم دو سکر ایک جان ہیں۔ کوئی اور ڈائلاگ بولوں یا یہی کافی ہے؟“ شرر نظروں سے استفسار ہوا۔ وہ جھوٹی حنکی سے غمی خنکڑی رہی۔ اعتباراً تو آہی آہی تھا مگر فیس ایکسپیرس ہڈوز فرما۔ وہ بھی میڈلر حساب جان گیا۔

ہر روز غیر عید ہم سے دور یا کسی ذرا قریب تو آؤ کر عید پٹی ہے

کھائی کو زور دیا اور جھجکا دیا تھا۔ وہ تھیل ہی نہ سکی۔

”اب لگ رہا ہے عید قریب ہے۔“ انداز بے حد شریر تھا۔ اس کے کشادہ سینے پر اس نے کولن کی پاش کر دی۔ اپنی سوچ کے باعث وہ بھی بھر پور خوشی سے لطف اندوز نہیں ہوا تھا۔ ایک ذرا انداز نگر بدلنے سے مسرتوں نے اس کے دل میں ہیٹھ کے لیے قیام کر لیا۔ حیات کے رنگ گل اٹھے تھے۔ ”چند گھنٹوں کی دوری پر عید دستک دینے والی ہے۔ کم از کم عید مبارک تو کہہ دو۔“ اس کی طرف مجھے شرارت کر رہا تھا۔ سکون سے رہنے کے لیے اسے کہتے ہی بنی۔ ”عید مبارک۔“



ایس صدیقی

شخصیت سازی کی طرح شخصیات کو سمجھنے کا کام بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ نفسیات کا علم ہمیں خود کو اور دوسروں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ ہر زمانے میں اپنے آپ کو سمجھنے کی ہمت رہی ہے مگر دوسروں کو سمجھنے کی بہت اہمیت رہی ہے کیونکہ انسان کو ایک سماجی جانور کہا گیا ہے۔ باہمی تعلقات اس کی فطرت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ دنیا بھر سے کمر کر رہنا آدمی کے لیے بہت دشوار ہے اگر ہم اس معاشرے میں متحرک ہیں تو یہاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہمارے لیے یہ بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم دوسروں کو سمجھیں۔ دوسروں کو سمجھ کر جو کچھ کیا جاتا ہے وہ اچھے نتائج ظاہر کرتا ہے۔ اگر ہمیں اپنے مخالف کی شخصیت سے اچھی طرح آگاہی ہو تو ہمارے اقدامات ہمیں بہت سے خطرات سے بچا سکتے ہیں۔ کہتے ہیں علم خود ایک ہتھیار ہے۔ ایک قسم کی طاقت ہے۔ دوسروں کو مکمل طور سے سمجھنا تو خیر بہت مشکل کام ہے اور شاید ناممکن بھی تاہم ہر اس اور علم جو آدمی نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں قائم کیے ہیں۔ دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی کیے جاسکتے ہیں ہمیں کسی شخص کے بارے میں جاننے کے لیے متعدد

جگہ پر چکا ہے۔ اسلام میں مصافحہ دونوں ہاتھوں سے ہوتا ہے مگر مغربی تہذیب میں صرف ایک ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا جاتا ہے۔ یہ مصافحہ خاصا اہم ہوتا ہے۔ آپ تو جرح میں تو اس سے آپ کو اس شخص کے بارے میں چند نہایت اہم باتیں معلوم ہو سکتی ہیں جس سے آپ ہاتھ مار رہے ہوں۔ آگے بڑھ کر آپ کا کام ہے کہ اس کی روشنی میں معاملت (DEAL) طے کریں۔

(۱) اگر مصافحہ گرم جوش کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے پوری طرح تھا جا جائے۔ اس میں مناسب دباؤ ہوتا ہے جو سمجھنے کے آپ کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہو رہی ہے جو سماجی ہے۔ خوش اخلاق ہے۔ گرم جوش ہے۔ آپ کو مناسب مقام کا مالک سمجھتا ہے۔ آپ کو اچھا سمجھتا ہے۔ اہمیت دیتا ہے۔ عمدہ دوست ہوتا ہے یا آدمی۔ (۲) اگر مصافحہ کرنے والا آپ کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر اسے قوت سے دبا لے اس پر اپنی گرفت کی سختی ظاہر کرے۔ تو اس سے آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ آدمی اوپر سے خواہ کیا بھی ہو دائرہ سے اس حس فوجی کا شکار ہے۔ (یہ فوجی مصافحہ ہوتا ہے مگر کسی فوجی مصافحہ کی بات یہاں نہیں کی جارہی ہے بلکہ عام زندگی میں اگر کوئی شخص اس طرح مصافحہ کرتا ہو تو پھر ہماری باتوں پر توجہ دینا) ایسا آدمی اپنے نفس کو چھپانے کا عادی ہوتا ہے۔ اس کے اندر کچھ ہوتی ہے۔ یہ لیا اوقات زور زبردستی کا استعمال کرتا ہے۔ ضرورت ہو تو دھاندلی سے بھی نہیں چوکتا۔ ایسے افراد سے محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ ظاہری دھوکا دیتے ہیں۔

(۳) اکثر ایسے افراد بھی آپ کو ملیں گے جو

مصافحے کے لیے صرف اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیتے ہیں اس طرح کہ آپ اسے پکڑ لیں۔ ملائیں یا جو چاہے کریں۔ دبا لیں یا نہ دبا لیں یہ سب آپ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ تو سن لیں یہ شخص خواہ اوپر سے کیسا بھی ہو اندر سے آپ کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ یہ آپ کو اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھتا ہوگا۔ اس سے آپ کو کوئی غرض نہیں ہوگی۔ نہ مدد دی نہ نفرت نہ اس شخص کے والی بات سمجھ لیں۔ مل لے تو خوب نہ ملے تو بھی خوب۔

(۴) جب کوئی شخص اس طرح مصافحے کے لیے ہاتھ دے جیسے وہ بس جلدی سے اس مرٹے سے گزرتا چاہتا ہے۔ یعنی بس انگلیوں کے لمس سے ہی غرضانا چاہتا ہو تو سمجھ لیں یہ برائے نام قسم کا مصافحہ جاتا ہے کہ یہ شخص اپنے آپ کو اہم اور آپ کو معمولی سمجھتا ہے۔ اس میں خود پسندی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آپ کے ساتھ ملوث ہونے کو بے جبر قبول کر رہا ہے۔ اس قسم کا کر یا ایک نوع کی انتہائی کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ خود کس طرح مصافحہ کرتے ہیں؟ ہماری باتوں کی تصدیق اسی سے آپ کر سکتے ہیں۔ مختلف افراد سے آپ کے مصافحے کی صورت میں آپ پر اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ مصافحہ بھی دراصل ہماری سوچ کی تابع ایک حرکت ہے اور ان سوچوں کا بیان ہم نے کر دیا ہے۔ اپنی شخصیت کو بہتر بنانے کے لیے اپنے مصافحے کو گرم جوشنا نہ بنائے۔ اس کے ساتھ آپ کی سوچ بھی تبدیل ہوگی اور آپ کے اندر موجود نفس میں بہتری آئے گی۔





وزارت صحت سندھ

دوا پانچ دفعہ استعمال کی جائے اسے کتنے دن اور استعمال کرتی ہے؟

محترمہ آپ BERBARIS AOUFOLIUM-3X کے پانچ قطرے قطرے دھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت کا استعمال جاری رکھیں۔ IODIUM-IM کے پانچ قطرے ہر چندہ دن میں ایک مرتبہ استعمال کرنا ہے تاکہ استعمال کافی ہوگا۔

شاربہ یعقوب، فضل آباد سے کہتی ہیں میرے چہرہ پروانے نکتے ہیں اور سیاہ داغ چھوڑ جاتے ہیں کسی وجہ سے سارا چہرہ کالا ہو گیا ہے۔

محترمہ آپ GRAPHITIS-30 کے پانچ قطرے دھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پانی کرین۔

زہمت کراچی سے کہتی ہیں کہ میرے دانت پہلے تو ہلکے سے تھک رہے تھے کرباب میں جھڑنا شروع ہو گئے ہیں۔ دانتوں سے خون بھی آتا ہے میری چھوٹی بہن کے ناسلو ہیں۔

محترمہ آپ CALCIUM FLUOR-6X کی چار گولی تین وقت روزانہ کھا لیں اور بہن کو BARIUM CARB-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پانی کرین۔

ٹوئین زہرہ جنگ سے کہتی ہیں کہ سہانہ نظام بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ 5-6 ماہ بعد ہوتا ہے۔

محترمہ آپ SENECEO-3X کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پانی کرین۔

فیہ سموم جنگ سے کہتی ہیں کہ آپ بہت لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ میں بھی ایک سال سے خط لکھنے کا سوچ رہی تھی اب امت کر کے لکھ رہی ہوں۔ مسئلہ شائع کیے بغیر جواب دیں۔

محترمہ آپ ORIGANUM-Q کے پانچ قطرے ایک کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پانی کرین۔

محمد ارسلان خان احمد پورلہ سے لکھتے ہیں کہ مجھے بادی ہوا میری سخت تکلیف ہے۔

محترم آپ AESCULUS HIP-3X کے پانچ قطرے دھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پانی کرین۔

محمد امین مغل آپ کو جواب دیا چاچا کہ بے دہی دوا استعمال فرمائیں بالکل ٹھیک پر تشفی پلا لیں۔ آکاش بیگ فیصل آباد سے کہتی ہیں کہ مجھے ریشہ کا پرانا مرض ہے نہایت پریشان ہوں۔

محترمہ آپ KALIBICH-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پانی کرین۔

ایمان علی سرائے سے کہتی ہیں کہ میرے منہ میں دانے ہو جاتے ہیں اور HAIR REMOVER کے ساتھ جو دوا کھانی جاتی ہے اس کا کام بھی لکھ دیں۔

محترمہ آپ BORAX-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پانی کرین۔

ایمان علی شادی کے لیے بالوں کی شدید زیادتی کے لیے HAIR REMOVER استعمال کر رہی ہیں۔

ایمان علی شادی کے لیے بالوں کی شدید زیادتی کے لیے HAIR REMOVER استعمال کر رہی ہیں۔

ایمان علی شادی کے لیے بالوں کی شدید زیادتی کے لیے HAIR REMOVER استعمال کر رہی ہیں۔

ایمان علی شادی کے لیے بالوں کی شدید زیادتی کے لیے HAIR REMOVER استعمال کر رہی ہیں۔

ایمان علی شادی کے لیے بالوں کی شدید زیادتی کے لیے HAIR REMOVER استعمال کر رہی ہیں۔

تیاریاں ہیں جو اپنے ہاتھوں خود کو براد کرنے سے ہوتی ہیں۔

رفیدہ الیاس لٹا ہورے لکھتی ہیں کہ میرے چند

مسائل ہیں شائع کیے بغیر جواب دیں۔

محترم آپ 30-STAPHISAGARIA کے پانچ قطرے دھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پنی لیا کریں بہتر ہے کہ کلینک پر تشریف لائیں اور باقاعدہ علاج کرائیں۔

مٹان راول پنڈی سے لکھتے ہیں کہ میں جہانیاں کم زوری سے بہت پریشان ہوں۔ میری کلانیاں چلتی کسم کم زور اور گال چپکے ہوئے ہیں کوئی دوا سکی تائیں کہ میں صحت مند ہو جاؤں۔

محترم آپ 30-ALFALFA-Q کے دس قطرے ایک کپ پانی میں ملا کر تین وقت کھانے سے پہلے پنی لیا کریں۔ پھلوں کا استعمال زیادہ کریں ہلکی ورزش کیا کریں اور اگر کوئی بری عادت میں چلا ہیں تو وہ قطعی چھوڑ دیں۔

محمد آصف ملک ساہیوال سے لکھتے ہیں کہ مجھے سرعت کی شدید شکایت ہے کوئی مناسب دوا تجویز فرمائیے۔

محترم آپ 30-ERYNGIUM کے پانچ قطرے دھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پنی لیا کریں۔

شہناز اکبر راول پنڈی سے لکھتی ہیں کہ آپ نے میرے لیے دوا تجویز کی تھی اور کھاتھا کاستعمال کے تین چار ہفتہ بعد حالات سے طبع فرمائیں۔ دوسرے بری درست کے دس کپسے میں مٹا پا اور قد چھوٹا اس کی عمر 24 سال ہے۔

محترم آپ 30-GRAPHITIS کے پانچ قطرے دھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت پنی لیا کریں اپنی درست کوٹنے کے لیے 30-PHYTOLACC کے دس قطرے ایک کپ پانی میں ڈال کر تین مرتبہ روزانہ دیں اس عرصہ میں تھوہنا کم نہیں ہے۔

محترم آپ 30-ALFALFA-Q کے دس دن صرف ایک مرتبہ پنی لیا والدہ کو 30-THRUDOX کے پانچ قطرے صبح شام اور 30-RHUSTOX کے پانچ قطرے دوپہر دو کو

کھانے سے پہلے پنی لیا کریں۔

تحریم فاطمہ گوجرہ سے لکھتی ہیں کہ آپ کو دھواڑوں

لوگ دھا دیتے ہیں جن کو فائدہ حاصل ہوا ہے۔ میں اپنی مکمل کیفیت کھڑی ہوں شائع کیے بغیر جواب دیں۔

محترم آپ کو باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے اگر ایک دوا تحریر کر رہا ہوں وہ استعمال کریں۔ 30-KALI PHOS-6X کے چار چار گولی تین مرتبہ روزانہ کھائیں اور بالوں کے مسئلہ خاتمہ کے لیے 5000 روپے کلینک کے سپریم آؤر کر دیں آپ کو بڑوں 30-HAIR REMOVER ارسال کر دیا جائے گا۔

کنول ممتاز لاہور سے لکھتی ہیں کہ میں پہلے کچھ چکی ہوں اس دوا سے فائدہ تو ہوا ہے مگر کچھ نہیں ہوا براے مہربانی کوئی اور بہتر دوا بتائیں۔

محترم آپ 30-BORAX کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پنی لیا کریں۔ انشاء اللہ صحت ہوگی۔

ناہید سلطانہ ساہیوال سے لکھتی ہیں کہ آپ نے میرے لیے ایک دوا تجویز فرمائی تھی اس سے ایک شکایت میں تو کمی ہوئی ہے مگر دوسری شکایت کھڑی ہوئی کوئی ایسی دوا دیں کہ دونوں شکایات ختم ہو جائیں۔

دوسرے میرے بھائی کو دوا بتائیں وہ بہت دیر پلا ہے اسے بھوک بھی نہیں لگتی ہے۔

محترم آپ 30-PILSATILLA کے پانچ قطرے دھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت پنی لیا کریں اور بھائی کو 30-ALFALFA-Q کے دس قطرے ایک کپ پانی میں ڈال کر روزانہ تین وقت کھانے سے پہلے پنی لیا کریں۔

مترصد حسین راول پنڈی سے لکھتی ہیں کہ میری شادی کو 18 سال ہو گئے ہیں مگر ایام کی تکلف پہلے بھی تھی اب بھی ہے آپ کوئی مناسب علاج بتائیں۔

محترم آپ 30-THLASPI کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پنی لیا کریں۔

شاہد حیدر ملتان سے لکھتی ہیں کہ میرے دونوں بیٹے بسر میں پیشاب کر دیتے ہیں اور بیٹی کی ایک آنکھ میں بھگکا پٹن ہے۔

محترم آپ بیٹوں کو 30-CAUSTICUM کے پانچ قطرے دھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پنی لیا اور بیٹی کو 30-GELSEMIUM کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پنی لیا کریں۔

فرحت پرین سکھر سے لکھتی ہیں کہ آپ نے جو دوا کھائی ناکی بڑی کو تو بہتر ہے دوسری تکلف بھی کم ہے اب مزید کوئی دوا بتائیں جلدی فائدہ ہو جائے۔

محترم دوا جاری رکھیں اور اس کے ساتھ 30-PULSATILLA کے پانچ قطرے صبح شام استعمال کریں۔

عاصمہ خالد لاہور آپ 30-NUXVOM کے پانچ قطرے تین وقت روزانہ لیں اور بیٹی کو 30-LECETHIN کی ایک گولی تین وقت روزانہ دیں۔

ثروت ناز اسلام آباد آپ بیٹے کو 30-AGRIPHIS کے پانچ قطرے تین وقت روزانہ اور 200-BARIUM CARB کے پانچ قطرے ہر آٹھویں دن پنی لیا کریں۔

معاذ اور باقاعدہ علاج کے لیے تشریف لائیں۔ 10 بجے 6 تا 9 بجے 6997059 ڈاکٹر محمد ہاشم مرزا کلینک دکان C-5 کے ڈی اے فلیش فیر 4 شادان ناٹن 2 سیکٹر 14-B نارتھ کراچی۔

(جن میں دو مکن چرگی کے درمیان میں روڈ پر) خط لکھنے کا پتہ: آپ کی صحت ماہنامہ "آجکل" پوسٹ بکس 75 کراچی۔

آانحال + Decembe + 2004 289



انسانی طبیعت مختلف اقسام کی ہوتی ہے۔

بادی مزاج، مفردی مزاج، دمی مزاج اور سوداوی مزاج۔

سبز یاں اور پھل انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت میں شمار ہوتے ہیں۔ کچھ سبز یاں جتنی کھائے جس فائدہ مند ثابت ہوئی ہیں اور کچھ کچھ کھائے جس لذت دیتی ہیں۔ کچھ سبز یاں کی تاثیر دیکھ کر کم اور کچھ سبز یاں کی تاثیر معتدل ہوتی ہے۔ سبز یاں اور پھل اور کئی دگر غذاؤں کا کھانے میں بھی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ کئی ایک غذا نہیں ہیں جو ایک ساتھ کھائے جس میں نقصان نہ دے تو ہی بیمار دان جس نہ ہر جی صورت پیدا کرتی ہیں۔ جیسے کہ:

دودھ اور ترش اشیا۔
دودھ کے ساتھ کھڑکی سرکاری لیوں چاٹن گوشت اور پھلی۔

دودھ میں گڑ۔

دودھ کے ساتھ تیل کی چیزیں۔

دودھ اور ترش۔

دودھ کے ساتھ گرم دہن۔

کھیر اور پھوٹی۔

چاول اور سرکہ گوشت کے ساتھ سرکہ اور شہد۔

دھنیا یا چھاپے کے ساتھ کھانا۔

سبزی اور دھنیا۔

سبزی کھانی گولری اور کھیر سے کے بعد پانی شربت یا دودھ دینی کی۔

شہد اور فروزہ۔ مگزی تر بوڑ اور کھیر۔

موٹی کے ساتھ شہد۔ تیل اور مٹی۔

خربوزہ اور دہن۔ موٹی اور دہن۔ دہن اور اجا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مذکورہ چیزیں باہم کھانے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا مگر اس کے حق یہ نہیں کہ

اصل غلط ہے بلکہ انسان کی قوت امراض پر غالب آ جاتی ہے اور بعض اوقات انسان مرض کے حملے سے بچ جاتا ہے۔

انسانی صحت اور زندگی بہت قیمتی ہیں۔ ذرا سی احتیاط اور بہتر سے ہم بہت سی بیماریوں کے حملے سے بچ جاتے ہیں۔

کئی سبز یاں بلکہ ہر سبز یاں میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی بیماریوں سے نجات اور حفاظت کی ہے۔ جیسے کہ:

آلو: سبز یاں میں مختلف دواؤں کا سب سے زیادہ آلو میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا مزاج سرد خشک ہے۔ یہ کھانا کھاتے دیتے اور لاغری ختم کرتا ہے۔ آلو کھانے میں ذیال کربھ ہوں

تھیں اور پھر اس کا چھکا انا دین اور دھک مریج کر کھا کر

جوڑوں کا درد ایک ہفتہ میں غائب ہو جائے۔

بجی: اس میں دھان کی سی دافر مقدار ہوتی ہے۔ اس کا

مزاج سرد تر ہے۔ کھانا کھاتے بعد کھانا کھاتے دیتے اور

اسہال بند کرتا ہے۔ گرمی ختم کرنے اور خون کی حدت کو کم

کرنے کے لیے کھانا کھانا سبز یاں ہے۔ مرض یہ قاتل ہے۔

لیجے گی: صدا ہی اور مفید دوا ہے۔

بھوئے کے ساگ: شکایت تانہ زولا اور وراثت اس کی سی

دوسری سبز یاں سے زیادہ ہیں۔ بھوئے کے پتے باندھنے

سے جسم کے کئی بھی حصے کا درد ختم ہو جاتا ہے۔ معدے کو

طاعت دیتا ہے اور قیض کشا ہے۔ یہ بدن میں قوت اور جتنی

پیدا کرتا ہے۔ پیٹاب کے امراض میں بھوئے کے ساگ بہت

مفید ہے۔ کھیر اور کئی کی گرمی ختم کرتا ہے اس کا استعمال شدت

پانی کھانا کھانا کرنے کے لیے کھانا پانی میں رکھنا۔

چھلی: اس کا مزاج سرد خشک ہے۔ قیض کے مہر اور اس

کے دانے کھانے سے مزید بارہاں تیز ہوتا ہے۔ یہ خون کو

صاف کرتی ہے جسم میں جتنی پیدا کرتی ہے۔ جسمانی لاغری

کو دور کرنے کے مگزی تر بوڑ اور کھیر۔

دوست میں قابض ہے۔ معدے میں تھیں بھی پیدا کرتی

ہے۔ یہ گوشت اور گرم مہاں کے بغیر کھانا کام کی نہیں ہے۔

چٹنی: سبز یاں: مزاج گرم خشک ہے۔ جسم سے قیض خارج

کرتی ہے۔ کھیر اور گرم دہن سے کھانا کھانا کھانا

کو ہلاک کرتی ہے۔ دودھ اور کھانا کھانا کھانا کھانا

مفید ہے۔ یہ سبز یاں لقمہ جوڑوں کے درد کھانا کھانا

اکوٹھے کا درد (نقرس) میں ہے۔ دھنیا کے نظر تیز کرتی ہے

اور دسم سے پھری تو دگر خاندان کو رہتی ہے۔



انچال + دسم + 2004

نہیں ہوگا۔
چیشاب کی رکاوٹ: کھیر سے کے ایک تولہ بیچوں کو
کوٹ کر ایک گلاس پانی میں رات کو بھجوں پس پھر صبح بکا
جوش دے کر چھان لیں اور ٹھنڈا ہو جانے کے بعد پانی
لین چیشاب کی چھان اور رکاوٹ دور ہو جائے گی۔

گاجر کا مرہ: گاجر کا مرہ: بنانے کے لیے سبیلے
چاشنی تیار کر کے کھائیں پس پھر تازہ سرخ گاجر کو چھان
کھان کے اور کچھ کاٹ کر ایک گرم کریں۔ اس کے

بعد انہیں دھو کر کھولتے ہوئے پانی میں آٹھ دس منٹ
تک جوش دیں۔ چھلے سے اتارنے کے بعد کھانے

سے انہیں چھان دیں اور پھر ایک ایک کر کے تیار کی
ہوئی چاشنی میں ڈال دیں یا دسے چھنی کی مقدار

گاجر کے دوزن کے برابر ہو۔

خرانی: معدہ: معدے کی تمام بیماریوں مثلاً بھوک

دلگان، زرد، خیم کھانے کا بھی مضمن نہ ہونا اور کچھ کھانا

تو دسم کی شکل میں نکل جانا۔ اس سب بیماریوں کا تیر

بہد ف علاج ہے کہ دو گچھے پانی میں تھن چار ماش

کالا نمک گھول کر اسے پکائیں جب نمک گاڑا

ہو جائے تو یہ خوراک ایک ساتھ مریش کو کھلا دیں۔

معدے کی تمام شکایتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مینے بعد

دو بارہ غسل دہرا کریں۔

آٹھ کا دھن: اگر آٹھ کھیں کوئی پھنسی یا ذم پیدا ہو گیا

ہو تو بلدی کی ایک گانٹھ لے کر اسے تھوڑے پانی میں

کسی پتھر پر گڑیں اور اس پانی کو کھالتے سے کسی

چھوٹی سیٹی میں رکھیں اور سرے کی سلائی سے

مریش کی آٹھ میں تین تین سلائی لگا دیں دو تین

دوں میں ہی ذم دور ہو جائے گا۔

خالص مٹی: خالص مٹی کو کھنے کے لیے مٹی کو کسی
شیشی میں ڈال دیں پھر اس شیشی کو گرم پانی میں رکھ کر
ہلا لیں اور پانی میں شوربے کے تیزاب کے چند
قطرے ڈال دیں اگر مٹی خالص ہو تو اس کا رنگ تبدیل





اگر دانت سیاہ رنگ ہوں تو فضل نا جائز کا عادی ہو۔
اگر لمبے اور پتے دانت ہوں تو حاسد بے حیاء بد اعتقاد اور شک پرست ہوگا۔

اگر دانت بڑے اور ہونٹوں سے باہر نکلے ہوں تو پریشان محتاج ہمیشہ دوسروں کا دست نگر ہوگا۔ خویش اقرار بے حدار ہے۔

اگر دانت کے اوپر دانت چڑھا ہوا ہو تو دنیاوی ضروریات سے خوش حال اور فارغ البال ہو مگر بڑا بھائی اس کا زندہ نہ رہے۔

اگر دانت جدا جدا ہوں تو ہمیشہ غمگین اور کفر و رنج میں مبتلا رہے اگر انار کے دانہ کے موافق ہوں تو بڑا سعادت مند اور صاحب دولت ہو اگر موش یا پچھرے کے مانند ہوں تو بڑا نیک اخلاق اور نیک طبیعت ہو۔ نیکی سخاوت اور بھلائی کے کاموں میں توجہ بہت رکھے۔ اگر مٹل یا تھی یا کدھ ہے جیسے ہوں تو تمام عمر خوش گزران

چھوٹے اور کدھ دانت ہوں تو بڑا پرہیزگار ڈالار بدن طبع نیک نیت دیانت دار اور دلچیز ہو۔ دانت پیوستہ اور مضبوط ہوں تو خوشین مزاج حسن پرست حکایات راگ ورنگ کا شائق اور دراز عمر ہو۔

دانت متوسط ہوں تو نیک بخت دیانت دار انصاف پسند اور دولت مند ہوگا۔ دانت اگر موتی کے مانند سفید اور پتے ہوں وہ شخص بڑا دولت مند اقبال والا ریش صاحب الماک اور حکمران ہوگا۔ چنگدار دانتوں والے خوش قسمت نیک نیت اور زبردست ہوں گے۔

اگر دانت براق سفید غنی جیسے ہوں تو فقیر دوست ہو۔ دنیا ترک کر دینے کا خیال رکھتے ہوں۔

اگر دانت کے لمبے اور پتے دانت ہوں تو حاسد بے حیاء بد اعتقاد اور شک پرست ہوگا۔



کیلے کا بیٹھا

اشیاء کیلے میدہ دودھ چینی انڈا کھی ترکیب: کیلے انڈے دودھ اور چینی کو ملا کر پھینٹ لیں۔ تھوڑی دیر چھٹی کریں۔ گاڑھا رکھیں پھر کڑائی میں کھی گرم کر کے کھلی آج پر پکڑوں کی شکل میں تل لیں۔ اس طرح سے گانگوں کی شکل کی مٹھائی تیار ہوگی۔ اب اسے گرم گرم اتار کر باریک چینی چمک دیں۔ اب یہ مٹھائی تیار ہے۔ عید کے لیے خاص تحفہ۔

اشیاء کیلے میدہ دودھ چینی انڈا کھی ترکیب: کیلے انڈے دودھ اور چینی کو ملا کر پھینٹ لیں۔ تھوڑی دیر چھٹی کریں۔ گاڑھا رکھیں پھر کڑائی میں کھی گرم کر کے کھلی آج پر پکڑوں کی شکل میں تل لیں۔ اس طرح سے گانگوں کی شکل کی مٹھائی تیار ہوگی۔ اب اسے گرم گرم اتار کر باریک چینی چمک دیں۔ اب یہ مٹھائی تیار ہے۔ عید کے لیے خاص تحفہ۔

اشیاء کیلے میدہ دودھ چینی انڈا کھی ترکیب: کیلے انڈے دودھ اور چینی کو ملا کر پھینٹ لیں۔ تھوڑی دیر چھٹی کریں۔ گاڑھا رکھیں پھر کڑائی میں کھی گرم کر کے کھلی آج پر پکڑوں کی شکل میں تل لیں۔ اس طرح سے گانگوں کی شکل کی مٹھائی تیار ہوگی۔ اب اسے گرم گرم اتار کر باریک چینی چمک دیں۔ اب یہ مٹھائی تیار ہے۔ عید کے لیے خاص تحفہ۔

اشیاء کیلے میدہ دودھ چینی انڈا کھی ترکیب: کیلے انڈے دودھ اور چینی کو ملا کر پھینٹ لیں۔ تھوڑی دیر چھٹی کریں۔ گاڑھا رکھیں پھر کڑائی میں کھی گرم کر کے کھلی آج پر پکڑوں کی شکل میں تل لیں۔ اس طرح سے گانگوں کی شکل کی مٹھائی تیار ہوگی۔ اب اسے گرم گرم اتار کر باریک چینی چمک دیں۔ اب یہ مٹھائی تیار ہے۔ عید کے لیے خاص تحفہ۔

اشیاء کیلے میدہ دودھ چینی انڈا کھی ترکیب: کیلے انڈے دودھ اور چینی کو ملا کر پھینٹ لیں۔ تھوڑی دیر چھٹی کریں۔ گاڑھا رکھیں پھر کڑائی میں کھی گرم کر کے کھلی آج پر پکڑوں کی شکل میں تل لیں۔ اس طرح سے گانگوں کی شکل کی مٹھائی تیار ہوگی۔ اب اسے گرم گرم اتار کر باریک چینی چمک دیں۔ اب یہ مٹھائی تیار ہے۔ عید کے لیے خاص تحفہ۔

اشیاء کیلے میدہ دودھ چینی انڈا کھی ترکیب: کیلے انڈے دودھ اور چینی کو ملا کر پھینٹ لیں۔ تھوڑی دیر چھٹی کریں۔ گاڑھا رکھیں پھر کڑائی میں کھی گرم کر کے کھلی آج پر پکڑوں کی شکل میں تل لیں۔ اس طرح سے گانگوں کی شکل کی مٹھائی تیار ہوگی۔ اب اسے گرم گرم اتار کر باریک چینی چمک دیں۔ اب یہ مٹھائی تیار ہے۔ عید کے لیے خاص تحفہ۔

دیگر اشیاء پکن ایک عدد (بال کر ریش کر لیں)

پانز گری پاؤڈر نمک سبز مرچ پودینہ ڈبل روٹی کا چورا

سفید تیل حسب ضرورت حسب ضرورت ترکیب: کھانے کے لیے تجویز کردہ تمام اشیاء ملا لیں۔ مرغی کو بال بال ریش کر لیں۔ پھر سب کا مرکب بنا لیں۔ پیاز گری پاؤڈر نمک سبز مرچ اور پودینے کو بلیئنڈر میں ڈال کر بلیئنڈر کریں۔ اس مرکب کے چھوٹے چھوٹے باز بنالیں۔ تیل گرم کر لیں۔ کئی میں ہر بال کو ڈبو کر پیلے چرے اور پھر کٹوں سے پلٹ کر کٹ جائیں۔ سبزے ہونے تک تیل میں ٹھاٹھ پچپ کے ساتھ پیش کریں۔ پکن کے پکڑے بہت لذیذ ہوتے ہیں آپ کو پسند آئیں گے اور کھا کر آپ تعینا ذواہ کہنا گئیں گے۔

(نارینا پیاز ٹو پیج جہانگیر۔ مومبر آزاد کشمیر) انیم پکڑے

اجزاء: وال بسور لہسن زمرہ نمک کالی مرچ سرخ مرچ ہلدی درمیانہ پیاز ہری مرچ

ایک پاؤ دو جوئے ڈیڑھ چائے کا چمچ (باناہا) حسب ذائقہ آدھا چائے کا چمچ (نسی ہوئی)

چار عدد (غایت) پون چائے کا چمچ ایک عدد (کلی لیں) دودھ (باریک کاٹ لیں)

ایک عدد (غایت) پون چائے کا چمچ ایک عدد (کلی لیں) دودھ (باریک کاٹ لیں)

ایک عدد (غایت) پون چائے کا چمچ ایک عدد (کلی لیں) دودھ (باریک کاٹ لیں)

ایک عدد (غایت) پون چائے کا چمچ ایک عدد (کلی لیں) دودھ (باریک کاٹ لیں)

ایک کھانے کا چچ
(باریک کٹا ہوا)

ترکیب: وال کو چھو کر بھگو دیں۔ بھگوئے وقت وال میں بسن کے جوئے اور ثابت سرخ مرچ بھی شامل کر دیں۔ اب ایک کھنے بعد اس کا پانی پھار لیں اور اسے پیں لیں خیال رہے کہ وال ذرا سوگی بہتی ہے۔ اس لیے اسل استعمال کریں تو بہتر ہے ورنہ چوپریا بلڈ پریشر میں ذرا سا پانی ڈال کر پیں لیں۔ پھر اس میں نمک پلڈی کالی مرچ بڑا پیاز ہری مرچ اور ہراوھنیا ملائیں۔ پھر اس کو ہاتھ سے اچھی طرح پیسٹ لیں۔ اب ایک کھلے منہ کی پٹلی میں اور اس کو تین چوتھائی پانی سے بھر کر چلے پر رکھ دیں جب پانی میں ابال آنا شروع ہو تو اس کو چلے سے اتار کر پٹلی کے منہ پر نعل کا ٹکڑا باندھ دیں۔ (چاچاں) تو پٹلی پر سلوکی کر باریک پٹی چلی چلی رگی جا سکتی ہے جو اس پر فٹ ہو، اب اس کو دو بارہ چلے پر رکھ دیں اور اس چلے پر بکڑے کا آمیزہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈال دیں (جیسے مکرانی میں بکڑے ڈالتے ہیں) اب اس کو کسی سے لے ڈھک دیں۔ پندرہ یا بیس منٹ تک بکڑے وال کو پلٹ دیں اور پندرہ منٹ مزید بکا لیں۔ جب یہ ذرا سخت ہو جائیں اور اپنی رنگت تبدیل کریں تو سمجھ لیں کہ اسٹیم بکڑے تیار ہیں۔ خشک کر کے چکنی کے ساتھ کھائیں۔ انظار میں اس کو بکڑے وال کا مزہ لیں۔

چکنی کی تیاری

تل دو کھانے کے چچ چھوئے دو جوئے (کٹے ہوئے) پیاز دو عدد (سبز والی) سویا سوں ایک چوتھائی کپ سرکہ ایک بڑا چچ، چینی دو کھانے کے کچ، سرخ مرچ ایک بڑا چچ (کئی ہوئی) کو لنگ آئل ایک کھانے کا چچ۔

بسن اور پیاز کو باریک کٹ کر اسے سویا سوں اور سرکے کے آمیزے میں ملا دیں اور پھر اس میں چینی تل اور کئی ہوئی سرخ مرچ ملا کر اچھی طرح یکجان کر لیں اور کچھ دیر کے لیے اسے آئل میں تل لیں۔ چینی تیار ہے

ایک ہراوھنیا بنا لیں اور انظار میں کا مزہ دوالا کریں۔
(سلیکٹ ملک - قادر پور ان)
وائٹ چکن

اجزاء:
چکن
دہی
کالی مرچ
بسن اورک
نمک
آئل
ہری مرچ
ہراوھنیا
ترکیب: چکن کو صاف کر کے اچھی طرح چھو لیں۔ دہی میں آئل گرم کریں۔ چکن ڈال کر بکا فرائی کریں۔ بسن اورک کا پیسٹ ڈال کر بھوئیں۔ پھر دہی ڈال دیں اور خوب بھوئیں نمک اور کالی مرچ ڈال دیں گی چھوڑنے پائتا کر لیں۔ چائٹس کے لیے ہری مرچ اور ہراوھنیا باریک کٹ کر ڈال دیں مزید ورائٹ چکن تیار ہے۔
فرائی سوپ

اجزاء:
ٹماٹر کے دل کا ڈبہ
کھیرا
سرخ مرچ ثابت
پینٹل سرکہ
دھندلا سا لٹ
کالی مرچ
ہری مرچ
بسن کے جوئے
زیتون کا تیل
پیاز بڑا سا سائز
ثابت ٹماٹر
ترکیب: ہری مرچ ثابت سرخ مرچ چوں کے کچ ل

کر باریک کٹ لیں۔ کھیرے کو چھیل کر باریک کٹ لیں۔ پیاز کو بھی باریک کٹ لیں۔ بسن کے جوئے کالی مرچ کے سائٹ کو اکٹھا کر لیں۔ پٹلی میں زیتون کا تیل گرم کر کے چوپریا آمیزہ بسن کا ہے ڈال دیں پھر ذبے میں بندھا کر کے دل کو اس میں ڈال دیں۔ دو منٹ بعد کھیرے پیاز اور ہری مرچ لال مرچ کے کٹوے اس میں شامل کر کے دو پیالی پیاز ڈال دیں۔ آدھے گھنٹے تک اس آمیزے کو دھبی آج پر پکا لیں۔ جب آمیزہ گاڑھا ہو جائے تو اس میں ٹماٹر کا کٹ کر ڈال دیں۔ ایک پیالی پانی ڈال کر دھبی آج پر پکے کے لیے رکھ دیں۔ ٹماٹر جب اچھی طرح کل جائیں تو اساتر لیں۔ گرم سالہ چھڑ کر نوش فرمائیں۔ فرائی سوپ تیار ہے۔
(سائزہ مصباح بخاری: علی پور)
چکن الاٹنگ

اجزاء:
مرچی
گاجر
آلو
دودھ
پانی
میدہ کھانے کا
بادام
ہری مرچ
بالائی
نمک
کالی مرچ
ترکیب: گاجر اور مرچ کو ڈھائی کپ پانی میں ڈال کر ایک چمچ نمک ڈال کر ابال لیں۔ ساتھ ہی اورک، بسن، پینٹل، سرخی، بالائی میں اورک، پینٹل، سرخی کے ہری مرچ کا کٹ میں بادام پھیل لیں۔ سرخی کے باریک کٹوے کر لیں۔ کھن کو پانی میں ڈال کر گرم کر لیں۔ ہری مرچ میدہ ڈال دیں پھر کس سبزی اور دودھ

سوپ جو مرغی ابال کر بچا تھا ڈال دیں پھر کالی مرچ اور بادام کس کر دیں اور پھر چھلکا بند کر دیں۔ بالائی کو سیٹ کر لیں پھر دودھ اور بالائی ڈال دیں۔ مزے دار اور لذیذ چکن الاٹنگ تیار ہو نوش فرمائیں۔
(کس رحیلہ - فصل آباد)

پاستا سرکہ ساتھ

اشیاء:

پاستا
مرچ پھلے ہوئے

زیرہ

ہری مرچ

پیاز

تیل

ٹماٹر پری

سرخ مرچ پاؤڈر

کالی مرچ

نمک

حسب ذائقہ

حسب ذائقہ

ترکیب: پینٹ پر دی گئی ہدایات کے مطابق پاستا کو ابال لیں۔ ایک پٹلی میں تیل گرم کریں۔ اس میں زیرہ پیاز اور ہری مرچ فرائی کریں۔ ٹماٹر پری ملا دیں اور مرچ ڈال دیں۔ اس وقت تک پکا لیں کہ سٹف جائیں۔ نمک کالی مرچ اور بالائی، ہری پیاز ملا دیں۔ تیز آج پھر دیا تین منٹ تک چلائیں اور پھر سرکہ کریں۔ واڈہ واڈہ ہو جائے گی۔
(نادیا اور بیہ جہانگیر - سوبر آباد سیکر)



فیوڈ ڈائٹ لائبریری

پستہ: روڈ صادق آباد

نوٹ: کتاب کے اوپر درج کیا گیا ہے۔ کتاب بھیمہ لہو لہو ہے۔ خراب ہو وقتہ کتاب کے قریب ہے۔ جلد کرنا ہر دول کیا جاتی ہے
نمبر 74367

نظم

آج دہری کی آخری شب ہے
خنگ خنگ سی سرور دہی کو صفحہ لود
بیٹے دیوں کی ساری باتیں
گزرے سال کے سارے منظر
اک اک کر کے ذہن کے در پہلوں سے

جھانک رہے ہیں
کہیں پہ منظر بھاگ رہے ہیں
کہیں مقدر جاگ رہے ہیں
نئے سال کی پہلی ساعت
کون جانے کس کے لیے

کیا میں پیغام لے گئے
سارے نوجوی جوگی سارے
حساب کتاب کے دفتر کھولے
ہر لمحے کو کھوج رہے ہیں
ایسے لمحوں میں کچھ دیا نہ

بیٹے دیوں کو سوچ رہے ہیں
نئے سال کچھ ایسا کرتا
ان دیوانوں فرزانوں کی
کاحب تقدیر سے کہہ کر
پچھلے سال کی ساری سوچیں
تم لے لیتا

اور بدلے میں کچھ میت دینا

(شاعرہ: زینت عبدالصمد..... میر پور سا کرو)

کس دیس نکلا ہوگا میرا چاند

جب

میرے من آنگن میں

تم نے پیار کے دیپ جلائے تھے

میت پوچھو رنگ بہا راں کہتے زبیت پر چھائے تھے
پھول دو آ بادل خوشبو اور خوشیاں
سب ہی نے کس موہ لیا تھا
چاند رات اور عید کے رنگ
کیسے کیسے نہ من کو بھائے تھے
تجھ سے جاناں بھی تو پوچھ کر کہا تھا
بھی تو پچھ چا پاتا تھا

کہ کنبھوں کے اس روشن دیے کی آلو
کبھی مدھم نہ پڑنے دینا

ان رنگوں کو
ان بہاروں کو
میری زبیت سے کبھی نہ زود ٹھنسنے دینا

اک معصوم سارال
اک بے لوث سارال
جھنجھتی کو کا در در نہ پائے گا
اور جو ٹوٹ کے کٹھن اول تو

جی نہ پائے گا
مگر دیپ چاہت کے جلانے والے

مکن میں پیار بسانے والے
تیری بے زنی کی اک نگاہ نے
اندھیرے کر دیے دل کے تنگ

اور اب میں ہوں اور میری تنہائی
اور اک مرلیو اول اور جڑی آنکھیں

برسوں بعد عید کے در خوشیوں کو
حسرت سے تنگی ہیں

کس دیس میں نکلا ہوگا میرا چاند
بہی سوچی اور مجھ قسم برکتی ہیں

(نیم نیاڑی..... کراچی)

محبت کا آخری دہریہ

چلو ختم ہوئی آج سے داستان محبت
اب ہم تاریخ و فاقہ میں تیرا نام نہ کرتے ہیں
چلو آج سے ہم چاہت کے زنداں میں مقید ہوئے
تیری یاد کے سحر اس درویش کی دیکھ ہوئے
چلو اب کتاب زبیت سے اور ارق و فاطمے ہیں
کتاب ہم "دفا" کو جاناں کیسے سزا لیں گے
کتاب ہم اپنی جی جی جنوری کی شہر و صا.....

تیرے بخشے ہوئے عذاب تنہائی سے کرتے ہیں
چلو اب تیری محبت کی عمر قیدہ تقدیر ہوئی
(کہ ہم کو وفا بھانے کی سزا ملتی تھی)

چلو اب ہم اپنے ہاتھوں کی گلیروں سے
تیرا کس جان مناویں گے

قلب جان میں جی تصویر محبت!
شب کی تنہائی میں چپے سے بھادیں گے
اس پر بھی عمر کوئی کم نہیں ہوتا

کہ ہم کو زمانے میں تیری رسوائی منظور نہیں
شاید اسی لیے یہ بھیم نہیں ہوتا
مگر جب فصل جان سے سانس اٹھ کر پڑے تو

ایسے میں ہم اسیر محبت!
پھر سے عہد و فادہ پرانے لگتے ہیں
اتنے زخم کھا کر بھی شہر جان کو تیری آنکھوں کا.....

سر میں ہندو یاد کا ہے
ایسے میں ہم دیر تک مزاحمت پر
تو کہہ کر کرتے ہیں آہیں بھرتے ہیں

ہائے میں یاد ماضی کی ہر یاد
خاک یادوں سے تھوہو جاتی ہے
ایسے میں کس کی دہریہ

سکسپاں کی ہوئی سرد تاریک دات کا
الوداعی منظر یاد کا ہے
ایسے میں ہمیں تو بھی تنہا تیری چاہت بھی نہیں

جس کو دہمت کا آخری دہریہ یاد کا ہے!
ہاں بس وہ آخری دہریہ.....

(شاعرہ: سدرہ حمران..... نیٹل ناؤن کراچی)

ادھر سے خواب

آنکھیں یہ بے بس آنکھیں
جو دیکھنے تو ایسے بیٹھے
جوندہ ہوں کئی اپنے
یہ آنکھیں یہ بے بس آنکھیں
وہ خواب کی صورت
اک عذاب کی صورت

آنکھ میں اتر آیا
جس کے اترے تنگن میں
خواب ایسے ٹوٹے ہیں
جیسے ٹوٹ جائے ہے

آنکھ میں آ کر
جن کی کچاں ہیں پڑیں
میرے سامنے ٹوٹی
جن کو خنجر چلتے ہیں

پور پور دی ہوں
زندگی سے لڑتی ہوئی
آہ میرے ادھر سے خواب
جن پر اختیار نہ

آہ میرے ادھر سے خواب
ہو سکتے پورے خواب

بے وفا کی

سر راہ ملاقات پہ
راج میں بدلنا
انجمنی نگاہوں سے
مؤثر و کرد بیکتا

بے وفا کی نہیں تو
پھر اور کیا ہے؟

(رحمانہ قباب)

دیکر کا مہینہ اور گزرا سال

دیکر کے مہینے میں

میں گزرے سال کی ہر اک حکایت لکھنے بھی ہوں

کہہ دیکر کے مہینے میں بابت لکھنے بھی ہوں

ذرا بال کی آنکھوں سے

یہ خوشگ ہو جائیں

میری کڑی سے دوش کی

چمکی چاندنی کے لب ذرا میرے سے مس جائیں

کہ ان بیڑوں کے سب سے بھی ذرا پھر لوٹ کے آئے

کبھی ہے جان چوں میں ذرا پھر جان آ جائے

میرے شوریدہ چہرے کو ذرا آرام آ جائے

ہوا کا زور ختم جائے قلم کی نوک ٹھہرے تو

قدم پہنچلی سافیت کے بھی رخ چھو جائیں تو

سننے پے ہیں حالات کے سنگڑاں لکھوں گی

اُزل سے جو بد تک سے وہی رووا لکھوں گی

میں دل کی ہر بات لکھوں گی

دیکر کے مہینے میں

میں سارے ہوا لکھوں گی

(شاعرہ: عظمیٰ صدیق..... کراچی)

غزل

گلاب بن کے چمن میں سدا کھلا ہوں میں

مگر زمانے کی نظروں میں خاک سار رہا ہوں میں

مشاہدہ ہے کہ قربت میں دور ہیں ہی ملیں

ہوا ہوں دور چاندنی مٹا رہا ہوں میں

میرا خیال ہی اچھا ہے جس میں ٹو آئے

تیرے بدن کی مہک کو ترس گیا ہوں میں

پڑائے دکھ ہیں سننے دیاں ہیں اور میرا دل ہے

سراپا غم کے بکھلوں میں پھر چکا ہوں میں

لبوں پہ جھوٹ نظر میں قربت کی لہریں

ہر اک پہ کہتا ہے پھر بھی کہ پارسا ہوں میں

ذرا کی چوٹ پہ ہر اک کو چیتنے دیکھا

مگر کسی نے نہ دیکھا کہ دل جلا ہوں میں

قدم قدم پہ تو اک دشمن ہی ملا مجھ کو

میرا خیال ہے رخوں کا دل زبا ہوں میں

زمانے بھر کے دکھوں کو گلے لگا کے سحاب

غموں کی آگ میں چپ چاپ جل رہا ہوں میں

(صلاح الدین سحاب..... پشاور)

اعتراف

مبارک عید آئی ہے

خوشیوں کا پینا مٹا دلائے

محبتوں کے پھول کھلے ہر نو

چاہتوں کی بارش برس رہی ہے

رحم رحم رحم

چہار کی خوشبو بھیل گئی ہے

ہنسی اور خیموں کی جھنکار لیے

مبارک عید آئی ہے

لیکن میرے لیے

چاند کی آواز چاندنی

اور جاں گل گئے ہیں

وہی بھر کے بے شمار گئے

اور دل کی خواہش ہے

رست جگے ہیں راتوں میں

دن کو اداسی چھائی ہے

نہیں کتنے اب دن اور رات

یہ کتنے بہت ستاتے ہیں

ہمیں بہت دلاتے ہیں

تھیں داپس نکاتے ہیں

اب بھی جاؤ تم

ناتواستاتہ تم

کہ تہا رہی دی ہے تو

ہماری عید ہوتی ہے

(شاعرہ: فاکہہ فروں..... بہاول)

چوٹ

میری چلوں سے سترے بن کر

پچل میں کرے

صرف تیرے انتظار میں

ہوا کی منہا نہت پر

لگن تھارے

قدموں کی آواز کار ہا

یہ دل جو پل گھبرا

دول کے دروازے تو

کھلے رکھے ہیں کب سے

مگر گھر کے چراغ بھی

اپنے بوسے جلا کر

نریت کو سنبھلا دیتے ہوئے

اس آس پر بھی رہی

زندگی کی چوٹ پر

کرا

شاید ہی آ جاؤ

میرے قدر چگائے

آنکھیں کھلی رہیں پھر بھی

تیرے انتظار میں تیرے انتظار میں

(مس زہابہ رشید علوی..... راول پنڈی)

غزل

خفا میں کون تھا تیرے سوا ہمارا

پھرا جو ٹو ہم سے چھ گیا یہ بھی سہارا

مگر مسکرا کے مجھے تو یوں لگا ہے

ل گیا ہونٹیں ڈوبتے کو سمندر میں اک کنارہ

میرا ہونٹیں ہے ٹو میرا ہمسفر

لیے تو تیرے بن نہ ہوگا میرا گزارہ

ہرے بھر میں بھی اک عجیب سا لطف ہے

میں سمجھ نہ پایا بھی کیا چیز ہے ٹو میرے یارا

جتنی رتوں کو دیکھ کر دل میں آیا خیال عرمان

آئے گا ہماری چاہت کا زمانہ بھی کبھی دوبارہ

(شاعر: شیخ عمران گوگیہ..... سرگودھا)

غزل

زبان خوشبو میں تجھ سے کہا ہے

ہوا کی بات کو میں نے سنا ہے

میرے جذلوں کی سیانی کو دیکھو

یہ وہ جادو ہے جو تم پر چلا ہے

پایا جو رہا دریا کنارے

بہت اُس میں کمال و حوصلہ ہے

جو پتا شاخ سے ٹوٹا وہ مردہ

اشارہ یہ خزاؤں نے دیا ہے

ہوا خوشیوں کی آتی ہے جہاں ہے

درجہ وہ نیچے ہی کھولنا ہے

مہاں جو جس میں دکھ میرے وہ سارے

کسی کو اس طرح کا خط لکھا ہے؟

رہی خانم پہ اپنے رب کی رحمت

یہی احساس تو اس نے لیا ہے

(شاعرہ: فریدہ خانم..... لاہور)

غزل

آس ٹوٹی تو زندگی بھی گئی

کفر چھوٹا تو بندگی بھی گئی

منظروں سے قرار کیا ملتا

اپنی آنکھوں کی روشنی بھی گئی

جو کبھی بن گئی تھی مجبوری

اب کے وہ آخری ہنسی بھی گئی

ہم نے نیلام کردی تھیائی

وہ مطالعہ وہ شاعری بھی گئی

روح کے زخم روز بڑھتے رہے

ساتھ چھڑے کسی دکھی بھی گئی

پھر غزل وقت ایسا بھی آیا

وہ غمگینا گئی بھی گئی

(عائشہ غزل..... ہزارہ پتور ش ٹانوں ناہنہ)

تم جو آؤ تو عید منا میں ہم
مستبصال رکھے ہیں لفظوں کے موتی
دائیں دل پھیلاؤ تو برسائیں ہم
اکٹھا راجہ..... ڈگری سندھ

میں ہوں تیرا خیال ہے اور چاند رات ہے
 نئی درد سے نڈھال ہے اور چاند رات ہے
 آنکھوں میں چہرہ نہیں تیری یادوں کی کرجیاں
 کا ندھوں سے کسی شال ہے اور چاند رات ہے
 تیری ملک..... کا درد پوران
 عید کا چاند دیکھ کر تجھے دیکھوں
 کیا حسین وہ سماں ہوگا
 دل کی معصوم رُخا قبول ہو سکی
 ورنہ عید کا یہ دن خرابی ہوگا
 تجھے فرحت..... تو ڈیال؟ زاد کشمیر
 آرزوؤں کا سہارا تھا کتنا اچھورا

میرا ہر خواب ہر پستا تھا کتنا اوصورا
 میری زوجہ میرا وجود بھی ہے کتنا اوصورا
 چاہو تو عمل کرو چاہو تو رہنے دو اوصورا
 فریضہ عید چدری..... گورزا والہ
 جیگستا موسم ادا کی ضمانت ہو گیا
 وہ تیرا ہم ہے بھڑکانا اک قامت ہو گیا
 اے میرے ہمدم جدائی سوچ کے جانے نہ تو
 اب کے تیرا بھر پاکیزہ امانت ہو گیا
 تزیلہ باہمی..... جھگ صدر

میں نے چاہا تجھے عید پہ کچھ نذر کروں
جس میں احساس کے سب رنگ ہوں روشن روشن
جس میں آنکھوں کے تراشے ہوئے مولیٰ لاکھوں
جس میں شامل ہو میرے قلب کی دھڑکن دھڑکن
صدقہ نامی..... جھنگ صدر

نئی خوشی سے فلک کی سیاہ چادر پر
ہلالِ عید جب سرشامِ نظر آیا
کوئی فرطِ مسرت سے ہو گیا پائل

کسی نے جھوٹی تسلی سے خود کو بہلایا
ساترہ معصائب بخاری..... علی پور
عید کا چاند نظر آئے گا جس دم مجھ کو
میں تیرے وصل کی اے دوست دعا مانگوں گا
میں جو برسوں سے ہوں تنہائی کے صحرا میں کم
اب تیرے عہدِ رفاقت کی دعا مانگوں گا
سورہ احمر عرمان..... کراچی

یہ عجب ہے محبت کہ زمانہ جانتا ہے
نہیں اس کی باتا ہوں نہ وہ میری باتا ہے
کوئی اس سے پوچھے اسے کیا ملا پھنجر کے
میں بھی خاک چھانتا ہوں، وہ بھی خاک چھانتا ہے
نہیں سرگرمی..... چک چولہ
شاید تیری نوا سے لے عید کا پیام
اے دوست مسکرا کہ طبیعت اداں ہے
لکھنا انجم..... بیڑی بھٹیاں

اپنے دامن کی ہواؤں سے بچھا دو آ کر
کہیں دل کو نہ جلادیں غمِ دوراں کے دیے
دیکھنا قباب..... کراچی
اب جو ٹوٹ کر بکھرے تو احساس ہوا
پیل ہر لڑکھٹاٹ تم تمام لیا کرتے تھے
فریدہ خاتم..... لاہور

وہ اس طرح کہ تجھ پر بھروسہ بلا کا تھا
مونا مغل..... فیصل آباد

موتیاں..... میں آباد
گر اس دور میں جلنا ہی مقرر ٹھہرا
اپنی آجڑی ہوئی محفل کے چراغوں میں جلیں
چنگ ٹوٹا کمر آہنگ نہ ٹوٹا اپنا
ہم وہ شعلے ہیں جو بجھ کر بھی داغوں میں جلیں
مگر..... فصل آباد

اس کی آنکھوں میں محبت ہوئے دیا چڑھتا

دل کو سیلاب کے موسم میں بھی پیسا سا لکھتا
نجم الماس..... درکن آباد
دل سے بس اک بات کا جانا نہیں خیال
اس نے مجھے نہ سمجھا کہاں جاؤں دوستو
اس کو تو لگتی ہیں زمانے کی راتیں
مجھ کو غموں نے گھیرا کہاں جاؤں دوستو
شہناز ناٹش..... پیر محل

ہے ازل سے ملاپ رُوحوں کا
پیار کب آزما کر ہوئے ہیں
جلیاں پوچھ کر نہیں گرتیں
حادثے کب بتا کر ہوتے ہیں
سودہ نسبت زہرا..... کہہ کر ٹھکا

یادوں نے اضطراب کی ریکھائیں پھینچ دیں
 درنہ میرے سکون کا کاغذ سفید تھا
 ارم نورا رہا..... کراچی

میرا دل تیری ساریاں سے سجانی کی خواہش ہے
تیرے ہونٹوں پہ پھولوں کی شبنم گرانے کی خواہش ہے
تیرا حسین چہرہ ہوتا نہیں میری نظروں سے
مورت تیری اس دل میں سجانی کی خواہش ہے

نہ تھا مسئلہ کسی جیت کا نہ ہی ہار کی کوئی بات تھی
تیرے اعتبار کا معاملہ میرے اختیار کی بات تھی
کوئی جیتو بھی نہیں رہی مگر اب سکون بھی نہیں رہا
وہ جو بے قراریاں دے گئی وہی تو قرار کی بات تھی
خمنہ نہ تیرے..... مغالانہ آزاد کشمیر

غروب ہوتے گئے رات کے اندھروں میں
نوبہ امن کے سورج کو ڈھونڈتے ہوئے دن
نجانے کون خلا کے یہ استعارے ہیں
تمہارے جبر کی گلیوں میں گونجتے ہوئے دن



سب سے عظیم
دنیا کا سب سے عظیم نام اللہ ہے۔
دنیا کی سب سے عظیم شخصیت محمد ﷺ ہیں۔
دنیا کی سب سے عظیم کتب قرآن مجید ہے۔
دنیا کی سب سے عظیم زبان عربی ہے۔
دنیا کی سب سے عظیم دعوت اذان ہے۔
دنیا کی سب سے عظیم زمین مکہ مکرمہ ہے۔
(فرید حسن علی)

ارشاد نبوی ﷺ
سب سے زیادہ اچھے سلوک کی حق دار تمہاری ماں ہے۔

پاپ کی اطاعت اللہ کی اطاعت اور پاپ کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔
اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو تا کہ تمہاری اولاد تمہارے ساتھ نیکی کرے۔

ماں باپ سے اچھا سلوک کرنے سے عمر بڑھتی ہے۔

نیک بات کہو اور مسائے سے اچھا سلوک کرو۔
بھجوت سے روزی میں کی جانی ہے۔
سب سے بُرا انسان وہ ہے جو گھر والوں کو تنگ کرے۔
صبح کی نیند روزی کو کم کر دیتی ہے۔

(سائرہ شام شاہ..... احمد پور شرقیہ)
جتنی کہادت

اگر دل میں سچائی ہو تو گردن میں حسن پیدا ہوتا ہے۔
اگر گردن میں حسن ہو تو گھر میں خوش گوار سا محل ہوگا۔ اگر گھر میں خوش گوار سا محل ہو تو اس سے قوم میں عظیم پیدا

ہوگی اگر قوم میں عظیم ہو تو ملک اس کا گہوارہ بن جائے گا۔

(تسلیہ شریف..... فیصل آباد)

حضرت معروف کرہی کے اقوال
اگر صاحب بدعت کو دیکھو کہ ہوا پر چلتا ہے تو بھی اس کو قبول نہ کرو۔

و درویش وہ ہے کہ کسی کی طبع نہ کرے جب بے طلب کوئی لائے تو منع نہ کرے اور جب لے لے لے تو جتن کرے۔

ل عقل مند وہ ہے کہ اس پر جب کوئی مصیبت نازل ہو تو ازل روز وہی کرے جو کہ وہ دیر سے روز کرے گا۔

شک ظاہر ہوں کی پرستش اور شرک باطن مخلوق پر بھروسہ رکھنا ہے۔

شیطان کو سب سے پیارا بخیل مسلمان اور ناپسند گناہگار ہے۔

جس طرح توہرائی سننے کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح اپنے آپ کو سون سرائی سے بھی بچا۔

بغیر عمل کیے ہوئے بہشت کی آرزو نہ کرنا گناہ بغیر ادائے سنت کے امید شفاعت رکھنا غرور اور دھوکہ اور بغیر فرمانبرداری امید دار رحمت ہونا کھٹل جہالت اور حماقت ہے۔

(نادیہ چٹانگیر خان..... مومبر آ زاد شہیر)

یقینی باتیں
نہی کہ کسی کے ساتھ محبت کرنے میں جلدی کرو اور نہ عداوت کرنے میں تجلّت سے کام لو۔

(حضرت سید عبدالقادر جیلانی)
مومن ہو یا کافر کسی کی دل آزاری نہ کرو اس لیے کہ کفر کے بعد بھی سب سے بڑا گناہ ہے۔

(حضرت شیخ ابو حنیفہ ولف ثنائی)
جس کا دھوکہ میں سب کاموں سے مفر جانتا تھا وہ

مقدمہ کا تمام حق باقی والدہ کی رضا مندی۔

(حضرت بایزید بسطامی)
جو کوئی مخلوق کے ذکر میں مصروف ہو گیا وہ خالق کے ذکر سے باز رہ گیا۔

(سین لاریب..... پتوکی)
پیارے لوگوں کی بیماری باتیں

جب تمہیں نیکی سے خوشی ہو اور ہوا رنگہ ہو جانے پر تکلیف ہو تو یہ تمہارے ایمان کی علامت ہے۔

(حضرت جلالی علیہ السلام)
حق کا پرست کبھی ذلیل نہیں ہوتا خواہ سارا زمانہ اس کے خلاف ہو جائے۔

(حضرت غائبہ)
سب کے سامنے کسی کو نصیحت کرنا ایک طرح کی ملامت ہے۔

نیک عورت اموروں سے نہیں بلکہ اسباب آخرت سے ہے۔

(امام غزالی)
علم ایک پھول ہے جو کہ جتنا زیادہ چلتا ہے اتنی ہی خوشبو دیتا ہے۔

(تکیم لقمان)
انسان کے اطوار اس کو گناہگار نہیں بلکہ عیب جو تک اس کا دل گناہگار نہ ہو۔

(بیکس)
انسانی زندگی دنیا میں اس شمع کی مانند ہے جو ہوا میں رکھی گئی ہو۔

(طیلس)
گناہ نیکی کے لباس میں دھوکہ دے سکتا ہے۔

(جوئے تل)
(شامکلام..... ضلع چکوال)
باقوں سے خوش ہوتا

حق پر چلنے والوں کا پاؤں شیطان کے سینے پر ہوتا ہے۔

خدا اور انسان کے درمیان ایک ہی حجاب حائل ہے جس کا نام نفس ہے۔

خرید و دار ہے جو سنانی نہیں دیتی بلکہ دکھائی دیتی ہے۔

خست سے خست کیر حکمران ایسی زنجیر نہیں بنا سکتا جو جنوں کو جکڑ سکے۔

اگر تم غلطی پر ہو تو اپنی غلطی کو فوراً اور جرأت کے ساتھ مان لو۔

اپنی خوشی کے لیے دوسروں کو حسرت کی خاک میں نہ ملاؤ۔

محبت عجمی کبھی تمہارے نہیں کرتی۔

صوفی وہ ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں شفت رسول ﷺ ہو۔

اس کے افغان پر اعتماد نہ کرو جب تک اسے غصے کی حالت میں نہ دیکھو۔

والدین کی خوشنودی دنیا اور آخرت میں باعث نجات ہے۔

(سید ہنسٹ زہرا..... کہروڑ پکا)

یادگار لمحے
ستاروں سے روشن رہنے کا سبق ضرور سیکھو مگر ستارہ بننے کی خواہش مت کرو کیوں کہ یہ ستارے تو دکھا سکتے ہیں منزل نہیں ہو سکتے۔

عورت مرد سے زیادہ عقل مند ہوتی ہے۔ وہ جانتی کم سمجھتی زیادہ ہے۔

عورت ایک غافل شیرینی ہے اس کی خوف ناک قوتیں جب جاتی ہیں تو بادشاہوں کے تخت لٹکا کر جتی ہیں۔

خوشی کی حالت میں کسی سے وعدہ نہ کرو اور غصے کی حالت میں کسی کو خط نہ لکھو۔

جس گھر میں عورت ڈنکی دیتی ہے وہ گھر جلدی تباہ ہو جاتا ہے۔

دنیا میں فقط دو شخص ایمان دار ہیں ایک وہ جو مر چکا ہے اور دوسرا وہ جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔

اپنے اخلاق اور کردار سے لوگوں کو ایسے متاثر کرو جس طرح سورج اپنی کرنوں سے ساری دنیا کو متاثر کرتا ہے۔

لوگوں سے اس طریقے سے ملو کہ اگر تم جاس تو تم پر نیکی اور زہد ہو تو تمہارے مشتاق ہوں۔

♥

☆ شاید برادرانہ محبت اٹھانے کے لیے۔
(فنا آج صبح سسٹا اور ملازمین نے رانا کو دیکھا)

رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے

مات کے اجلے پہنے پسند آئے۔ سحر امین راضا صا کے سوالات شہید احمد لہر گھمت غفار اور ذیفر ٹ شاہینہ کے پیغامات نادیا الیاس شیخ نویدہ قدر کے اشعار فز و سحر کا کائنات کی غزل اچھی لگی۔ سال نومبر ۱۹۷۱ء کا ابھی سے انتظار شروع ہو چکا ہے۔ اجازت دے دو۔ اہل اس۔

میرے اے میں سرتی۔ پیرا دیکر مہاں آپ کا ہے حد سیر یہ اللہ یہ م کی و نہ دھائے میری دعا ہے آپ سب کو عیدیاں
مبارک ہوں۔ تمام قارئین راسخ کو دوستوں کو عید مبارک۔

آپ کے ہر دھڑکنے کا سب سے عجیب کیس ہوں گے اور اندازاً ۱۰۰ بارے میں تو ساری کلاں فیلڈ کا کہنا ہے کہ آپ کی طرف سے مقابلے میں ان کے گروہ کی ایک ہی فائل ہے تو سارہ جی چٹاپیں بند کر دفرانہ ختم ہو گئیں گا کڑو گار کھائیں ناہرین اور دین کا رخ بدلنے سے ہوا کو رخا کر گئے۔ اور دھڑکنے آتی ہیں سارہ دھڑکنے اور سارہ پڑھتے ہیں۔ اور سارہ اور شرافت سے یہ چیز اینڈ کیا کرو۔ شرافت سے یہ چیز لہریں کس کام کے لیے ہم بہت ہیں۔ اور خیریں ناہر اور فرزانہ دیکری 27 اور 31 تاریخ کو ہم دونوں کی برتھ ڈے ہمارا ہو گا۔ اب دس تو ہم نے دونوں کو کر دیا ہے اب جلدی ہے۔ اور نریٹ تیار رکھو تم سب کی خدمت۔ (پچھلی دہائی)

بیاری دوست رافعہ عرفی بی بی
ماہنامہ کے بعد عرض ہے میری طرف سے (آج کل) کے اپنے آپ کو شادی کی مبارک باد بھیجی ہوئی۔ عید کے ساتھ ساتھ شادی کی مبارک باد سدا خوش ہو جائے اور شادی کی مبارک باد بھیجی ہوئی۔ دوست کو ملے جانا اور سال کے بعد میں کا موسم بھی شروع ہو گیا ہے۔ تمہاری بار بھرہ آئی ہے نا انا دھڑکنے جلدی ملاقات ہوئی۔ اب اجازت لفظ دلاؤ۔

(شیخان زیدی..... جھنگ صدر)
ڈیر محمدی اینڈ سیم جیور
ماہنامہ کے بعد عرض ہے میری ہو میں ماہنامہ آج کل کے اپنے آپ کو شادی کی مبارک باد بھیجی ہوئی۔ آپ اور سارا دھڑکنے اور ملتان کو تو آتی خالہ کے گھر آگامت ہوں ہاں میں آپ کو ملتان آنے کی دعوت دیتی ہوں۔ میری طرف سے آپ کو ملتان آنے کی دعوت دیتی ہوں بہت ہی خوشی ہو رہی ہے۔ سدا سہاگن رہو اور تم کو دھڑکنے میں بھول جائے۔ فقط دلاؤ۔

(شیخان زیدی..... جھنگ مکھیانہ)
کیوٹی پیچھے ٹھیل
السلام یا ڈیر فرید سیم جیور ہمارے ارے حیران کیوں اور لی ہو۔ ۱۶ نومبر کو تمہاری سالگرہ کی جو کراہ کر چکی ہے۔ یہ سب چیز زور سے تھے جس کی وجہ سے تو میری پریشان کی اور اب تمہیں میں دس کرنا چاہتی ہوں۔ انا نہ کرنا رہی۔ میری طرف سے تمہیں بہت بہت سالگرہ مبارک

ہو۔ میری دعا ہے تمہیں زندگی میں اتنی خوشیاں ملیں کہ تمہارا دامن تلک پڑ جائے۔ ہر خوشی کو اچھے طریقے سے انجوائے کرو۔ میری دعا ہے کہ تم اپنے نا پاپا کے ساتھ ہمیشہ شادا باد رہو خوش آئیں۔ اپنی داد و جان اور سب گھروں کو بہت بہت سلام بٹانا۔
اگر تو ملی جائے گا مگر ہماری طرح کون تم کو چاہے گا تمہیں یقین ہے دیکھ کے چاہتوں سے کوئی مگر وہ آٹھس ہماری کہاں سے لائے گا آپ کی دوست۔

(رہبر طارق..... لاہور)
بیاری دوست بھتی کے نام
السلام علیکم اور سدا کا حال ہے رمضان المبارک میں معروضیت بڑھتی جا رہی ہے عادت وقت سو کر زکرات ہاں چلو اب کچھ اور باتیں ہو جائیں میری طرف سے تمہیں اور تمام اہل خانہ کو دل کی غیر مبارک قبول ہو۔ عید کی خوشیوں سے معمور گزریں میں چہاں کو بھیجے ہمارے دھڑکنے اور سارا ناہرین نہ بھولنا اور میرا جواز کیا بنا ہے۔ اور خیریں میری طرف سے بشری کو دل مبارک باد ایک تو مکمل کی اور دوسری عید کی۔ کیوں بشری کیا لگا آج کل کے ذریعے مبارک باد کا اظہار خدا ہمیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ تین۔ تمہاری دوست (سقیم شریف)

کراچی کی عظمیٰ خان کے نام
ڈیر عظمیٰ! خوش رہو آدرو۔ دیکھیں تمہاری برتھ ڈے ہے بہت بہت مبارک ہو۔ اس خوب صورت موقع پر اس سربراہی کے شگ سے ساتھ تمہیں یہ چھوٹی ہی فلم مبارک ہے۔ دعا ہے کہ یہ فلم نکلتی
میری ہمیشہ میری زندگی وہ ملک ہے جو کھلا نہیں میں یہ سوچتی ہوں کہ خدا کرے! مجھے زندگی میں وہ صفحہ ملے جو مجھے مل جائیں!

(مددہ عمر خان..... کراچی)
بیاری فرید سیم شریف کے نام
السلام علیکم! کیونکہ کیا حال ہے۔ بی اے کے دوسرے

سسر کی تیاری کیسی جاری ہے۔ میری طرف سے تمہیں بی اے کے پہلے سسر میں اچھے نمبروں میں کاروباری حاصل کرنے پر بے حد مبارک باد۔ میری تیاری تو بڑے ہمتا رہی ہوگی۔ جب تک میری خط و کتابت میری طرف سے جاری رہے گی۔ اور سارا ناہرین میں آج کل میں مبارک باد دینے کا مزید پچھاؤ رہے ہیں۔ میری طرف سے ضرور اپنے چہرے پر مسکراہٹ کھینچو۔ میری طرف سے کھر والوں کو سلام۔ تمہاری دوست

(انجی شیم..... چک چولہ)
نازیہ کنول ناہرین سدا بی بی کا شگفہ کے نام
نازیہ جی! آج کل کے ذریعے چاہا آپ کے کلا والہاں کا انتقال ہو گیا ہے۔ بڑھ کر بہت دکھ ہو میری طرف سے آپ کو تعزیت قبول ہو اور اللہ آپ کے دادا جان کو جنت میں بلند درجے عطا فرمائے۔ (آمین) اور میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ پکیز کیا آپ میری دوستی قبول کریں گی! آپ بہت اچھی رازر ہیں اور بہت اچھی عمارت اور گھر اور سارا ناہرین میں بھی آپ کی کہانیاں میں نے پڑھی ہیں بہت اچھی لکھیں۔ میں بھی رازر بننا چاہتی ہوں آپ کو اچھا سا مشورہ دیں۔ اور ہاں میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں کیا آپ مجھ سے دوستی کریں گی! آپ دونوں سے درخواست ہے کہ پکیز جواب ضرور دیجئے گا۔ آپ کی دوست۔ (روز پندہ زیدی..... فیصل آباد)

نادیہ ایاس شیخ کے نام
میری دعا ہے مناد ہزار عیدیں تم سسر کی تمہیں ہر گز میری مبارک ہو۔
نادیہ ڈیر آپ نے مجھے اپنا بہت نقصان پہنچا دیا۔ آپ کے خوف سے ظلم و دھوکا آتی ہے میری تحریر آپ کو اچھی لگتی ہیں بہت بہت مبارک باد آپ سے یہ کہنا ہے کہ خدا کرے آپ ہمیشہ خوش رہنا چاہیں۔ یہاں کوٹ میری ممانی کا شہر ہے اللہ آپ کو اس شہر کا دار گئے ہیں۔ اپنا عظمیٰ احوال دوست کے پیغام میں دیجئے گی کہ میری جین آئندہ ایسا رازر ہے ہیں وہیر وہیر سدا بہت کدو کی تمہا میں گی! آپ کے حقارت کے بارے میں جاننے کا اشتیاق ہے اور مجھ سے اتنی محبت کا شکر آپ آج کل میں غیر حاضری پر ناراضگی ہو سکتی ہے اس لیے کہ آج کل سوسائٹ کا طبردار ہے ہم تمام خاتونیں اور چالان مزدور میں ہر گز۔

دعاؤں میں یاد رکھیے گا آپ کی بہن (مسر فیم صاف خان..... ملتان)
ڈیر سسر فرید سیم بیاری (کراچی) کے نام
کسی دن مجھ سے ملنے کا بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں چلو کچھ سال پہلے کا زمانہ ڈھونڈ لیتے ہیں میری بیاری کی سیرا پڑے۔ مجھے کرم بھی میری طرف سے ان لمحوں کی یادیں تازہ کرنے کے لیے بھل رہی ہو جس نے اور تم نے دل کر چمداں پہلے کراچی میں گزارے تھے۔ جی پچھو تو وہ سہری حالت میری تمہاری اور بی بی سسر کنول کی زندگی تو وہاں کا ذکر کرتی رہتے تھے۔ تم میرے استقال کی بلکہ وہاں بہت استقال کی تیار کیا کرکھو۔ اب تو انا دھڑکنے بہت جلد تم سے کراچی میں ملاقات ہوگی۔ پھر ہم تم ہوں گے بادل ہوگا کراچی کی سڑکوں پر مزلت ہوگا۔ کلا والہاں میں نظر سے ضرورت کے تحت چلے گا۔ اور ہاں نہایت ہی مڈی کوئی پی پڑوکل ملنا چاہئے مجھے ورنہ۔ میں عظمیٰ کس فراتر ہے آصف جو آپ کی کزن اور نہایت پر ظلم و ادا کوئی دوست کے عہدے پر فائز ہے تم سے ناراض ہو جائیں گی۔ تمہارے لیے خوشیوں کی لاکھوں کروڑوں ایوں کھریں دعا میں۔ (فراتر بی صاف..... بہاول پور)

بے حد مجھ سے جان سے عزیز والدین کے نام
ای او آپ کی اٹلے بیٹے یعنی دیکری 17 تاریخ کو سالگرہ ہے یعنی سور ہوئی۔ آپ دونوں کو سب مہن بھائیوں خصوصاً میری اور پنا کی طرف سے بہت بہت مبارک۔ صلاب کو زندگی کی ہر خوشی دے آپ دونوں کا ساری تاغیر میں دے آج ہم جو بھی ہیں وہ صرف اور صرف آپ کی وجہ سے ہیں۔ دی لویدویری دی کی بیٹی جی۔ ای کے لیے صلابیہ شعر
زمانے میں جو اونچا میرا سر ہے
میری مالہ کی دعاؤں کا اثر ہے
ابو کے لیے دوسری کا شعر
یہ کا بلیاں عزت ہے نام تم سے ہے
خدا نے جو بھی دیا مقام تم سے ہے
(پنا نقل سونا نقل..... فیصل آباد)



ج: یہی سوال کافی ہے۔
س: کب آپ آگے بتا دونا؟
ج: پہلے ذرا پڑی تو ہو جاوے۔

پروین افضل شاہین..... بہاول نگر
س: میرے ماما جانی پرس فضل شاہین کہتے ہیں کہ اس شادی کی سالگرہ پر کچھ بن کر دکھاؤ تو گفت ملے گا۔ میں انہیں کیا بن کر دکھاؤں؟
ج: جو کون۔

س: وہ اکثر مجھے مٹھی مٹھی نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں؟
ج: آپ سے کوئی کام کرنا چاہتی ہوں گے۔
س: آخر انہیں میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کب پسند آئے گا؟

ج: جب پیٹ بھر کے کھانا کھانے لگیں گے۔
مہرین علی شوکت..... میر پور آزاد کشمیر
س: یہ بتائیے کہ اس عید پر آپ کس طرف سے کیا عید کی ملے گی؟
ج: عید گزرتی دکانیں بھی بند تھیں۔
س: عید پر انہوں نے کچھ تحفہ دلانے کا وعدہ کیا تھا بتائیے کیا انوں؟
ج: اس عید پر انہیں ہی تحفہ بنے کا کہنے۔

س: کیا اس دفعہ ان کے ہاں سے عید کی آئے گی یا پچھلی طرح؟
ج: پچھلی دفعہ کی طرح ہی ہوگا۔
س: عید پر انہیں کیا خاص پکاکے کھلاؤں جو وہ ساری زندگی نہ بھولیں؟
ج: کچھ بھی نہیں دے دیا تھا میں بھول سکیں گے۔
س: کون فریادیں؟
ج: زندگی کی دھات زیادہ زیادہ کیوں ہوتے ہیں؟

صدر تحمران..... کراچی
س: بیجا بیجا سا یہ دبہ رہے ہیں بیگم ی یہ ”رضائی“ ہے گھر کے کاموں میں دل نہیں لگتا؟
ج: سب کا دل ایسے ہی ہوتے ہیں۔
س: آپ! شادی کے موقع پر دلہا اپنی ناک پر رو مال کیوں رکھتا ہے؟
ج: یہ پہلے ہوتا تھا اب نہیں۔ اب تو دلہا اپنی ناک دکھاتا پھرتا ہے۔
س: آپ! کیا مینڈکی کو بھی سرویوں میں ہی زکام ہوتا ہے۔
ج: مینڈکی سے پوچھو۔
س: آپ! نسا ہے جو لے لے دے ہوتے ہیں ان کی عقل گھٹنوں میں ہوتی ہے کیا اسی لیے زیادہ تر مرد عقل سے بیدل ہوتے ہیں؟
ج: ہنسی سنائی باتوں پر یقین نہ کیا کرو۔ مرد کی عقل عورت میں ہوتی ہے۔

س: ایسا ہم آئے آپ کی محفل میں؟
ج: خوش آمدید۔
س: میں کوئی ایسا گیت گاؤں؟
ج: جس کی آواز فریادوں تک پہنچ جائے۔
س: چار رکھنا کیوں ہوتا ہے؟
ج: تمہارا بے ہاتھ لگانے کی وجہ سے۔
س: اپنا کوئی ایسا جواب بتائیں جس کا سوال نہ

کیا بتائیں گی؟
ج: ڈکھن زیادہ نہیں ہوتے، گلے زیادہ ہیں۔
س: میں نے آپ کو خواب میں دیکھا اور پھر بھلا

کیا ہوا؟
ج: گھر اس کے کھل گئی۔
س: آنکھوں کے ساگر جمیل جیسی آنکھیں یہ سب کیا ہے؟
ج: شاعروں کی لفاظی۔
س: روٹھے ہوئے کو منانے کے لیے کیا کاٹنا سنا ضروری ہے؟
ج: ہرگز نہیں، مگر ”اونہہ“ کہہ کر نظر انداز کر دو۔
س: تو میرا کیا کر دوں؟
ج: آبی جی، رمضان شریف کی ڈھیروں ڈھیر مبارک قبول کیجئے اور بتائیے کہ کیسے کڑور رہے ہیں روزے آپ کے؟
ج: الحمد للہ۔
س: کیا آپ کو بھی ہماری طرح روزہ رکھنے سے پہلے اور کھولنے کے بعد ہجرت ملتی ہے؟
ج: نہیں چھوڑنے کی اپنی بات کیجئے۔
س: آپ! جی جی بتائیں روزہ کھول کر آپ کچھڑوں کے ساتھ انصاف کرتی ہیں یا کچھڑوں کے ساتھ؟
ج: دونوں ایک دوسرے سے ذرا دور ہیں۔

عید منا کر؟
ج: دونوں کا الگ الگ مہرہ ہے۔
س: سلی ملک..... قادر پور راج

س: سویت آبی عید پر صرف سویاں ہی کیوں پکا کر جاتی ہیں؟ کوئی اور مٹھی چیز کیوں نہیں؟
ج: ہاں یہ ڈھنگ کا سوال کیا ہے۔ آپ کچھ پکایا بیجئے۔
س: پیاری آبی پھنڈے ہوئے لوگ صرف یہی کیوں شدت سے یاد آتے ہیں؟
ج: ہر خوشی کے موقع پر پھنڈے ہوئے لوگ جانے کی وجہ سے یاد آتے ہیں۔
س: عید کی خوشی دینی ہو جائے اگر.....
ج: وہ بھی آ جائیں۔
س: سندھو آبی! کیا میں ”انہیں“ عید ملے جاؤں؟
ج: نہیں ہرگز نہیں۔ شیطان بھی ساتھ جا۔
ج: مانے گا نہیں۔
س: فرید احمد چوہدری..... گوجرانوالہ

س: آپ! زندگی بھی ایسی ہی کیوں ہو؟
ج: حالات کی وجہ سے۔ مگر یہ دائمی حال نہیں۔
س: آپ! مجھے اس بات کا جواب دیں کہ واقعی انسان ہیں اور کیا انسانیت کا حق ادا کرتے ہیں؟
ج: انسان تو ہیں انسانیت نہیں ہے۔
س: ”چھوٹی آنکھ میں اک نشہ ہے“ لیکر موتی؟
ج: جیسے تھے وہ زیادہ نہ تولد۔
س: آپ! زندگی کی دھات زیادہ زیادہ کیوں ہوتے ہیں؟
ج: زندگی کی دھات زیادہ زیادہ کیوں ہوتے ہیں؟